قائدِ اعظم

کے تصوّر کا

پاکستان

لائبریری
بزمِ طلوعِ اسلام لاہور
25-بی گلبرگ 2 لاہور۔فون نمبر: 35714546

شائع کردہ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، ۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور

CamScanner

طلوع اسلام ٹرسٹ کی کتب سے حاصل شدہ جملہ آمدن
قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب	----------	قائداعظم کے تصور کا پاکستان
مصنف	----------	غلام احمد پرویز
ناشر	----------	طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
	----------	25 بی گلبرگ II لاہور۔ 54660
	----------	فون: 4484-576 فیکس 6219-87
طابع	----------	آواز اشاعت گھر
	----------	فاروق مارکیٹ حق سٹریٹ اردو بازار' لاہور
مطبع	----------	عالمین پریس
ایڈیشن	----------	دوم اکتوبر 1996ء

فہرست مشمولات

۱۔ پاکستان کا معمارِ اوّل ۔۔۔۔ ۷

۲۔ معرکۂ دین و وطن ۔۔۔۔ ۲۷

۳۔ ایک چراغ لاکھ اندھیرے ۔۔۔۔ ۵۰

۴۔ ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا؟ ۔۔۔۔ ۶۵

۵۔ قرآنی پاکستان کیسا ہوتا؟ ۔۔۔۔ ۷۹

۶۔ کیا پاکستان اسلامی مملکت بن سکتا ہے؟ ۔۔۔۔ ۱۱۰

۷۔ اسلامی مملکت کے فرماں روا ۔۔۔۔ ۱۳۵

۸۔ پاکستان اور دین اور سیاست ۔۔۔۔ ۱۶۰

۹۔ تشکیلِ پاکستان کے سلسلہ میں چند اہم سوالات ۔۔۔۔ ۱۹۲

۱۰۔ ہندو کیا ہے؟ ۔۔۔۔ ۲۰۰

۱۱۔ نظریۂ پاکستان کیا ہے؟ ۔۔۔۔ ۲۳۰

۱۲۔ خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی ۔۔۔۔ ۲۴۰

۱۳۔ قائدِ اعظمؒ اور دو قومی نظریہ ۔۔۔۔ ۲۷۴

۱۴۔ پاکستان کا مطلب کیا؟ ۔۔۔۔ ۲۸۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طائرِ پیش رس

انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ قرآنِ مجید نے اس کی تمدّنی زندگی کے لئے جو اصول وضوابط متعیّن کئے ہیں، ان میں دو اصول ایسے ہیں جنہیں، یوں کہیئے کہ بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ایک یہ کہ وہ کون سی اساس ہے جس پر اس کی ہیئتِ اجتماعیہ (قومیت) کی عمارت استوار ہوتی ہے اور دوسرا یہ کہ اس کے اجتماعی نظام (ہیئتِ حاکمیہ) کا نقطۂ ماسکہ یا مرکزی تصوّر کیا ہے۔ جہاں تک ہیئتِ اجتماعیہ کا تعلّق ہے، انسان نے اس کا آغاز خاندانی زندگی سے کیا، یعنی اُس طرزِ تمدّن میں، ایک خاندان کے افراد، ایک وحدت تسلیم کئے جاتے تھے۔ خاندان نے تھوڑی سی وسعت اختیار کی تو قبیلہ بن گیا۔ اور قبیلہ آگے بڑھا تو اس نے قوم کی شکل اختیار کر لی یعنی اس تصوّر کے مطابق قومیّت کی تشکیل کا معیار، نسل کا اشتراک تھا۔ اس اشتراک میں خون، رنگ، نسب، حتّٰی کہ زبان کا اشتراک بھی شامل تھا۔ عصرِ حاضر نے اس تصوّر کو وسعت دی اور وطنیت کو قوم کا معیار قرار دیا۔ اس تصوّر کی رُو سے، ایک وطن (یعنی جغرافیائی حدود) کے باشندے، ایک قوم کے افراد قرار پائے۔ آج کل کے سیاسی لغت میں، وطن سے مُراد کسی انسان کی مرزبوم (جائے پیدائش) نہیں بلکہ وہ مملکت ہے جس کا وہ شہری ہے۔ بالفاظِ دیگر، دورِ حاضر میں، ایک مملکت کی حدود میں بسنے والے تمام افراد، بلالحاظِ رنگ، نسل، زبان، مذہب، ایک قوم کے افراد قرار پاتے ہیں۔

قرآنِ مجید نے کہا کہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ (یعنی قومیّت) کا یہ معیار غلط ہے۔ اس سے، نوعِ انسان جو اپنی اصل کے اعتبار سے ایک وحدت ہے، ایسے ٹکڑوں میں بٹ جاتی ہے جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں۔ قومیّت کا صحیح معیار، نظریہ (یا تصوّرِ حیات) کا اشتراک ہے۔ اس معیار کی رُو سے، دُنیا کے

وہ تمام انسان جو ایک نظریۂ زندگی (یا تصورِ حیات) کے حامل ہوں، بلالحاظِ وطن نسل، زبان، رنگ، ایک قوم کے افراد قرار پائیں گے اور اس کے برعکس، دوسرے نظریۂ زندگی کے حامل، دوسری قوم کے افراد۔ اس معیار کے مطابق گویا، دنیا میں قومیں دو ہی ہوں گی — ایک اُمّتِ مسلمہ جو قرآنی نظریۂ حیات کی قائل ہوگی۔ اسے، قرآن کی اصطلاح میں، جماعتِ مومنین کہا جائے گا۔ اور دوسری، غیر مسلم چونکہ قرآنی نظریۂ حیات کی رُو سے، دُنیا کے تمام انسان، بلالحاظ اس امر کے کہ وہ اُمّتِ مسلمہ کے افراد ہیں یا غیر مسلم محض انسان ہونے کی حیثیت سے یکساں واجب التکریم ہیں، اس لئے اُمّتِ مسلمہ، دوسرے انسانوں کے لئے درندہ نہیں بن سکتی۔ وہ اگر خود ہی فساد پر نہ اُتر آئیں تو کامل سکون و اطمینان کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

جہاں تک اجتماعی نظام (یعنی ہیئتِ حاکمیہ) کا تعلّق ہے، انسانوں کی وضع کردہ سیاست کا مسلک یہ ہے کہ اس کے لئے کوئی اصول، کوئی قدر غیر متبدل نہیں۔ ہر قوم، ہر وقت، اپنے سیاسی مفاد اور معاشی مصالح کے پیشِ نظر، جو مسلک جی چاہے اختیار کرلے۔ بالفاظِ دیگر، مملکت اپنے (یعنی اپنی قوم کے) مفاد کی خاطر، ہر قسم کا جائز اور ناجائز حربہ استعمال کر سکتی ہے۔ اسے، دورِ حاضر کی اصطلاح میں، سیکولر نظامِ حکومت کہا جاتا ہے۔ اس نظام میں، مختلف افراد کو مذہبی عقائد و رسوم کی آزادی حاصل ہوتی ہے، لیکن ان عقائد کا سیاست سے کوئی تعلّق نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس، قرآنِ مجید نے یہ تصوّر پیش کیا کہ جس طرح فطرت کے قوانین اٹل اور غیر متبدل ہیں، اسی طرح انسانی زندگی کے لئے بھی کچھ غیر متبدّل اصول و قوانین ہیں جو انسان کو وحی کے ذریعے ملے ہیں اور جو، اب قرآنِ مجید کے اندر محفوظ ہیں۔ اُمّتِ مسلمہ یا جماعتِ مومنین کے نظامِ حکومت پر ان اصول و اقدار کی پابندی لازمی ہے۔ وہ کسی صورت میں بھی ان سے انحراف نہیں برت سکتی۔ ان اصول و اقدار کو الدّین کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، قرآنی ہیئتِ حاکمیہ ہمیشہ دین کے تابع رہتی ہے۔ اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ اسلام، مذہب نہیں، دین ہے اور دین پر اسی صورت میں عمل کیا جا سکتا ہے جب اُمّتِ مسلمہ کی اپنی آزاد مملکت ہو جس کا کاروبارِ حکومت مستقل اقدار و اصولِ خداوندی کے تابع رہے۔ لہٰذا، اپنی آزاد مملکت کے بغیر، اسلامی زندگی بسر کرنے کا تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا۔

اسلام کے صدرِ اوّل میں ان دونوں بنیادی اصولوں پر عمل کیا گیا۔ حضور نبیٔ اکرمؐ نے پہلے ایک ایسی اُمّت (قوم) کی تشکیل فرمائی جس کی وجہ جامعیت، نظریۂ زندگی (یعنی ایمان) کا اشتراک تھا۔ اور پھر، اس اُمّت نے اپنی مملکت قائم کی جس میں قرآنی اقدار و اصولِ حیات کے مطابق حکومت قائم کی گئی۔ اسے اسلامی نظامِ حکومت کہا

جاتا ہے۔ اس نظام نے جو انسانیت ساز نتائج پیدا کئے، تاریخ کے اوراق ان کی زندہ اور درخشندہ شہادت ہیں۔

کچھ عرصہ کے بعد، مسلمانوں کے اپنے تغافل، تساہل اور تکاسل کی وجہ سے، اسلامی نظام باقی نہ رہا اور اس کی جگہ نظامِ ملوکیت نے لے لی۔ اس نظام میں، امورِ سیاست، مسلمان بادشاہوں نے اپنے ہاتھ میں رکھے اور مذہبی عقائد و رسوم کا دائرہ، مذہبی پیشوائیت کے حیطۂ اختیار میں دے دیا، یوں، دین سیاست سے الگ ہو گئی اور ایک ایسا سیکولر نظام رائج ہو گیا جس کا لازمی نتیجہ، نظام سرمایہ داری تھا۔

یہ سلسلہ صدیوں سے چلا آرہا تھا اور تمام مسلم ممالک میں جاری و ساری تھا کہ (سر سیدؒ کے بعد) بیسویں صدی کے اوائل میں، علامہ اقبالؒ نے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور اپنے دمِ واپسیں تک اس جہاد کو جاری رکھا۔ پیغامِ اقبالؒ کو دو بنیادی شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک، ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری کے خلاف تخریبی انقلاب اور دوسری شق، قرآنی معیارِ قومیّت اور نظامِ مملکت کے لئے تعمیری جہاد۔ وہ عمر بھر اسی پیغامِ حقیقت آشنا کو زبانِ شعر میں عام کرتے رہے اور پھر جب اس طرح ملک کی فکری اور شعوری فضا ہموار ہو گئی تو ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر، مسلم لیگ کے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں اسے سیاسی پیکر عطا کر کے آگے بڑھایا۔ اس میں انہوں نے کہا کہ (۱) ہندوستان میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم، اشتراکِ وطن کی بنا پر، ایک قوم کے افراد نہیں، مسلمان، فی ذاتہٖ ایک الگ قوم ہیں۔ اسے دو قومی نظریہ کہا جاتا ہے۔ اور (۲) مسلمان، اسلام کے مطابق اسی صورت میں زندگی بسر کر سکتے ہیں جب ان کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں یہ قرآنی اصول و اقدار کو حکومت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ کر سکیں۔ ان دونوں شقوں کے مجموعہ کو نظریۂ پاکستان کہا جاتا ہے۔ یہ تھا وہ نظریہ جس کے مطابق مملکتِ پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس مطالبہ کو عملی تحریک کی شکل دینے کے لئے قائدِ اعظمؒ نے علم اٹھایا۔ اس تحریک کی مخالفت ہندو اور انگریز دونوں کی طرف سے ہوئی۔ ہندو، پورے ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا تھا اور انگریز کو اس کا خطرہ تھا کہ اگر دنیا کے کسی خطّہ میں بھی قرآنی نظام قائم ہو گیا تو اس کے سامنے، اس کا امپیریلزم اور کیپیٹلازم پر مبنی نظام، ٹھہر نہیں سکے گا۔

لیکن، اس تحریک کی، ان دونوں سے کہیں زیادہ شدید مخالفت ایک اور گوشے کی طرف سے ہوئی اور یہ تھا حضرات "علماء کرام" کا گوشہ۔ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس کی روشنی میں یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہو گی کہ پاکستان کا مطالبہ (دورِ حاضر کی اصطلاح میں) کوئی سیاسی یا اقتصادی مطالبہ نہیں تھا۔ یہ اسلام کا مطالبہ تھا۔ یہ ہمارے دین کا تقاضا تھا۔ بنا بریں، کیا یہ چیز باعثِ صد ہزار تعجب و تاسّف نہیں کہ جس مطالبہ کی بنیاد، دین کا تقاضا تھا، اس کی مخالفت

خود مدّعیانِ دین کی طرف سے ہوا لیکن یہ مخالفت، ہوئی اور بڑی شدّت سے ہوئی نیشنلسٹ علماء کی جمعیت العلماء ہند، انصار، احرار، جماعتِ اسلامی، سرحد کے سرخپوش وغیرہ سب اس مخالفت میں پیش پیش تھے۔ "حضرات علماء کرام" کا موقف یہ تھا کہ یہ مطالبہ اسلام کے خلاف ہے۔ اس مخالفت کی روک تھام کے لئے قائدِ اعظمؒ کی نگہ انتخاب، پرویز صاحب پر پڑی، (جوان کے الفاظ میں "۱۹۳۰ء کے پاکستانی" تھے) اس مقصد کے لئے ۱۹۳۸ء میں طلوعِ اسلام کا اجرا ہوا۔ اس نے مذہب کے نام پر تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرنے والوں کے خلاف جس جوش و خروش اور اثبات و استقامت کے ساتھ جو لڑائی لڑی، اس پر اس کے اُس زمانے کے فائل شاہد ہیں۔ پرویز صاحب اُس زمانے میں حکومتِ ہند کے مرکزی سیکرٹریٹ میں ملازم تھے، لیکن اس کے باوجود، کیفیت یہ تھی کہ وہ دن میں دفتر میں ہوتے تو شام کو قائدِ اعظمؒ کی کوٹھی پر۔ خود ان کا اپنا مکان، تحریکِ پاکستان کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ پیر علی محمدؒ راشدی نے جو لکھا ہے کہ سرکاری افسروں میں صرف تین ایسے تھے جنہوں نے تحریکِ پاکستان میں پوری تن دہی اور گرم جوشی سے حصّہ لیا اور ان تین میں ایک پرویز صاحب تھے، تو یہ امرِ واقعہ ہے۔ (سردست انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ پرویز صاحب نے جب اپنی سرگذشتِ حیات قلمبند کی جس کا وہ، احباب کے اصرار پر، وعدہ کرتے رہتے ہیں، تو اس دور کی بڑی مفصّل تاریخ بھی سامنے آسکے گی اور بعض دلچسپ حقائق کا انکشاف بھی ہوگا)۔

اگست ۱۹۴۷ء میں تشکیلِ پاکستان کے لئے ایک خطّہ زمین حاصل ہوگیا اور جنوری ۱۹۴۸ء سے طلوعِ اسلام کا دکراچی سے) دوبارہ اجرا ہوگیا۔ اب اس کے سامنے یہ مقصد تھا کہ جس پاکستان کی تشکیل کے لئے اس خطۂ زمین کو حاصل کیا گیا ہے، اسے یہاں عملاً کس طرح قائم کیا جائے گا۔ نظر بظاہر، یہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کے لئے کسی خاص تگ و تاز اور جدّ و جہد کی ضرورت لاحق ہوتی، لیکن (ہماری بدقسمتی) کہ یہاں ایسے عناصر یکجا ہو گئے جن کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ یہاں اسلامی نظام قائم نہ ہونے پائے۔ ان میں، اربابِ اقتدار، سرمایہ پرست، مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سوشلزم اور کمیونزم کے حامی، سب شامل تھے۔ لہٰذا، طلوعِ اسلام کے لئے یہاں بھی وہی میدانِ مبارزت قائم ہوگیا جو تحریکِ پاکستان کے دوران اس کشمکش کی آماجگاہ تھا۔ پرویز صاحب قریب سات سال تک تو حکومت کی ملازمت سے منسلک رہے لیکن اس کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ یہ مہم ان کا سارا وقت چاہتی ہے اسلئے انہوں نے ۱۹۵۵ء میں (قبل از وقت) ریٹائرمنٹ لے لی اور اسکے بعد اپنا پورا وقت، قرآنی فکر کی نشر و اشاعت اور قرآنی نظامِ حیات کی تشریح و تبیین کے لئے وقف کر دیا۔ اور اس کے لئے انہوں نے تصنیف و تالیف کے علاوہ خطابات اور تقاریر کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ مخالفین کا پراپیگنڈہ یہ تھا کہ دو قومی نظریہ، مطالبۂ پاکستان کے لئے بطور وکیلانہ حربہ اختیار کیا گیا تھا، حصولِ پاکستان کے بعد اس کی

ضرورت نہیں رہی۔ اور نظریۂ پاکستان ایک مبہم اصطلاح ہے جس کا متعیّن مفہوم ہی کچھ نہیں۔ مذہبی پیشوائیت اس قسم کا "اسلام" پیش کرتی رہی جس کے سہارے نظامِ سرمایہ داری قائم رہے۔ اور سوشلزم کے حامی یہ کہتے رہے کہ خود قائداعظمؒ سیکولر نظامِ حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس پراپیگنڈہ کی رفتار پہلے تو دھیمی سی تھی لیکن مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی کے بعد یہ سیلاب کی طرح امنڈ آیا ہے اور اب (مسز اندرا گاندھی اور شیخ مجیب الرحمٰن کی ہمنوائی میں) یہ آواز چاروں طرف سے بلند کی جا رہی ہے کہ دیکھا! واقعات نے ثابت کر دیا کہ نظریۂ پاکستان ایک ناممکن العمل واہمہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔

ان حالات میں، ہمیں خود بھی اس کا احساس پیدا ہوا۔ اور متوسّلین فکرِ قرآنی کی طرف سے یہ تقاضے موصول ہونے شروع ہو گئے کہ ضرورت ہے کہ ان اصولوں کی وضاحتِ عام کی جائے جو مطالبۂ پاکستان کی بنیاد تھے اور یہ بتایا جائے کہ قائداعظم کا تصورِ پاکستان کیا تھا۔ اس کے لئے اس سے بہتر صورت اور کیا ہو سکتی تھی کہ ان مسائل کے متعلّق جو کچھ پرویز صاحب کہتے اور لکھتے چلے آئے ہیں، انہیں یکجا کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔

اس وقت موجودہ ہوشربا گرانی اور کاغذ کے حصول میں دشواریوں کے پیشِ نظر، کسی کتاب کی اشاعت کا بہت کم حوصلہ پڑ سکتا ہے۔ لیکن اس خیال سے کہ زیرِ نظر کتاب کی بلا تاخیر اشاعت وقت کا اہم تقاضا ہے، ہم نے اس کی ہمّت کر ہی لی ہے۔ اگر اس سے ہم، ان شکوک کے رفع کرنے میں کامیاب ہو گئے جو پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کے خلاف، نوجوان نسل کے دل میں پیدا کئے جا رہے ہیں، تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری جگر کاوی کا صِلہ مل گیا۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔

کتاب کے مطالعہ کے وقت، ایک بات کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ جیسا کہ آپ دیکھیں گے، یہ تالیف مشتمل ہے ان خطبات اور تقاریر پر جو مختلف تقاریب پر، مختلف اوقات میں، مختلف سامعین کے سامنے کی گئیں۔ ظاہر ہے کہ جب ایک ہی موضوع پر مختلف اوقات میں مختلف سامعین سے خطاب کیا جائے گا تو ان میں کئی اہم چیزیں بار بار سامنے آئیں گی (مثلاً علامہ اقبالؒ اور قائدِاعظمؒ کے بیانات اور تقاریر کے اقتباسات اور اہم تاریخی واقعات وغیرہ۔ اور جب ان خطبات کو یکجا کیا جائے گا تو ان چیزوں کا اعادہ، تکرار بن جائے گا جو ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات ذہن پر بار گزرے۔ لیکن ہمیں اُمیّد ہے کہ موضوع کی اہمیّت کے پیشِ نظر، قارئین اس تکرار کو بھی مفید پائیں گے۔

۲۔ اس وقت تک پرویز صاحب کے مقالات اور خطبات کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں فردوسِ گم گشتہ،

سلسبیل اور بہارِ نو۔ زیرِ نظر تالیف، کو اس سلسلہ کی چوتھی کڑی سمجھنا چاہیئے۔ یہ مجموعے اور "سلیم کے نام خطوط" (جو تین جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں) ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے قلب و دماغ کو صحیح قالب میں ڈھالنے کا مؤثر ترین ذریعہ ہیں۔ اور

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

والسلام

ناظمِ ادارۂ طلوعِ اسلام

پاکستان کا معمارِ اوّل

۲۴ مئی ۱۸۷۵ء

جب پاکستان کی پہلی اینٹ رکھی گئی!

۲۲ مئی ۱۹۶۵ء کی شام کو ایک اجتماع سے برجستہ خطاب

برادرانِ عزیز! سلام و رحمت!

مدینہ میں قیامِ نظامِ خداوندی کے بعد مسلمانوں کو ان کی پہلی حالت کی یاد اس طرح کرائی گئی تھی کہ۔ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ" تم اپنی اس حالت کو یاد کرو جب تم تعداد میں بہت کم تھے۔ مُسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ اور اتنے کمزور و ناتواں کہ مخالفین تمہیں کسی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ ناسازگار حالات کی وجہ سے تمہیں ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ دشمن کہیں تمہیں اچک کر نہ لے جائیں۔ فَاٰوٰىكُمْ ــــ ضعف و ناتوانی بےکسی و بےچارگی اور خوف و ہراس کے اس لرزہ انگیز عالم کے بعد خدا نے تمہیں ایک محفوظ مقام پر پناہ دی وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ اور اپنی تائید و نصرت سے تمہارے لئے قوت کا سامان پیدا کر دیا۔ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ اور نہایت فراوانی سے تمہیں خوشگوار رزق عطا کیا۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۸/۲۶) تاکہ زندگی کے ان مقاصد کے حصول کے لئے جو تمہارا منتہائے نگاہ تھا، تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کر سکیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی حالت

۱۸۵۷ء کے سانحہ ہوشربا کے بعد مسلمانانِ ہند کی حالت بعینہٖ یہی (بلکہ اس سے بھی بدتر) ہو چکی تھی۔ ان کی سلطنت لُٹی، دولت وحشمت تباہ ہوئی، عزّت وناموس کو غارت کیا گیا۔ ان کے ابنائے قوم کو چُن چُن کر قتل کیا گیا۔ اُن کی متاعِ زیست کی کوئی شے محفوظ نہیں تھی۔ خوف وہراس ان پر چاروں طرف سے طاری تھا اور انہیں امّید کی کوئی کرن کہیں سے دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ایک طرف انگریز جس کے سینے میں صلیبی جنگوں کے زخم ہمیشہ تازہ رہتے ہیں، یہ تہیہ کئے بیٹھا تھا کہ مسلمان کو اس برِصغیر میں اس طرح ختم کیا جائے کہ ان کا جداگانہ تشخّص باقی نہ رہے۔ دوسری طرف ہندو ان سے اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام لینے کے لئے دانت پیس رہا تھا۔ اس نے حسبِ عادت مسلمانوں کے خلاف ہر قسم کے سچے جھوٹے الزامات لگا کر انگریز کو بھڑکانا شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں 'لائل محمڈنز آف انڈیا' میں سرسید لکھتا ہے۔

> اس وقت کوئی آفت ایسی برپا نہیں ہوئی جس کے متعلق یہ نہ کہا گیا ہو کہ اسے مسلمانوں نے برپا کیا ہے۔ خواہ وہ کسی رام دین یا ماتا دین ہی نے کیوں نہ برپا کی ہو۔ کوئی بلا آسمان سے نہیں آئی جس نے سب سے پہلے مسلمان کا گھر نہ تاکا ہو۔ کوئی کانٹوں والا درخت اس زمانے میں نہیں اُگا جس کی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ اسے مسلمانوں نے بویا ہے۔ کوئی آتشیں بگولا نہیں اٹھا جس کے متعلق یہ نہ مشہور کیا گیا ہو کہ اسے مسلمانوں نے اُٹھایا۔

قرآن کریم نے بنی اسرائیل کے اس قسم کے حالات کا ذکر کرنے کے بعد کہا تھا کہ وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ ہم نے چاہا کہ اس قوم کو جسے اس بُری طرح سے کچلا گیا تھا، اپنے احسانات سے نوازیں۔

اس قوم پر احسان

وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً انہیں ذلت وپستی کے گڑھوں سے نکال کر اقوامِ عالم کی امامت کے منصب پر سرفراز کر دیں۔ وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ ۲۸/۵-۶ انہیں فرعون کی مملکت (کے ایک حصّہ) کا مالک بنا کر ملک میں اقتدار وحکومت عطا کر دیں۔ اس مقصد کے لئے ان میں صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسیٰؑ کو پیدا کیا گیا۔

نبوّت کا سلسلہ نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اس لئے اب اس قسم کے عظیم انقلاب کے لئے حضرات انبیائے کرامؑ کی بعثت نہیں ہو سکتی۔ اب ان محیّر العقول تغیرات نے اُن انسانوں کے ہاتھوں رونما ہونا تھا جو خدا کے نازل کردہ ضابطۂ قوانین (قرآنِ کریم) سے بصیرت حاصل کر کے قوم کی راہ نمائی صحیح منزل کی طرف

کریں۔ اس مقصد کے لئے اُن یاس انگیز اور مرگ آفریں حالات میں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، ہندی مسلمانوں کو حیاتِ نو عطا کرنے کے لئے ایک بطلِ جلیل پیدا ہوا جو دنیا میں سرسیّد کے نام سے متعارف ہوا۔

سرسیّد کی نمود

سرسیّد کوئی "مامور من اللہ" نہیں تھا، نہ ہی اس نے اس قسم کا کوئی دعوٰے کیا۔ وہ عام انسانوں کی طرح پیدا ہوا۔ عام انسانوں کی زندگی جیا، لیکن کام وہ کر گیا جس نے ایک دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ جب مولانا حالیؔ نے سرسیّد کے سوانح حیات مرتّب کرنے کا ارادہ کیا، تو سرسیّد سے اس کی زندگی کے متعلّق پوچھا۔ اس کے جواب میں سرسیّد نے جو کچھ کہا، وہ اس کے بلند کردار کی زندہ شہادت ہے۔ اس نے کہا۔

میری لائف میں اس کے سوا کہ لڑکپن میں خوب کبڈیاں کھیلیں، کنکوے اڑائے، کبوتر پالے، ناچ مجرے دیکھے اور بڑے ہو کر نیچری کافر اور بے دین کہلائے اور رکھا ہی کیا ہے۔

یاد رکھیے! یہ بات اس وقت کہی گئی تھی جب سرسیّد کی عظمت کا شہرہ ساری دنیا میں پھیل چکا تھا اور ان کے ہاتھوں کا لگایا ہوا پودا، جھولیاں بھر بھر کر پھل دے رہا تھا۔ اس وقت ایسا اعتراف وہی عظیم انسان کر سکتا ہے جسے مبداءِ فطرت نے خلوص و دیانت کی نعمت سے نوازا اور انتہائی کشادہ نگہی اور فراخ حوصلگی کی دولت سے سرفراز کیا ہو۔ یہ کسی مصنوعی لیڈر کے بس کی بات نہیں ہو سکتی۔ مصنوعی لیڈر تو اپنے آپ کو پیدائشی ولی کہا کرتے ہیں۔

برادرانِ عزیز! اس وقت میرے پیشِ نظر نہ سرسیّد کے سیاسی کارنامے ہیں نہ مذہبی اصلاحات نہ اس کی معاشرتی خدمات ہیں نہ ادبی تعمیرات۔ میں اس وقت صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سرسیّد نے ان تاریکیوں میں گھری ہوئی قوم کے مستقبل کے متعلّق کیا سوچا اور اسے کس طرح ایک زندۂ جاوید عملی پیکر عطا کیا۔ سب سے پہلے اس نے دیکھا کہ مسلمانوں کے خلاف "بغاوت" کا الزام لگا کر انہیں ہر قسم کے ظلم و استبداد اور جور و تشدّد کا تختۂ مشق بنایا جا رہا ہے۔ اس کے لئے اُس نے اپنا مشہور رسالہ "اسبابِ بغاوتِ ہند" لکھ کر ہندوستان اور انگلستان کے سیاسی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا۔

اسبابِ بغاوتِ ہند

۱۸۵۸ء کے ہیبت ناک ماحول میں یہ جراَتِ رندانہ کتنے مہیب خطرات کو دعوت دینے کے مترادف تھی، اس کا اندازہ گورنمنٹ اوف انڈیا کے فارن سیکرٹری (مسٹر بیڈن) کے ان الفاظ سے لگایئے جو اس کے سینے کے جوشِ غیظ و غضب کے غمّاز ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ

اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے۔ اس سے حسبِ ضابطہ فوراً باز پرس کی جائے اور اگر کوئی

معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دی جائے۔

اور یہ بات شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ سرسید اس وقت حکومت کی ملازمت میں تھا۔ ملازم حکومت اور حکومت بھی "غدر" کے زمانے کی۔ لیکن اس کی جرأت بیباک اپنا کام کر گئی۔ چنانچہ انگلستان کے مشہور اخبار "ہوم نیوز" نے اس رسالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ

سرسید نے انتہائی دلیری سے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور یہ بات محتاجِ بیان نہیں کہ اس کی اس جرأت مندانہ رائے نے حکمران طبقہ کو بے حد متاثر کیا ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے بہت پہلے پنجاب اور سرحد میں، سیّد احمد بریلوی (علیہ الرحمۃ) کے زیرِ قیادت جہاد کی ایک تحریک سرگرمِ عمل تھی جو عوام میں "وہابی تحریک" کے نام سے مشہور تھی۔ "غدر" کے بعد انگریز اور ہندو کو بہانہ ہاتھ آگیا۔ جو مسلمان ان کی نگاہوں میں کھٹکتا اس کے متعلق کہہ دیتے کہ وہ وہابی ہے اور اس کے بعد اسے حوالۂ دار و رسن کر دیتے۔ چنانچہ کسی بڑے شہر اور قریہ میں کوئی ایسا درخت نہیں تھا جس پر ان "وہابیوں" کی لاشیں تڑپتی اور لٹکتی دکھائی نہ دیتی ہوں۔ بے گناہ لوگوں کے اس خونِ ناحق سے سرسید کا خون کھول گیا۔ کافی سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ اس میں خود کود جائے۔ چنانچہ اس نے ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ انگلستان کے پارلیمنٹ کے ایوان تک میں اپنا یہ نعرہ پہنچا دیا کہ

اگر وہابی ہونا کوئی جرم ہے تو سن رکھو کہ سب سے بڑا وہابی میں ہوں۔

جب سرسید کے ان جرأت مندانہ اقدامات سے مسلمانوں کے اس طرح بے محابا قتل و غارت گری کا سیلاب تھم گیا تو اسے اُن کے مستقبل کی فکر لاحق ہوئی۔ وہ ان کی غصب شدہ جائدادیں اور لٹی ہوئی دولتیں انہیں واپس نہیں دلانا چاہتا تھا۔ وہ انہیں ان کی عظمتِ رفتہ کا مالک بنانا چاہتا تھا۔ اُس نے یہ معلوم کرنے کیلئے کہ قوموں کی نشاۃِ ثانیہ کا راز کیا ہے، اپنے اوپر دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام کر لی، تاآنکہ یہ حقیقت بے نقاب ہو کر اس کے سامنے آگئی کہ ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

حیاتِ تازہ کی تدبیر

اس نے اس حقیقت کو پالیا کہ قوم کی حیاتِ تازہ کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ اس میں ایسے انسان پیدا کئے جائیں جو ان فرسودہ راستوں کو چھوڑ کر

جہاں سے قوم کے جنازے قبرستانوں تک پہنچے تھے، اپنی جدّتِ فکر اور ندرتِ عمل سے نئی راہیں تراشیں جو کاروانِ ملّت کو اِن کی منزلِ مقصود تک لے جائیں۔ وہ قوم میں انسان پیدا کرنا چاہتا تھا۔ دیکھئے وہ اس حقیقت کو کیسے درخشندہ الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

میں جب آسمان کی طرف رات کو دیکھتا ہوں تو اس کے اس حصّے کی جو نیلا نیلا اور ڈراؤنا سا دکھائی دیتا ہے کچھ بھی پرواہ نہیں کرتا۔ بلکہ ان ستاروں کو دیکھنا چاہتا ہوں جو اس میں چمکتے ہیں اور معشوقانہ انداز سے ہمیں اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

کیا تم اپنی قوم میں اس قسم کے لوگ پیدا کئے بغیر جو ستاروں کی طرح چمکتے ہوں، اپنی قوم کو معزّز اور دوسری قوم کی نگاہوں میں باعزّت بنا سکتے ہو؟

انسان سازی کی اس مہم کو شروع کرنے سے پہلے، اس نے ایک طرف اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ جو قوم اپنے زمانے کی علمی سطح تک نہیں پہنچتی وہ کبھی اقوامِ عالم کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہو سکتی۔ دوسری طرف اُس نے دیکھا کہ (کم از کم) ہندوستان میں آنے والی حکومت جسمانی قوّت سے کہیں زیادہ ذہنی صلاحیّت کے بل بوتے پر قائم ہوگی۔ بغاوتِ ہند کے ایک ہی سال بعد (یعنی ۱۸۵۸ء میں) کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں جدید علوم کی یونیورسٹیاں قائم ہو گئی تھیں جن میں ہندو جوق در جوق داخل ہو رہے تھے لیکن

ہندو کی مسابقت

مسلمانوں کے علماء کرام نے فتویٰ دے رکھا تھا کہ انگریزی پڑھنا حرام ہے۔ اس لئے مسلمان اسے شجرِ ممنوعہ سمجھ رہا تھا۔ نتیجہ یہ کہ بیس سال میں صرف بیس مسلمان گریجوایٹس ہو سکے۔ ان یونیورسٹیوں سے نکلے ہوئے غیر مسلم، حکومت کی مشینری میں دخیلِ کار ہوتے جا رہے تھے اور مسلمانوں نے اپنے آپ پر اس کے دروازے بند کر رکھے تھے۔ سرسیّد نے اس صورتِ حال کا گہری نظر سے جائزہ لیا اور ۱۸۶۳ء میں جب کہ وہ غازی پور میں تعیّنات تھے، سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد رکھ دی جس کا اوّلین مقصد یہ تھا کہ عصرِ حاضر کے علوم سے متعلق جو کتابیں انگریزی زبان میں شائع ہوں، اُن کا اُردو میں ترجمہ کیا جائے تاکہ مسلمان

سائنٹیفک سوسائٹی

ان علوم سے واقفیت حاصل کریں اور اس کے بعد ان کے دل میں خود ان علوم کی تحصیل کا شوق بیدار ہو۔

اس کے بعد سرسیّد نے دوسرا قدم اٹھایا اور غازی پور میں جدید خطوط پر ایک مقامی مدرسے کی داغ بیل ڈالی۔ سرسیّد کے دل میں علم کی عظمت کا احساس کس قدر شدید تھا، اس کا اندازہ اس دُعا سے لگایا جا سکتا ہے جو

اس مدرسے کا سنگِ بنیاد رکھتے وقت ان کے لبوں پر ان الفاظ میں آگئی تھی۔ انہوں نے انتہائی رقّتِ قلب کے ساتھ کہا۔

سرسیّد کی دُعا

اے خدا! ہم میں روز بروز علم کی کمی اور جہالت کی تاریکی کی ترقی ہوتی جاتی تھی۔ تو نے ہمارے دلوں کو پھیرا کہ ہم علم کی روشنی پھیلانے پر مستعد ہوئے بے شک سب کے دل تیری انگلیوں میں ہیں۔ جس طرف تو چاہتا ہے پھیر دیتا ہے ہم سب تیرا شکر ادا کرتے ہیں کہ تو نے ہمارے دلوں کو ایسے کاموں کی طرف پھیرا جو نہ صرف ہمارے ہی لئے مفید ہیں بلکہ ہمارے بعد جو بہت سی نسلیں آنے والی ہیں ان کے لئے بھی ایک روشنی ہے۔۔۔۔۔ اے خدا! تو خوب جانتا ہے کہ یہ مدرسہ جس کا پتھر آج ہم نے تیرے نام پر رکھا ہے، تیری مخلوق کے فائدے کے لئے رکھا ہے تو اپنے فضل سے اپنے نام پر اسے قبول فرما اور جیسا کہ تو نے خوبی سے اس کا آغاز کیا ہے، اسی طرح بخیر اس کا انجام کر ـــ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۔

جب سرسیّد غازی پور سے تبدیل ہو کر علی گڑھ آئے تو سائنٹیفک سوسائٹی بھی ان کے ساتھ علی گڑھ منتقل ہو گئی یہاں پہنچ کر انہوں نے سوسائٹی کا اخبار ـــ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ـــ جاری کیا اور اس طرح علوم جدیدہ کی اہمیّت اور افادیّت کا چرچا دور دور تک ہونے لگا۔

لیکن یہ کوشش کچھ ابتدائی اور مقامی سی تھی۔ مسلمانوں کے اجتماعی مستقبل کے متعلّق سرسیّد جو کچھ سوچ رہا تھا، اس کا عملی پروگرام ہنوز اس کے ضمیر کی گہرائیوں میں پہلو بدل رہا تھا۔ وہ مسلمانوں کی تعلیم کو ایک (عالمگیر نہیں تو کم از کم) ملک گیر حیثیت دینا چاہتا تھا۔ لیکن سرسیّد تو ایک عملی انسان تھا وہ اپنے ہر نظریئے کے لئے ذاتی معلومات اور تجربہ حاصل کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ عصرِ حاضر کی تعلیم کا مرکز اور سرچشمہ اس زمانے میں یورپ ہی تھا۔ اس لئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ یورپ جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ اس تعلیم کا نہج اور طریق کیا ہے؟ اس زمانے میں یورپ کا سفر کوئی آسان بات نہیں تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ اخراجات کا تھا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنا کتب خانہ بیچا، کوٹھی رہن رکھی اور سفر کی تیاری کی۔ مولانا حالی کا بیان ہے کہ جب ہم لوگ ان صعوباتِ سفر اور مالی مشکلات کا ذکر کرتے تو وہ کہتے کہ سب بجا اور درست ہے، لیکن "میرا مقصد پورا نہیں ہو سکتا جب تک میں بذاتِ خود اصول و طرزِ تعلیم سے واقفیت نہ حاصل کر لوں۔" چنانچہ وہ اپنے دونوں بیٹوں سمیت اپریل ۱۸۶۹ء میں یورپ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس سفر میں انہوں نے جو کچھ دیکھا، کس نگاہ سے دیکھا، اس کے متعلّق وہ خود لکھتے ہیں۔

یورپ کا سفر

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی، جب کبھی عالموں اور مہذب لوگوں کو دیکھا، جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں، جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے، جب کبھی کھیل کود، عیش و آرام کے جلسے دیکھے، یہاں تک کہ جب کوئی خوبصورت شخص دیکھا تو مجھ کو ہمیشہ اپنا وطن اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہماری قوم ایسی کیوں نہیں۔ جہاں تک ہو سکا ہر موقع پر میں نے مسلمانوں کی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا۔

سب سے اوّل یہی تدبیر سوچی کہ قوم کے لئے قوم ہی کے ہاتھوں سے ایک مدرسۃ العلوم (کالج) قائم کیا جائے۔

واپسی سرسید سفرِ یورپ کے اس ماحصل کو اپنے قلب و نگاہ کے دامن میں سمیٹ کر، اکتوبر ۱۸۷۰ء میں واپس ہندوستان پہنچا۔ یہاں پہنچنے پر اس نے ایک کمیٹی بنائی جس کا نام تھا خواستگارِ ترقیٔ تعلیم مسلمان، جس کا فریضہ یہ تھا کہ وہ تحقیق کرے کہ مسلمان تعلیم میں پیچھے کیوں ہیں۔

تعلیم کے متعلق گفتگو کرتے وقت کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق انسان کے ذہن سے ہے اور اس کی مشکلات انتظامی سی۔ لیکن سرسید کے نزدیک اس مسئلہ کی نوعیت اس سے بالکل مختلف تھی۔ اس کے لئے یہ مسئلہ اس کی زندگی کا جزو اور ایمان کا تقاضا بن چکا تھا جس کا تعلق ذہن کے علاوہ انسان کے نازک ترین جذبات سے بھی ہوتا ہے۔ اس باب میں سرسید کے جذبات کی شدت کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ آپ اس واقعہ سے لگایئے جسے سرسید کے قریب ترین رفیق، نواب محسن الملک نے بیان کیا ہے۔

نالۂ نیم شبی خواستگارِ ترقیٔ تعلیم کی کمیٹی کے پہلے اجلاس میں شرکت کی غرض سے نواب محسن الملک جلسہ کے انعقاد کی تاریخ سے ایک دن پہلے پہنچ گئے اور سرسید کے ہاں ہی قیام کیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

رات کو سرسید نے میرا پلنگ بھی اپنے کمرے میں بچھوایا تھا۔ گیارہ بجے تک مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ دو بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی تو میں نے سرسید کو اپنے پلنگ پر نہ پایا۔ میں انہیں دیکھنے کے لئے کمرے سے باہر نکلا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں اور زار و قطار روتے جاتے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ کیا خدا نخواستہ کہیں سے کوئی افسوسناک خبر آئی ہے؟ یہ سن کر اور زیادہ رونے لگے اور کہا کہ اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے کہ مسلمان بگڑ گئے اور بگڑتے جا رہے ہیں اور کوئی صورت ان کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔ میری ساری رات اس اُدھیڑ بُن میں گزر گئی

ہے کہ دیکھئے کل جلسہ کا انجام کیا ہوتا ہے اور کسی کے کان پر جوں چلتی ہے یا نہیں۔

نواب محسن الملک کہتے ہیں کہ سرسید کی یہ حالت دیکھ کر جو کیفیت میرے دل پر گزری اس کو بیان نہیں کر سکتا اور جو عظمت اس شخص کی اس دن سے میرے دل میں بیٹھی ہوئی ہے اس کو میں ہی جانتا ہوں۔

فکر و نظر کا وہ عالم کہ اصول و طریق تعلیم سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے قرض اٹھا کر یورپ کا سفر اختیار کرتے ہیں اور سوز و گداز کی یہ کیفیت کہ اس غم میں راتیں رو رو کر گزار دیتے ہیں کہ مسلمان بگڑتے جا رہے ہیں اور ان کے سنبھلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

اس کمیٹی نے ابتدائی تحقیق کے سلسلے میں بڑا کام کیا۔ بڑے بڑے اہل الرّائے حضرات سے مشورے کئے، سارے ملک سے تجاویز مانگیں، اشتہارات شائع کئے، مضامین لکھوائے، جلسے کئے، چندہ جمع کیا، رپورٹیں مرتب کیں، اور اس ملک گیر مہم کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ علی گڑھ کو جدید تعلیم کا مرکز قرار دے کر کام کی ابتداء کر دی جائے خواہ وہ کتنے ہی چھوٹے پیمانے پر کیوں نہ ہو۔ چنانچہ طے پایا کہ سب سے پہلے ایک ماتحت مدرسہ کا اجراء کر کے اہل ملک کو نمونۃً دکھایا جائے کہ ہمارے پیش نظر مقصد کیا ہے۔ چنانچہ اللہ کا نام لے کر ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو اس مدرسہ کی بنیاد رکھ دی گئی۔ یہ ایک مدرسہ کی بنیاد نہیں تھی بلکہ جیسا کہ میں آگے چل کر عرض کروں گا، یہ درحقیقت پاکستان کی پہلی اینٹ تھی۔

ابتدائی مدرسہ کی تاسیس

اس کے بعد سرسید نے محسوس کیا کہ اب ملازمت میں رہتے ہوئے کام کرنے سے بات نہیں بنے گی۔ اب مجھے سارا وقت اس تحریک کے لئے وقف کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۸۷۶ء میں پنشن لے کر علی گڑھ کو مستقل طور پر اپنا مسکن بنا لیا۔

اس مقام پر اتنا اور عرض کر دینا بے محل نہ ہو گا کہ سرسید کی بیوی کا انتقال ۱۸۶۱ء میں ہو گیا تھا جب سرسید کی عمر چالیس برس کی تھی۔ انہوں نے اس کے بعد شادی نہیں کی تاکہ گھر کے جھمیلوں سے آزاد رہ کر اپنی پوری زندگی اس مقصد کے لئے فارغ رکھی جائے۔ مقصد سے عشق اسے کہتے ہیں۔

سب سے پہلا مرحلہ اس درس گاہ کے لئے عمارات کا تعمیر کرنا تھا اور چونکہ اسکیم یہ تھی کہ اسے کالج اور پھر یونیورسٹی تک لے جایا جائے گا، اس لئے عمارات کی اسکیم وسیع پیمانے پر تیار ہوئی تھی۔

چندہ کی مہم

اس کے لئے کافی روپے کی ضرورت تھی جو پبلک کے چندے ہی سے مہیا ہو سکتا تھا۔ اس کیلئے سرسید جھولی بغل میں ڈال کر چل نکلا اور ملک کے کونے کونے میں پہنچا۔ لوگوں سے ایک ایک پیسہ بھیک کے طور

پر مانگا۔ اس کے لئے وہ کوئی گوشہ چھوڑتے ہی نہیں تھے۔ پٹیالہ گئے تو معلوم ہوا کہ وزیر ریاست کے ہاں پوتا ہوا ہے۔ اس کی خوشی میں عام رسم کے مطابق چراغی کے پانچ روپے مانگنے کے لئے چلے گئے جس پر انہوں نے ایک معقول رقم نذر کر دی۔ ان کے ایک دوست دور دراز سفر سے علی گڑھ آئے۔ آپ سے ملنے گئے تو کہا کہ میں سیّد ہوں، امام ضامن کا روپیہ مانگنے آیا ہوں۔ ان سے اشرفی لے کر ہٹے۔ دوستوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ جہاں جاتے، وہ دعوت کرتے۔ دعوت قبول کر لیتے، لیکن بعد میں کہہ دیتے کہ بابا! جو کچھ میری ضیافت میں خرچ کرنا ہے، مجھے نقد دے دو۔ اُن سے نقد لے لیتے اور روٹی اپنی گرہ سے کھا لیتے۔ اس زمانے کے لکھے ہوئے ایک آرٹیکل میں کہتے ہیں،

ہمارا تو اب یہ حال ہو گیا ہے کہ ہمارے دوست بھی اب ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں۔
ہماری صورت ہی اب سوال ہو گئی ہے۔

ایک دن اپنے ایک قدیمی دوست سے چندہ کا تقاضا کیا تو انہوں نے بدمزہ ہو کر کہا کہ صاحب! اب تو چندہ دیتے دیتے تھک گئے۔ سر سیّد نے کہا کہ ارے میاں! اب کوئی دن میں ہم مر جائیں گے، پھر کون تم سے چندہ مانگے گا۔ یہ الفاظ کچھ اس طور پر ادا کئے گئے کہ دونوں آبدیدہ ہو گئے اور چندہ فوراً دے دیا گیا۔

انہوں نے اپنی دوستی اور رشتہ داری کے تعلّقات تک کو کالج کے لئے چندہ کے ساتھ مشروط کر دیا تھا۔ چنانچہ ایک بار اپنے بچپن کے ایک نہایت گاڑھے دوست کو جو ذی استطاعت تھے لیکن کالج کے کچھ سرگرم معاون نہیں تھے، صاف کہلا بھیجا کہ مدرسہ کی مالی مدد کے بغیر ہماری دوستی قائم نہیں رہ سکتی۔

اور طریقوں سے روپیہ کی فراہمی

چندہ مانگنے کے علاوہ انہوں نے بے شمار اور طریقوں سے بھی روپیہ اکٹھا کیا۔ کبھی اپنے دوستوں کی کتابیں بیچ کر روپیہ پیدا کیا، کبھی علی گڑھ کی نمائش میں کتابوں کی دکان لگائی اور خود کتابیں بیچنے کے لئے دکان پر بیٹھے۔ کبھی اپنی تصویر کی کاپیاں فروخت کر کے پیسے جمع کئے اور ایک بار اس سلسلے میں وہ کچھ کیا جس کا ذکر تو ایک طرف، تصوّر تک سے ہر حسّاس انسان لرز اٹھتا ہے۔ بات یوں ہوئی کہ غریب طالب علموں کو وظائف دینے کے لئے روپے کی ضرورت پیش آئی جو کسی طریق سے فراہم نہ ہو سکا۔ سر سیّد نے مجبور ہو کر ایک تماشے کا اہتمام کیا۔ اس پر دوستوں نے منع کیا کہ ایسا نہ کیجئے، لوگ مطعون کریں گے، اخباروں میں ہنسی اڑائی جائے گی۔ سر سیّد نے کہا کہ اگر میں لوگوں کے کہنے کا خیال کرتا تو جو کچھ اب تک کیا ہے، اس میں سے کچھ بھی نہ ہو سکتا۔ لوگوں کے کہنے کا کچھ بھی خیال نہ کرو، بلکہ یہ دیکھو کہ اس سے درحقیقت قوم کو فائدہ پہنچے گا یا نہیں۔ چنانچہ تماشا دیکھنے کے لئے لوگ جمع ہو گئے تو سر سیّد خود اسٹیج پر کھڑے

ہو گئے اور انہوں نے ایک مؤثر تقریر کی اور کہا۔

کون ہے جو آج مجھ کو اسٹیج پر دیکھ کر حیران ہوتا ہوگا؟ وہی جن کے دل میں قوم کا درد نہیں، وہی جن کا دل جھوٹی شیخی اور جھوٹی مشیخت سے بھرا ہوا ہے۔ آہ اس قوم پر جو شرمناک باتوں کو اپنی شیخی اور افتخار کا باعث سمجھے اور جو کام قوم اور انسان کی بھلائی کے لئے کئے جائیں، ان کو بے عزتی کے کام سمجھے۔ آہ اس قوم پر جو لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے مکر دینداری کے کالے سوت سے بُنے ہوئے تقدس کے برقعے کو اپنے منہ پر ڈالے ہوئے ہو مگر بدصورتی اور دل کی برائی کا کوئی علاج نہ سوچے۔ آہ اس پر جو اپنی قوم کو نکبت و ذلت کے سمندر میں ڈوبتا ہوا دیکھے اور خود کنارے پر بیٹھا ہنستا رہے۔ اپنے گھر میں کھلے خزانے ایسی بے شرمی اور بے حیائی کے کام کریں جن سے بے شرمی اور بے حیائی بھی شرما جائے۔ لیکن قوم کی بھلائی کے کام کو شرم اور نفرین کا کام سمجھے۔

کہتے ہیں سامعین میں سے کسی منچلے نے کہا کہ آپ اسٹیج پر خود غزل گا کر سنائیں تو ہم چندہ دیں گے۔ اس پر سرسید نے گا کر غزل سنائی اور چندہ وصول کر لیا۔

غور فرمایئے! ایک ستر اسی سال کا بوڑھا، عالمگیر شہرت کا مالک، بھاری بھرکم انسان اور اسٹیج پر غزل گا رہا ہے۔ کا ہے کے لئے؟ تاکہ مدرسے کے غریب طالب علموں کے وظیفے کا انتظام ہو جائے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

چندہ جمع ہوا۔ مدرسہ (یکم جنوری ۱۸۷۸ء کو) کالج میں تبدیل ہو گیا۔ کالج کی عمارات تعمیر ہو گئیں، ایسی عمارات کہ انہیں دیکھ کر ایک ایرانی سیاح بے اختیار پکار اٹھا۔

واللہ معجزہ می نماید۔ کاریکہ از سلطنت برنیاید، چگونہ از یک فردِ رعیت سرانجام شُد۔

کفر کے فتوے

سرسید اس لُٹی پٹی قوم کی بازآفرینی کے لئے یہ کچھ کر رہا تھا اور ہمارے علمائے کرام اس کے پیچھے کفر کا ڈنڈا لئے پھر رہے تھے۔ جب سرسید نے مدرسہ کی بنیاد رکھی، تو ایک مولوی صاحب نے فتوے صادر کر دیا کہ:۔

جو لوگ مدرسۃ العلوم قائم کرنا چاہتے ہیں وہ درحقیقت مسلمان نہیں۔

جب سرسید کی کوششیں کچھ اور آگے بڑھیں تو دہلی سے ایک مفتی صاحب (مولوی کریم اللہ) اُٹھے اور انہوں نے فتوے دے دیا کہ:۔

ایسے ناپاک کا نام مدرسہ رکھنا اور محلِ تعلیم و تحصیل سمجھنا، آدمیت سے نکلنا ہے اور زمرۂ حیوانیت میں داخل ہونا ہے۔ بالکل عاطل بلکہ صرف کرنا مال کا ایسے محل میں موجب کنندہ ہونا جہنم اور ایسے بے محل میں مساعی ہونا ہیمہ اور حطب بننا لازم۔ الحاصل بمعاونت ایسے غارتیِ ایمان اور مال کی اور للہ سمجھنا اپنے مال کا خیالِ خام ہے سنے نیکیوں سمجھ کر اپنے ہاتھ سے جہنم میں مکان تعمیر کرنا ہے۔

فرنگی محل (لکھنو) کے مولوی عبدالحیٔ صاحب آگے بڑھے اور فرمایا کہ

یہ شخص مخرّبِ دین اور ابلیسِ لعین کے وسوسے سے صورتِ اسلام میں تخریبِ دینِ محمدی کی فکر میں ہے

حرمین سے فتوے منگائے گئے

جب یہاں کے فتاویٰ سے جی نہ بھرا تو دوڑے دوڑے مکّہ معظّم پہنچے اور وہاں سے مفتیانِ مذاہبِ اربعہ کا فتوےٰ حاصل کیا جس میں لکھا تھا۔

یہ شخص ضال اور مضل ہے بلکہ ابلیسِ لعین کا خلیفہ ہے۔ اس کا فتنہ یہود و نصاریٰ کے فتنے سے بھی بڑھ کر ہے۔ خدا اس کو سمجھے۔

اس سے بھی آگے بڑھے تو مدینہ منوّرہ پہنچے اور وہاں سے یہ فتویٰ حاصل کیا کہ

یہ شخص یا تو ملحد ہے یا شرع سے کفر کی جانب مائل ہو گیا ہے۔ پس اگر اس شخص نے گرفتاری سے قبل توبہ کر لی اور ان گمراہیوں سے رجوع کر لیا تو قتل نہ کیا جائے، ورنہ اس کا قتل واجب ہے دین کی حفاظت کے لئے۔ اگر اس کا مدرسہ بن جائے تو اس کا منہدم کر دینا واجب ہے۔

سرسیّد ملک کے گوشے گوشے میں جھولی بغل میں ڈالے اُمّتِ مرحومہ کے تحفّظ کے لئے بھیک مانگتا پھرتا اور ہمارے یہ حامیانِ دینِ متین اور علمبردارانِ شرعِ مبین اس کے پیچھے فتاویٰ کا پلندہ لئے پھرتے تھے۔ جہاں اس کا لیکچر ہوتا، شور مچا دیا جاتا۔ لوگوں کو مشتعل کر کے فساد کرا دیا جاتا۔ چندہ دینے والوں کو گھیر گھیر کر روک دیا جاتا۔ عوام کو اس کے قتل کے لئے اُکسایا اور بھڑکایا جاتا۔ انہیں آئے دن قتل کی دھمکیوں کے خطوط اور پیغام ملتے رہتے۔ سفر اور حضر میں اس کے لئے خطرے کے سامان پیدا کئے جاتے۔

آپ کو معلوم ہے کہ یہ کون تھا جسے دینِ محمدیؐ کا مخرّب اور ابلیسِ لعین کہا جاتا تھا۔ سنئے! برادرانِ عزیز! یہ کون تھا۔

سر ولیم میور کی کتاب کا جواب

سر ولیم میور یو۔ پی کا گورنر تھا۔ آج کا نہیں، اُس زمانے کا گورنر اور اُس صوبے کا گورنر جس میں سرسیّد سرکاری ملازمت میں تھا۔ اُس نے

حضور سرورِ کائنات ؐ کی سیرت پر ایک کتاب لکھی جس میں نبیِ اکرم ؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم پر بڑے ناروا حملے کئے۔ یہ تمام محافظینِ دینِ متین اپنے اپنے حجروں اور خانقاہوں میں بیٹھے دین کی حفاظت کر رہے تھے اور سارے ملک میں ایک یہ کافر و ملحد تن تنہا تھا جس نے سر ولیم میور کو چیلنج دیا اور کہا کہ دیکھو! میں تمہارے اعتراضات کی قلعی کس طرح کھولتا ہوں۔ جب سرسید نے جواب لکھنے کی ٹھانی تو دیکھا کہ اس کے لئے کافی مواد موجود نہیں۔ متعلقہ کتابیں انگلستان میں مل سکتی ہیں۔ وہ جب تعلیمی مشاہدہ کے لئے انگلستان گیا ہے تو اس پروگرام کو بھی اپنے ساتھ لے گیا اور لندن کے کتب خانوں میں بیٹھ کر سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھا۔ کتاب مرتّب ہو گئی تو اس کے چھپوانے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ اس پر قریب چار ہزار روپے لاگت آتی تھی۔ اس نے اپنی کتابیں، گھر کا سامان کھانے پکانے کے برتن بیچ کر، سود پر قرض لے کر، اپنے گہرے دوستوں سے بھیک مانگ کر، بڑی مصیبت کے ساتھ یہ روپیہ فراہم کیا اور اس کتاب کو چھپوایا۔ اس زمانے میں نواب محسن الملک کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

> چاہے میں محتاج، فقیر، بھیک مانگنے کے قابل ہو جاؤں، مگر کتاب ضرور چھپواؤں گا تاکہ جب قیامت کے دن میرا نام پکارا جائے تو خدا فرمائے کہ ”سیّد احمد“ کو بلاؤ جو اپنے نانا کے نام پر فقیر ہو گیا۔

سارا روپیہ ختم ہو گیا اور سرسیّد کے پاس ولایت سے واپس آنے کا کرایہ تک نہ رہا۔ نمعلوم اس نے کس طرح اس کا انتظام کیا۔ یہ تھا وہ ”کافر و ملحد“، جس کے خلاف مکّہ معظّمہ اور مدینہ منوّرۃ تک سے فتوے منگائے جا رہے تھے۔ یہ تو خیر پھر بھی ناموسِ رسالت پر مر مٹنے کا سوال تھا۔ سرسیّد کی حمیّتِ دینی کی شہادت تو روزمرّہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات تک دیتے تھے۔ ایک دفعہ ان کے ایک مخلص دوست (غالباً نواب وقار الملک) کا واسطہ ایک

سرسیّد کی دینی حمیّت

ایسے عیسائی افسر سے پڑا جو دفتر کے اوقات میں نماز پڑھنے پر معترض تھا۔ انہوں نے ایک خط میں اس بات کی اطلاع سرسیّد کو دی اور اُن سے مشورہ طلب کیا۔ سرسیّد نے خط ملتے ہی انتہائی غم و غصّہ کے عالم میں انہیں لکھا۔

> آج خط ملا اور حال معلوم ہوا۔ گو میں کسی وقت کی نماز پڑھ لیتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا۔ دو دو اکٹھی ملا کر پڑھ لیتا ہوں۔ ..... یہ سب باتیں مجھ میں ہیں اور نالائقی اور شامتِ اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے لیکن تم نے اس معاملہ میں جو پیش آیا ہے نہایت لچرپن کیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہے، اس کو ہم اپنی شامتِ اعمال سے جس خرابی سے ہو ادا کریں یا قضا کریں لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ نماز نہ پڑھو تو اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات سنی بھی نہیں جا سکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ

پڑھنا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے، لیکن کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا اور سُستی میں ڈالنا میرے نزدیک کفر ہے جو کبھی نہ بخشا جائے گا۔ تڑاق سے استعفیٰ دے دیتا تھا اور کہہ دیتا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشّان وقادرِ مطلق کی اطاعت کروں گا نہ کہ آپ کی۔ کیا ہوتا؟ نوکری میسّر نہ آتی، فاقے سے مر جاتے۔ نہایت اچھا ہوتا۔

وَالسّلام!

یہ تھا وہ مردِ غیور جس کے خلاف کفر اور الحاد کے فتوے شائع کیے جاتے تھے۔ اس نے تمام فتووں کا جواب ایک شعر میں دے دیا۔ سُنیئے کہ وہ کس سوز و گداز اور تپش و خلش سے کہتے ہیں کہ

خدا دارم، دِلے بریاں زعشقِ مصطفےٰ دارم

ندارد ہیچ کافر سازو سامانے کہ من دارم

سر سیّد نے کفر کے ان فتووں کے جواب میں کسی کو گالی نہیں دی، کسی پر غصّہ کا اظہار نہیں کیا لیکن جو کچھ کہا وہ اصولی طور پر ایسا ہے کہ اس قسم کے فتووں کے جواب میں جو ان حضرات کی طرف سے ہر زمانے میں ہر اس شخص کے خلاف صادر ہوتے رہتے ہیں جو کسی بات میں بھی ان سے اختلاف رکھتا ہو، پورے اعتماد کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے لکھا۔

فتووں کا جواب

ہم کو ملحد، زندیق اور لامذہب کہنا کچھ تعجب نہیں ہے کیونکہ ہماری قوم نے خدائے ذوالجلال کے سوا باپ دادا کے رسم و رواج کو اور اپنے قدیمی چال چلن کو دوسرا خدا مانا ہے اور پیغمبر آخر الزّماں محمّد رسول اللہؐ کے سوا اور بہت سے پیغمبر پیدا کئے ہیں، کتاب اللہ کے سوا انسانوں کی بنی ہوئی بہت سی کتابوں کو قرآن بنایا ہے اور ہم اس جھوٹے خدا اور فرضی پیغمبروں اور جعلی قرآنوں کو ایسا ہی برباد کرنے والے ہیں جیسے ہمارے جدِّ امجد ابراہیمؑ اپنے باپ آزر کے بت توڑنے والے تھے۔ ہم سچّے خدائے ذوالجلال کا جلال اور سچّے پیغمبر محمّد رسول اللہؐ کی نبوّت اور سچّی کتاب اللہ کی اطاعت دنیا میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ پھر وہ لوگ ہم کو ملحد و زندیق و لامذہب نہ کہیں اور نہ سمجھیں تو کیا کہیں اور کیا سمجھیں۔ کیونکہ ہم ان کے خداؤں اور پیغمبروں اور قرآنوں کو نہیں مانتے۔

جہاں تک ان کی اپنی ذات کا تعلّق تھا وہ کفر والحاد کے ان فتووں سے اثر نہیں لیتے تھے لیکن جب یہ حضرات کالج کے لئے چندہ کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے تھے، تو اس سے سر سیّد کو بہت دکھ ہوتا تھا۔ کس قدر

دکھ ہوتا تھا، اس کا اندازہ ان کی اس تقریر کے چند فقروں سے لگایئے جو انہوں نے لاہور میں اس وقت کی جب وہ کالج فنڈ کے لئے پنجاب کا دورہ کر رہے تھے اور مولوی صاحبان اُن کے پیچھے ڈگڈگی لئے پھر رہے تھے۔ انہوں نے اس عظیم اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

لاہور میں خطاب

اے بزرگانِ پنجاب! میں فرض کرتا ہوں کہ میں بدعقیدہ ہوں۔ مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی کے لئے کوشش کرے تو کیا آپ اسے اپنا خادم، اپنا خیر خواہ نہیں سمجھیں گے؟ آپ کیلئے دولت سرا بنانے میں، جس میں آپ آرام فرماتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں، آپ کے لئے مسجد بنانے میں، جس میں آپ خدائے ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں، چوہڑے، چمار، قلی، کافر، بت پرست اور بدعقیدہ سب ہی مزدوری کرتے ہیں۔ مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانہ کے دشمن ہوتے ہیں، نہ کبھی اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ پس آپ مجھ کو بھی اس مدرستہ العلوم کے قائم کرنے میں ایک قلی، چمار کی مانند تصور کیجئے اور میری محنت اور مشقّت سے اپنے لئے گھر بنتے دیکھئے اور اس وجہ سے کہ اس کا بنانے والا یا اس میں مزدوری کرنے والا ایک قُلی، چمار ہے، اپنے گھر کو مت ڈھایئے۔ کیا آپ صاحب مجھ بدبخت، نامۂ اعمال سیاہ کی شامتِ اعمال سے اپنی قوم کو اور ان کی اولاد کو نسلاً بعد نسلاً ڈبونا اور خراب و خستہ حالت میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ صاحب میری حالت کو بدتر جانتے ہو تو اس سے عبرت پکڑو، لیکن برائے خدا اپنی قوم کی، اپنی اولاد کی بھلائی اور بہتری کی تو فکر کرو۔

مولانا حالی کا بیان ہے کہ سرسیّد کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے اور سامعین پر سکتہ کا عالم طاری تھا کوئی مسلمان ایسا نہ تھا جو زار و قطار نہ رو رہا ہو اور جو اپنی بساط سے زیادہ چندہ دینے پر آمادہ نہ ہو۔

جلوت ہی میں نہیں، وہ خلوت میں بھی اپنے ان مخالفین کے خلاف دشنام طرازی پر نہیں اترتے تھے اور اپنی کیفیتِ قلب کا اظہار کرتے تھے تو نہایت دل دوزی اور جگر سوزی کے ساتھ۔ مثلاً وہ اپنے ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں۔

افسوس خدا ہاتھ نہیں آتا۔ جناب رسولؐ اللہ موجود نہیں۔ ورنہ ان میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر ان کے سامنے لے جاتا اور کہتا کہ اے خدا! اے جنابِ رسولؐ خدا! انحاکمہ کرو تم مجھ میں اور ان میں اور بتاؤ کہ تمہارا دوست دار آخر کون ہے یہ گنہگار یا یہ دیندار؟ اور انشاء اللہ اگر خدا سچ ہے اور قیامت درست ہے

تو یہ معرکہ ہو کر رہے گا۔

لیکن برادرانِ عزیز! اس معرکہ کے لئے تو قیامت تک کے انتظار کی ضرورت ہی نہیں۔ اس کا فیصلہ یہیں ہو گیا ہے۔ آج سرسید کا نام اسلام کے بہترین خادم اور ملتِ اسلامیہ کے سچے محسن کی حیثیت سے زمانہ کے صفحات پر درخشندہ ستاروں کی طرح چمک رہا ہے اور جنہوں نے اس کے خلاف فتوے صادر کئے تھے ان کا کوئی نام تک نہیں جانتا۔ اور کہیں ان کا ذکر آتا ہے تو اس حیثیت سے کہ انہوں نے سرسید کے خلاف فتوے صادر کئے تھے یعنی وہ سرسید کی نسبت سے پہچانے جاتے ہیں۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ.... كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ۔ (۳۷/۱۰۸-۱۱۰)

کالج کے نتائج

مُلّا کی ان تمام مخالفتوں کے باوجود کالج بن گیا اور اس کے نتائج برآمد ہونے شروع ہو گئے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے، کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں ۱۸۵۸ء میں کالج کھل گئے تھے جہاں ہندوؤں نے بکثرت داخلے لینے شروع کر دیئے تھے اور مسلمانوں سے کہا جا رہا تھا کہ انگریزی پڑھنا حرام ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۷۵ء تک جب مدرسۃ علی گڑھ کی بنیاد رکھی گئی، ملک میں قریب ساڑھے آٹھ سو ہندو گریجوایٹس تھے اور صرف بیس مسلمان۔ علی گڑھ کالج ۱۸۷۷ء میں کھُلا اور اس کے بیس سال بعد (جب سرسید کی وفات ہوئی) ملک میں (۱۲۶) مسلمان گریجوایٹس اور (۱۷۴) انڈر گریجوایٹس تھے۔ اس کالج نے اتنا ہی نہیں کیا بلکہ اس دیوار کو گرا دیا جو مسلمانوں کے اور علومِ عہدِ حاضرہ کے درمیان کفر کا ہوّا بن کر حائل تھی۔ نتیجہ یہ کہ ملک میں دیگر مقامات (مثلاً لاہور، امرتسر، کراچی، حیدرآباد، بہاولپور وغیرہ) میں مسلمانوں کے اسکول اور کالج کھلنے شروع ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جہاں ۱۸۸۱ء تک ملک میں صرف (۴۳) مسلمان گریجوایٹس تھے، ۱۸۹۳ء تک ان کی تعداد (۳۳۹) تک پہنچ گئی تھی۔ ۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۶ء تک صرف الہ آباد اور پنجاب میں ان کی تعداد (۱۸۵) تھی۔ عام تعلیم کی یہ حالت تھی کہ بنگال میں ۱۸۸۱ء میں کالجوں اور اسکولوں میں ایک لاکھ پچاسی ہزار مسلمان تھے اور ۱۸۹۶ء میں ان کی تعداد چار لاکھ نوّے ہزار تک پہنچ گئی۔ یہ نتیجہ تھا ایک مردِ خدا اندیش و دیدہ ور کی دُور نگہی اور جرأت آموزی کا۔

جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

میں برادرانِ عزیز! یہ کچھ کہہ رہا ہوں اور چشمِ تصور سے ان خیالات کو بھی سامنے لا رہا ہوں جو آپ کے دل میں گزر رہے ہیں کہ اگر سرسید کی ان کوششوں سے دو چار سو مسلمان لڑکے گریجوایٹس بن گئے تھے تو یہ کون

اس کا دُور رس نتیجہ

سا ایسا معرکہ آرا، کارنامہ ہے جس سے اسے قوم کا محسنِ اعظم سمجھ لیا جائے یہ ٹھیک ہے کہ آج کے حالات کے ساتھ مقابلہ کرنے سے یہ بات ایسی معرکہ آرا، نظر نہیں آتی، لیکن سر سید کی ان کوششوں کی صحیح اہمیّت و عظمت کا اندازہ کرنے کے لئے دو باتوں کو پیشِ نظر رکھیے۔ سب سے پہلے یہ کہ، بات دو چار سو یا دو چار ہزار مسلمان گریجوایٹس پیدا کرنے کی نہیں تھی، اصل بات اُس آہنی دیوار کے توڑنے کی تھی جسے قدامت پرست طبقہ کے غلط تصوّرات نے مسلمانوں اور علومِ عصرِ حاضر کے درمیان کھڑا کر رکھا تھا۔ سر سید کی بصیرتِ قرآنی نے یہ حقیقت اس کے سامنے بے نقاب کر دی تھی کہ جب تک انسان فطرت کی قوّتوں کو مسخر نہ کر لے، وہ مومن تو ایک طرف صفِ آدمیّت میں کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں ہو سکتا۔ اور فطرت کی قوّتوں کو مسخر کرنے کے لئے قوانینِ فطرت (لاز آف نیچر) کا مطالعہ لاینفک ہے۔ سر سید نے اس قرآنی اصول پر اس شدّ و مدّ سے زور دیا اور اصرار و تکرار سے نیچر، نیچر کا اعادہ کیا کہ وہ نیچری مشہور ہو گیا اور نیچر کی اہمیّت سے بے خبر مُلّا نے اسے اس پر ملحد اور بے دین قرار دے دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس باب میں سر سید کے ذہن نے بعض مقامات پر غلطیاں بھی کیں لیکن غلطیاں ہر پاؤنیر (سابق اوّل) سے ہوتی ہیں۔ ذرا سوچئے کہ اگر سر سید علمِ فطرت کے اس دروازے کو مسلمانوں کے سامنے نہ کھولتا تو آج ہم کس مقام پر کھڑے ہوتے اور اقوامِ عالم میں ہمارا کیا حشر ہوتا؟ دوسری بات یہ سامنے رکھیے کہ سر سید کی نگاہِ دور رس نے بھانپ لیا تھا کہ ہندوستان کی سیاست کا مستقبل کیا ہونے والا ہے۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ انگریز مجبور ہو گا کہ حکومت کی مشینری میں اہلِ ہند کو کسی نہ کسی شکل میں شریک کرے اور اس شرکت کے لئے علومِ مغرب سے واقفیت لازمی تھی۔ چنانچہ ابھی سر سید کو آنکھ بند کئے تھوڑا سا عرصہ ہی گزرا تھا کہ اس کے اس اندازے نے عملی شکل اختیار کرنی شروع کر دی۔ حکومت نے کونسل میں ہندوستانیوں کی نمائندگی کا فیصلہ کیا اور اب یہ مسئلہ زیرِ غور آیا کہ اس میں شرائطِ انتخاب کیا ہوں۔ ہندوؤں کا مطالبہ تھا کہ یہ انتخاب مخلوط ہونا چاہیئے۔ سر سید نے ۱۸۶۵ء میں کہا تھا کہ ہندوستان میں ایک قوم نہیں بستی، مسلمان اور ہندو دو الگ الگ قومیں بستی ہیں۔ سر سید کے جانشین نواب محسن الملک نے انتخاب کے اس سوال کو اٹھایا اور قوم کے قریب ستّر نمائندگان پر مشتمل ایک وفد لے کر گورنر جنرل کے پاس پہنچا۔ ہندوستان کی سیاست میں یہ پہلا موقع تھا جب مسلمانوں نے اپنے حقوق کے تحفّظ کے لئے اس قسم کا قدم اٹھایا۔۔۔ یہ کیا تھا؟ محض سر سید کی ان کوششوں کا نتیجہ کہ مسلمانوں کو مغربی تعلیم سے بے بہرہ نہیں رہنا چاہیئے۔ اس جدّ و جہد نے آگے چل کر مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم کی شکل اختیار کی اور ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا وجود عمل میں آیا جس کے جائنٹ

سیکرٹری علی گڑھ تحریک کے روحِ رواں نواب محسن الملک اور وقار الملک تھے۔ لیگ کا صدر مقام بھی علی گڑھ ہی تھا۔ یہی وہ تنظیم تھی جو آگے بڑھتے بڑھتے تحریک پاکستان کی صورت اختیار کر گئی اور ۱۹۴۷ء میں، یعنی سر سید کی وفات کے قریب پچاس سال بعد — مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے حسین پیکر میں نمودار ہوئی۔ ذرا سوچئے کہ اگر اس وقت سر سید ہمت سے کام نہ لیتا اور مسلمانوں پر انگریزی پڑھنا اور مغربی علوم حاصل کرنا بدستور حرام رہتا تو اس برصغیر میں مسلمانوں کی وکالت کرنے والا بھی کوئی مل سکتا؟ اس تحریک آزادی میں وہی لوگ پیش پیش تھے جو یا تو علی گڑھ کے پروردہ تھے یا سر سید کی تعلیمی تحریک کے ماتحت قائم شدہ دیگر اداروں کے پیدا کردہ — اگر سر سید یہ کچھ نہ کر جاتا تو نہ محمدؐ علی ہوتا نہ شوکت علی، نہ اقبال ہوتا نہ جناح اور ہم آج ہندوستان میں شودروں کی سی زندگی بسر کر رہے ہوتے۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو سر سیّد ہی درحقیقت پاکستان کا معمارِ اوّل ہے جس نے اس مملکت کی پہلی اینٹ اس دن رکھی تھی جب اس نے علی گڑھ مدرسہ کا افتتاح کیا تھا، یعنی ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کی مبارک و مسعود تاریخ کو۔ آج سے نوّے سال پہلے۔ اس مدرسے نے صرف گریجوایٹس پیدا نہیں کئے تھے مسلمان گریجوایٹس پیدا کئے تھے۔

حصول پاکستان

مدرستہ العلوم کی تعلیم سے سر سید کے پیشِ نظر کیا تھا، اس کا اندازہ ان کے چند فقروں سے لگایئے جن سے انہوں نے ایک دفعہ اپنے طلباء سے خطاب کیا تھا۔ انہوں نے کہا۔

مسلمان طلباء

> یاد رکھو سب سے سچا کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ ہے۔ اس پر یقین رکھنے کی بدولت ہماری قوم، ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے ستارے بھی ہو گئے تو کیا۔ مجھے امیّد ہے کہ تم علم اور اسلام دونوں کے نمونے ہو گے اور جبھی ہماری قوم کو حقیقی عزّت نصیب ہو گی۔

سر سید کے زیرِ تربیت جو نوجوان اس کالج سے نکلے، ان کے دل میں قوم کی محبّت اور اسلام کا درد کس حد تک تھا، اس کے لئے ان کی زندگی کی عملی شہادت ہمارے سامنے ہے۔ لیکن ان میں ارکانِ اسلام کی ادائیگی کے سلسلہ میں ڈسپلن کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایئے جسے صدق جدید (لکھنو) کے مدیر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

اذان کی آواز پر

> غالباً ۱۸۹۸ء کا ذکر ہے۔ سر سید کی وفات یا تو ہو چکی تھی یا عنقریب ہونے والی تھی، علی گڑھ کی شہرت کرکٹ کے میدان میں ہندوستان گیر ہو چکی تھی کہ ایک

کرکٹ میچ سول سروس والوں کے مقابل نینی تال میں قرار پایا۔ میچ شروع ہوا اور اتفاق سے جمعہ کا دن تھا اور سول سروس ٹیم کھیل رہی تھی اور علی گڑھ کھلاڑی تھی علی گڑھ کے شہرہ آفاق باؤلر اشفاق بادلنگ کر رہے تھے۔ بس ایک مرتبہ جو اشفاق نے گیند پھینکنے کے لئے ہاتھ اٹھایا کہ مسجد سے نماز جمعہ کی اذان کی آواز کان میں آئی اور معاً بلا توقف اس کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے گر گیا۔ اشفاق نے اتنا بھی نہ کیا کہ بولنگ ہی پوری کر لیتا سول سروس والے اس پابندیٔ احکام پر عش عش کر اٹھے۔

یہ تھے "بے دین اور نیچری" سر سید کی درسگاہ کے تعلیم و تربیت یافتہ نوجوان!

کالج بڑھتا گیا۔ سر سید کے ہاتھوں کے لگائے ہوئے پودے نے جھولیاں بھر بھر کر پھل دینے شروع کر دیئے کہ عین اس وقت وہ سانحہ پیش آیا جو دنیا کے ہر عظیم انسان کے ساتھ اس وقت پیش آتا ہے جب اس کی شہرت نصف النہار تک پہنچ جاتی ہے۔ چرچل نے ایک جگہ یہ بتانے کے بعد کہ جو لوگ عظمت کی بلندیوں پر پہنچتے ہیں۔ ان میں کیا خوبیاں ہوتی ہیں، کہا ہے کہ

> یہ عظمت بہت کم انسانوں کے حصے میں آتی ہے اور ان کے ساتھ بھی یہ بیتتی ہے کہ انہیں کبھی کمتر درجے کے انسانوں کا جذبۂ حسد اور بے اعتمادی ستاتا ہے اور کبھی انہیں دوسروں کی حماقتوں اور غلطیوں کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

اپنوں کی طرف سے مخالفت

بعینہٖ یہی کچھ سر سید کے ساتھ ہوا۔ سر سید نے جب دیکھا کہ اس کی عمر بڑھتی جا رہی ہے تو اُس نے فیصلہ کیا کہ کالج کے نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کے بجائے قوم کے معتمد علیہ لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ اس کے لئے اس نے ایک بورڈ آف ٹرسٹیز کی تجویز کی اور ایک کوڈ (ضابطہ) مرتب کیا اور تمام ممبروں کے پاس رائے کے لئے بھیجا۔ خان بہادر مولوی سمیع اللہ سر سید کے قدیمی دوست اور ایک معنی میں دستِ راست تھے۔ انہوں نے اس کوڈ کی بعض دفعات سے اختلاف کیا۔ بات معمولی تھی۔ کوڈ کمیٹی کے اجلاس میں اکثریت کی آراء سے پاس ہو گیا۔ اب اس اختلاف کو ختم ہو جانا چاہیئے تھا، لیکن خان بہادر نے اسے ذاتی سوال بنا لیا اور سر سید کی مخالفت شروع کر دی اس مہم میں کچھ اور لوگ بھی اس کے شریک ہو گئے۔

اگرچہ سر سید چالیس سال سے مسلسل مخالفتیں جھیلتے چلے آ رہے تھے اور ان سے ان کے عزم و حوصلہ اور

ثبات واستقامت پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا بلکہ ان کا جذبۂ عمل تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا تھا۔ لیکن وہ مخالفت بیگانوں کی طرف سے تھی۔ اب جو خود اپنوں کی طرف سے یہ طرزِ عمل سامنے آیا اور وہ بھی اس انداز کا کہ وہ محض حسد کی وجہ سے اسے ذاتیات تک کھینچ کر لے گئے، تو بالآخر:

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

سرسید کے دل پر اس سے سخت چوٹ لگی اور اس نے ان کی صحت پر بڑا بُرا اثر ڈالا۔ بایں ہمہ، وہ مردِ جرّی اسی بلند حوصلگی کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا، لیکن صحت کی کمزوری، عمر کی زیادتی، کام کی کثرت، ان سب نے مل کر اس شاہ بلوط کو گرا لیا اور ۲۷، مارچ ۱۸۹۸ء کی شب، یہ بطلِ جلیل، ایک خرمنِ مراد اپنے آغوش میں لئے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا صندوق کھولا گیا تو اس میں سے صرف پانچ روپے نکلے۔ چنانچہ اس کے کفن کا انتظام بھی اس کے دوستوں نے کیا۔ سرسید کی وفات پر ہندوستان ہی میں نہیں، دنیا کے مختلف حصّوں میں تعزیت کے جلسے منعقد ہوئے اور بڑے بڑے مشہور لوگوں نے سوگواری کے پیغامات بھیجے۔ میں اس وقت ان میں سے صرف ایک مرثیہ آپ کے سامنے پیش کرونگا جسے لندن کی ایک مشہور خاتون نے لکھا تھا۔ اس کا ترجمہ یہ ہے

> ایک تناور درخت جہاں کھڑا تھا وہیں گر پڑا۔ اس کی سایہ دار شاخیں چاروں طرف دور دور تک جھومتی تھیں اور صحت بخش شبنم ان سے ٹپکتی تھی۔ انہوں نے کثرت سے بیج بکھیرے اور ان کے سائے میں بنجر زمین میں حیاتِ تازہ کی نمود ہو گئی۔
>
> بیج پھوٹ نکلے۔ شگفتہ و شاداب پھول کھلنے لگے اور خوبصورت پھولوں نے، جو حسن اور توانائی سے آراستہ تھے، اس ویران ریگستان کو گلزار بنا دیا۔ اب اشک بہاؤ اس شاہانہ درخت کے لئے کہ اجل نے اسے گرا دیا۔
>
> غم کرو — لیکن امید کے ساتھ — کیونکہ وہ سرسبز و شاداب کھیتیاں جو اس کی عرق ریزیوں کا ثمر ہیں، اس کے مزار کے گرد لہلہا رہی ہیں۔ جن نونہالوں نے اس کے آغوش میں نشوونما پائی وہ اب پھول پھل رہے ہیں — یہ نونہال بھی اسی کی مانند زندہ رہیں گے تاکہ کسی نہ کسی ویرانہ کو گلزار بنا جائیں۔

اور الٰہ آباد کے ایک ہندو پنڈت نے کہا کہ

> ہم مسلمانوں سے دولت میں زیادہ ہیں، تعلیم میں زیادہ ہیں، تعداد میں زیادہ ہیں، مگر افسوس ہے کہ ہم میں کوئی سید احمد خان نہیں۔ بلکہ ہم اگر بیس بھی مل کر ایک ہو جائیں تو بھی سرسید احمد خان کے برابر نہیں ہو سکتے۔

یہ تھا سرسیّد جو ساری عمر قوم کے غم میں گھلتا رہا، مسلسل محنت کرتا رہا لیکن کبھی شہرت کا خواہاں نہ ہوا۔ جو لوگ کالج فنڈ میں عطیات دیتے تھے، وہ ان کے نام کتبوں پر کندہ کرا کر مناسب مقامات پر نصب کرا دیتا تھا۔ جو لوگ اپنے خرچ سے کمرے اور ہال بنوا دیتے تھے، وہ ان عمارات کو ان کے نام کے ساتھ منسوب کر دیتا تھا۔ لیکن اس نے نہ تو اپنے نام کا کہیں کوئی کتبہ نصب کرایا نہ کسی عمارت کو اپنے نام سے منسوب کیا۔ یہ بھی تجویز کی گئی کہ کالج کا نام اس کے نام پر رکھا جائے۔ اس نے اسے بھی مسترد کر دیا۔ اس کی عمر کے آخری حصّہ میں بعض دوستوں نے چاہا کہ (FOUNDER'S DAY) منائیں۔ سرسیّد کو معلوم ہوا تو اس نے کہا کہ جس کالج کو قوم کے پیسے پیسے سے تعمیر کیا گیا ہو اس کا بانی (فونڈر) کہلانے کا حق کس کو حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر تم نے منانا ہے تو (FOUNDER'S DAY) نہیں بلکہ (FOUNDATION DAY) مناؤ۔ چنانچہ اس تجویز کے مطابق مدرسہ کے

یومِ تاسیس مناؤ

یومِ تاسیس یعنی ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کی تقریب منائی جاتی رہی اور یہی وہ تقریب ہے عزیزانِ من! جسے منانے کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں۔ یہ دن مدرسۂ علی گڑھ ہی کا یومِ تاسیس نہیں بلکہ پاکستان کا یومِ تاسیس ہے۔

جب سرسیّد کی مخالفت انتہائی شدّت پر تھی اور اس کے رفیق، اس کی مدافعت کی کوشش کرتے تھے۔ تو اس نے ان میں سے ایک کو لکھا۔

مجھے کہاں تک بچاؤ گے۔ میں تو ہدفِ تیر ہائے ملامت ہو گیا ہوں اور روز بروز ہوتا جاؤں گا۔ شاید میرے بعد کوئی زمانہ آئے جب لوگ میری دلسوزی کی قدر کریں۔

دنیا میں بڑے لوگوں کے ساتھ بالعموم یہی ہوا کرتا ہے۔ یہ لوگ درحقیقت اپنے زمانے سے بہت آگے ہوتے ہیں اس لئے ان کا زمانہ ان کی صحیح قدر و قیمت نہیں پہچان سکتا۔ بعد میں آنے والے لوگ اس کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ یہی سرسیّد کے ساتھ ہوا لیکن سرسیّد کی سب سے بڑی یادگار مملکتِ پاکستان ہے۔ جب تک یہ مملکت زندہ و پائندہ ہے ـــ خدا اسے ابدالآباد تک زندہ و پائندہ رکھے ـــ اس وقت تک سرسیّد کا نام زندہ و پائندہ رہے گا اور اس کی دل سوزی کی قدر ہوتی رہے گی۔ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۶/۸۵ خدا کا ارشاد ہے۔ یہی تو وہ شمعیں ہیں جن سے انسانیت کی راہیں ہمیشہ جگمگاتی رہتی ہیں۔

معرکۂ دین و وطن

۱۱ ستمبر ۱۹۶۴ء کو قائدِ اعظم کی برسی کی تقریب پر جلسۂ عام سے خطاب

صدرِ محترم و برادرانِ عزیز! سلام و رحمت

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، میرے آج کے خطاب کا موضوع ہے "معرکۂ دین و وطن"۔ آپ میں سے جن حضرات نے تحریکِ پاکستان کی کشمکش کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یا جنہیں اس کی تاریخ سے دلچسپی رہی ہے، انہیں اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ اس موضوع سے مراد کیا ہے اور دین و وطن کا یہ معرکہ کیا تھا۔ لیکن ہماری موجودہ نسل کے نوجوان اس عنوان سے نہیں سمجھ سکیں گے کہ اس کا مفہوم کیا ہے۔ وہ کہیں گے

موضوع کی اہمیت

کہ دین، دین ہے اور وطن، وطن — ان دونوں میں کسی قسم کا تزاحم و تصادم کس طرح ہو سکتا ہے جو اسے معرکہ سے تعبیر کیا جائے۔ دین اور وطن کے معرکہ کے معنی ہی کچھ نہیں ہو سکتے۔ ہمارے یہ نوجوان سچے ہیں۔ ہم نے نہ آج تک تحریکِ پاکستان کی کوئی مستند تاریخ مرتب کی اور نہ ہی قائدِ اعظم (علیہ الرحمتہ) کی قابلِ اعتماد سوانح عمری شائع کی جس سے اس معرکہ کی تفاصیل سامنے آسکتیں اور اس سے ہماری اُبھرنے اور بڑھنے والی نسل سمجھ سکتی کہ وہ کیا جنگ تھی جو ہمارے قائد نے لڑی تھی اور کونسا معرکہ تھا جسے اس مردِ یکہ و تنہا، بایں ہمہ جرأت و بسالت، سر کیا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک اس جنگ کی علتِ غائی اور اس معرکہ کے وجوہ و اسباب سامنے نہ آئیں، نہ تحریکِ پاکستان کی غرض و غایت سمجھ میں آسکتی ہے اور نہ ہی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیوں کیا تھا۔ اس جداگانہ مملکت کے وجود میں لانے سے

مقصد کیا تھا۔ اگر یہ مملکت متشکّل نہ ہوتی تو ہمارا کیا حشر ہوتا اور اس کے متشکّل ہو جانے سے ہمیں کیا حاصل ہوا۔ اور یہ واضح ہے کہ جب تک ہماری موجودہ (اور آئندہ) نسل کے سامنے یہ حقائق نہ آئیں، نہ ان کے دل میں اس مملکت کی صحیح قدر و قیمت کا احساس پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی وہ اس کی حفاظت اور استحکام کے لئے کسی قربانی کے لئے بطیبِ خاطر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ میں نے اس ہال[1] میں قائدِ اعظم سے متعلق مختلف تقاریب کے سلسلہ میں جس قدر تقاریر کی ہیں، ان سب سے میرا مقصود یہی تھا اور آج کی تقریر سے بھی یہی مطلوب ہے۔

عزیزانِ من! آپ نے لوگوں کو اکثر کہتے سنا ہوگا کہ فلاں شخص کی زندگی بڑی کامیاب ہے۔ جب انسان کے سامنے کوئی بلند مقصود نہ ہو تو کامیاب زندگی کا معیار سمٹ سمٹا کر یہ رہ جاتا ہے کہ

بی اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے!

لیکن جن افراد یا اقوام کے سامنے زندگی کے بلند مقاصد ہوں ان کے ہاں کامیاب زندگی کا معیار کچھ اور ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی انسان کی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کے ماپنے کا پیمانہ یہ ہے کہ جب وہ دنیا میں آیا تو اس نے اپنے ماحول کو کیسا پایا اور جب وہ یہاں سے گیا تو اس نے اس ماحول کو کس حالت میں چھوڑا۔ اگر اس نے اپنے ماحول اور معاشرہ کو اپنے پیشِ نظر مقصد کے لئے ناسازگار پایا تو اس کا ردِ عمل کیا تھا جس زمانے میں ملوکیت کے استبداد کی وجہ سے ہماری قوتیں مفلوج اور ادارے مصلوب ہو چکے تھے، ہمیں ہمارے معلّمینِ اخلاق یہ سبق پڑھایا کرتے تھے کہ — زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز — اگر زمانے کے حالات تمہارے مقصد کے لئے سازگار نہیں تو تمہیں چاہیئے کہ اپنے مقصد کو چھوڑ کر زمانے کے ساتھ چلنے لگو۔ لیکن قرآن کی تعلیم اس کے برعکس تھی۔ یہ وہ تعلیم تھی جسے علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا کہ

کامیاب زندگی کا معیار

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار　با مزاجِ او بسازد روزگار

گر نسازد با مزاجِ او جہاں　می شود جنگ آزما با آسماں

بر کند بنیادِ موجودات را　می دہد ترکیبِ نو ذرات را

می کند از قوّتِ خود آشکار　روزگارِ نو کہ باشد سازگار

---

[1] وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال۔ (لاہور)

یعنی اگر زمانے کے حالات اس صاحبِ عزم و ہمّت کا ساتھ نہیں دیتے تو وہ زمانے کے دھارے کا رُخ بدل دیتا ہے اور اپنی مسلسل سعی و کاوش اور پیہم تگ و تاز سے اسے مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ چلے۔ اس لئے کہ ۔۔۔ ایّام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر۔ اس حقیقت کو حضرت علّامہ نے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار!
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

آیئے ہم دیکھیں کہ آج ہم جس بطلِ جلیل کی برسی منانے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں، اس معیار کے مطابق اس کی زندگی کامیاب زندگی کہلا سکتی ہے یا نہیں۔

محمد علی جناح کے شعور نے جب آنکھ کھولی تو اس نے دیکھا کہ اس کا ملک، انگریز کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اُس مردِ جسور و غیوّر کے لئے یہ احساس ناقابل برداشت تھا۔ اگر وہ زمانہ کے ساتھ چلنے کا مسلک اختیار کرتا تو وہ تمام مناصب و مدارج، جو اس زمانے میں کسی ہندوستانی کو مل سکتے تھے، اس کے قدم چومتے، لیکن اس نے یہ روش اختیار نہ کی اور ملک کو انگریزی استعمار کی گرفت سے نجات دلانے کے لئے مصروفِ تگ و تاز ہو گیا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا دور تھا۔ جب انگریز کے استبداد کی گرفت ڈھیلی پڑنی شروع ہوئی، تو اس کے سامنے ایک اور حقیقت بے نقاب ہوئی جس سے اس کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا اور یہ وہ دور ہے جس میں اسے ہندو، انگریز اور خود مسلمانوں کے ایک گروہ کے ساتھ چومکھی لڑائی لڑنی پڑی۔ یہی ہے وہ دَور جس میں اس کی صحیح عظمت ہمارے سامنے آتی ہے اور اس کی زندگی اس معیار پر پوری اترتی ہے جسے ہم نے کامیاب زندگی کا معیار قرار دیا ہے۔

ہندو کے عزائم

جب ملک سے انگریز کی گرفت ڈھیلی پڑنی شروع ہوئی، تو ہندو کے سینے میں چھپے ہوئے عزائم رفتہ رفتہ بے نقاب ہونے لگے۔ اس کی اسکیم یہ تھی کہ انگریز کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد، ہندوستان میں بسنے والے تمام افراد کو ایک قوم فرض کر کے، یہاں جمہوری انداز کی حکومت قائم کی جائے۔ بہ ظاہر ہے کہ جمہوری اندازِ حکومت میں سارا اقتدار اور اختیار، اکثریت کے ہاتھوں میں

رہتا ہے اور اقلیّت کو ان کے رحم و کرم پر زندگی گذارنی پڑتی ہے ۔ پنڈت جواہر لعل نہرو کے الفاظ میں ۔

دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت ، اقلیّت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہے۔ (میری کہانی ۔ جلد دوم ، ص ۴۵۵)

لہٰذا ہندو کی اسکیم کی رُو سے، ہندوستان میں جمہوری حکومت کے معنی یہ تھے کہ یہاں مسلمان مستقلاً اور دائماً ہندوؤں کے محکوم رہیں ـــــ اسے فطرت کی ستم ظریفی کہیے یا مسلمان بادشاہوں کی کوتاہ نگہی کہ جس ملک پر مسلمانوں نے ہزار برس تک حکومت کی ہو، وہاں یہ اقلیّت ہوں (ہمارا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان فرمانروا، ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بناتے۔ ایسا کرنا تو قرآن کی رُو سے جائز ہی نہیں۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ اگر ان حکمرانوں میں اسلامی نظریۂ زندگی کا شعور ہوتا اور یہ یہاں کی دبی اور کچلی ہوئی انسانیت کے ساتھ (جسے ہندو دھرم نے حیوانوں سے بھی بدتر مقام دے رکھا تھا) ذرا سا بھی انسانی سلوک کرتے تو وہ خود بخود حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتی اور آج ہندوستان کی سیاست کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ یہ تو خیر ضمنی بات تھی. واقعہ یہ تھا کہ ہندو کی اسکیم کے مطابق، مسلمان کو ہندوستان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندو کا غلام بن کر رہنا پڑتا یہ اسکیم اس مفروضہ پر مبنی تھی کہ ہندوستان کے تمام باشندے محض ایک ملک میں بسنے کی وجہ سے، ایک قوم ہیں. قرآن کی رُو سے یہ مفروضہ ہی غلط تھا۔ وہ قومیّت کی تشکیل، وطن کے اشتراک کی رُو سے نہیں کرتا، بلکہ آئیڈیالوجی کے اشتراک کی رُو سے کرتا ہے۔ اس کے اس اصول کی رُو سے صورت یہ تھی کہ مکہ کا رہنے والا ابوجہل، (جو نہ صرف اُس وطن کا باشندہ تھا جس وطن میں محمدؐ رسول اللہ رہتے تھے، بلکہ رنگ، نسل، زبان کے لحاظ سے بھی انہیں میں سے تھا) ایک دوسری قوم کا فرد تھا اور روم کا صہیبؓ، حبش کا بلالؓ اور فارس کا سلمانؓ، ایمان کے اشتراک کی بناء پر قرآنی اُمّت کے افراد. وطن، رنگ، نسل ، زبان کا اشتراک ابوجہل اور ابوبکرؓ کو ایک قوم کے افراد نہیں بنا سکتا تھا۔ تشکیلِ اُمّت کا یہ وہ اصول تھا جسے حضرت ابراہیمؑ نے ان چار لفظوں میں سمٹا کر بیان کر دیا کہ فَمَنۡ تَبِعَنِیۡ فَاِنَّہٗ مِنِّیۡ (۱۴/۳۶) جو میری پیروی کرتا ہے وہ میرا ہے یہ تھا

نیشنلزم کی لعنت

وہ معیارِ قومیّت جسے قرآن نے چودہ سو سال پہلے پیش کیا تھا اور جس کی دعوت علامہ اقبالؒ برسوں سے دیتے چلے آرہے تھے۔ انہوں نے بہت پہلے مسلمان کو متنبہ کیا تھا کہ

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مُسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدہ تہذیبِ نوی ہے غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوّت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے تو مصطفویؐ ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے

انہوں نے اس حقیقت کا اعلان کھلے الفاظ میں کیا کہ

نرالا سارے جہاں سے اسکو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

انہوں نے اس مسلمان سے جو مغربی اندازِ سیاست سے متاثّر ہو رہا تھا کہا کہ

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار قوّتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی!

اسی بنا پر انہوں نے کہہ دیا تھا کہ ہندوستان میں بسنے والا مسلمان، محض اشتراکِ وطن کی بنا پر ہندو کا ہم قوم نہیں ہو سکتا۔ یہاں کے تمام مسلمان، ایمان کے رشتے کی بنا پر، ہندوؤں سے الگ ایک مستقل قوم ہیں اور اسی بنا پر وہ ایک الگ مملکت کا تقاضا کرتے ہیں۔ اقبالؒ نے یہ مطالبہ ۱۹۳۰ء میں پیش کیا تھا، لیکن اُس وقت اس پر کسی نے خاص توجہ نہ دی اور (ہندو تو ایک طرف خود) مسلمانوں نے بھی اسے یہ کہہ کر درخورِ اعتنا نہ سمجھا کہ یہ محض ایک شاعر کا خواب ہے جسے حقیقت سے کچھ واسطہ نہیں۔ لیکن اب جو قائداعظمؒ نے اُسی حقیقت کو پیش کیا تو ہندو کے قصرِ سیاست میں زلزلہ آ گیا، اس لئے کہ اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد، اس کا وہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا تھا جس کی رُو سے وہ اپنی ہزار دس سال کی غلامی کا انتقام مسلمانوں سے لینا چاہتا تھا۔ یہ تھا وہ پہلا محاذ

مسلم قومیّت کیخلاف ہندو کا محاذ

جس پر قائداعظمؒ کو آزادی کی جنگ لڑنی پڑی۔ انہوں نے یہ آواز بلند کی تو چاروں طرف سے اس کے خلاف کائیں کائیں ہونے لگ

گئی۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے مارچ ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا نیشنل کنونشن کے خطبہ صدارت میں کہا۔

ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو، مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملکوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں۔

پھر انہوں نے اپنی سوانح عمری میں کہا۔

مسلم قومیت کا تخیل صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے۔

دوسری طرف سے مہاتما گاندھی نے پکارا کہ

میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو۔ وہ، اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کریں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا، تو اسلام کے بعد اسے ایک ہی قوم رہنا چاہیئے خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

(گاندھی کا خط جناح کے نام مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۴ء)

ہندوؤں نے تو یہ کچھ کہنا ہی تھا کہ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اس سے ان کے تمام منصوبے خاک میں مل رہے تھے، لیکن حیرت اس پر تھی کہ خود مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد بھی اس باب میں ہندوؤں کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔

نیشنلسٹ مسلمان

انہیں اُس زمانے میں نیشنلسٹ مسلمان کہا جاتا تھا جن میں جمعیت العلماء ہند، سرحد کے سرخ پوش، مجلسِ احرار، بہار کے انصار وغیرہ سب شامل تھے اور قائدِ اعظم کے اس مطالبہ کے خلاف ہندوؤں کی فوج کے ہراول دستے کے طور پر میدانِ جنگ میں اُتر آئے تھے چنانچہ صوبہ بہار کے اُس زمانے کے وزیر، ڈاکٹر سید محمود[1] نے (جواب ہندوؤں کے مظالم کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ہندوستان میں مشاورتی مجالس قائم کر رہے ہیں) یہاں تک کہہ دیا کہ

لفظ ہندی کو، ہندی زبان کے لئے نہیں بلکہ اہلِ ہند کے لئے اختیار کرنا چاہیئے۔ دنیا بھر میں صرف ہمارا ملک ہی ایسا ہے جس میں مختلف لوگ مذاہب کی رُو سے شناخت میں آتے ہیں۔ اس سے ہماری دماغی

---

[1] اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ (۱۹۷۲ء)

کیفیت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے اور ہمارے متعلّق یہ بات ثابت کر دیتی ہے کہ ہم اس برِّ اعظم کی علیحدہ مذہبی اقوام ہیں۔ اس لئے اب وقت آگیا ہے کہ ہم سب ایک مشترک نام اختیار کر لیں۔

یعنی ان کی تجویز یہ تھی کہ مسلمان (الگ قوم بننا تو ایک طرف) اپنے آپ کو الگ نام (مسلمان) سے بھی نہ پکاریں۔ یہ اپنے آپ کو صرف ہندی کہیں — تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری — اُدھر سے، جناب جوش ملیح آبادی صاحب (جو اُس زمانے میں اپنا ماہنامہ کلیم نکالتے تھے اور اب پاکستان میں تشریف فرما ہیں) للکارتے ہوئے بولے۔

اپنے آپ کو مسلم یا ہندو پہلے اور ہندوستانی بعد میں کہنا جغرافیائی صداقت اور فطری قانون کے خلاف ہے۔ مذہب زیادہ سے زیادہ ایک ذہنی لباس ہے، لیکن قومیّت اور وطنیّت تو ہمارے بدن کی جلد ہے بدن کی جلد کیسی؟ قومیّت تو ہمارا گوشت، پوست، اور ضمیر ہے۔ لباس ہر وقت بدلا جا سکتا ہے لیکن پوست اور ضمیر کو کون بدل سکتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ قومیّت اور وطنیّت ایک ایسی قدرتی چیز ہے جس کا تبدیل کر دینا طاقتِ بشری سے باہر ہے۔ (کلیم، دسمبر ۱۹۳۷ء)

حتّٰی کہ، دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) تک نے یہ کہہ دیا کہ "قومیّتیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ یہ وہ زمانہ تھا جب علّامہ اقبالؒ مرض الموت میں مبتلا، صاحبِ فراش تھے۔

مولانا مدنی مرحوم

ایک اتنے بڑے مذہبی عالم کی زبان سے یہ اعلان ان کے قلبِ حسّاس پر نشتر بن کر گرا اور ایک آہ بن کر ان الفاظ کی شکل میں ان کے لبوں تک آگیا کہ

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ — ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است — چہ بے خبر ز مقامِ محمّدِ عربی است!
بمصطفٰےؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بُولہبی است

اس کے بعد جب مولانا مدنی (مرحوم) نے اپنا جواب شائع کیا، تو حضرت علّامہؒ نے فرمایا۔

اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بہ حیثیت ایک سیاسی تصوّر کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو ہر وقت انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اوّل تو لادینی ہوگا اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پرواہی۔

غرضیکہ میدانِ سیاست میں چاروں طرف سے اس طرح کے حملے ہو رہے تھے اور قائدِ اعظمؒ (علّامہ اقبالؒ کی وفات

کے بعد) بھی وہ تنہا ان تمام حملوں کا جواب دے رہا تھا اور مسلمانوں سے کہہ رہا تھا کہ نیشنلزم کا یہ تصور ہندوستان میں انگریز کا جاری کردہ ہے جسے ہندو نے اپنی خاص مصلحت کے ماتحت اپنا لیا ہے۔ یہ نظریہ اسلام کے خلاف ہے اور ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کو تباہ و برباد کر دینے کا موجب۔ لیکن اس کے باوجود، یہ مخالفت مسلسل اور بدستور جاری تھی۔ اس مقام پر ضمناً یہ دیکھئے کہ وہی لوگ جو اُس وقت قائدِاعظم کی اس قدر مخالفت کرتے تھے، آج کس طرح، زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر، اور ہندوؤں کے ہاتھوں تنگ آ کر، اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہو رہے ہیں کہ اقبالؒ اور جناح صحیح کہتے تھے۔ (مثلاً) بجنور کے جریدہ، مدینہ کی ۲۸ اگست کی اشاعت میں،

اعترافِ حقیقت

مفتی عزیزالرحمٰن صاحب (جو مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کے خاص شاگردوں اور ارادت مندوں میں سے ہیں) کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں۔

"میں آپ کو آج کا نیشنلزم بھی بتلانا چاہتا ہوں کہ وہ ہے کیا؟ اس عقیدہ کا بانی میکیاولی ہے جو اٹلی میں ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوا۔ اس عقیدے کی رُو سے اسٹیٹ خیرِ اکبر یا خیرِ کُل ہے۔ اس کے مقابلہ میں انسان اس کا محکوم اور بندہ ہے۔ اگر کسی انسان کے مذہبی فرائض وطن اور اس کے تقاضوں سے آ کر ٹکراتے ہیں تو قابلِ رد ہیں اور مذہبی فرائض کی آواز بلند کرنے والا انسان وطن دشمن اور باغی ہے۔ اس عقیدے کی اشاعت انگریز نے تحریکِ خلافت کے زمانہ سے شروع کی اور اسلامی ملکوں کو اسلامی رشتہ سے جدا کر کے وطنیّت کے نام پر تقسیم کر دیا کیونکہ انگریز مسلمانوں کی منظّم طاقت سے گھبراتا تھا۔ یہی حربہ انگریز نے ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا اور تحریکِ خلافت جو ہندوستان میں مسلمانوں کی خالص اور اعلےٰ سیاسی قیادت تھی، اس کو نیست و نابود کر دیا۔ افسوس کہ ہم انگریز کی چال کو نہ سمجھ سکے جس کی بدولت انگریز کو اور کچھ عرصہ کے لئے ہندوستان میں ٹھکانا مل گیا۔ انگریز خوش تھا کہ اس نے اپنے سب سے بڑے حریف کو شکست دے دی۔

آج اسی عقیدے کے طفیل ہے کہ مسلمان ملکوں کے نام پر تقسیم ہو چکے ہیں۔ صدر ناصر محض اسی عقیدے کے سہارے عرب قومیّت کو متحد کر رہا ہے۔ اس کو اس سے سروکار نہیں ہے کہ اسلامی رشتہ عرب قومیّت سے زیادہ قوی ہے یا نہیں۔ اس کو اس سے بھی کوئی غرض نہیں ہے کہ مسلمانانِ عالم کس حال میں ہیں۔ ہاں دُنیا میں جو انسان بھی عربیت سے مُتّصِف ہے، یعنی جغرافیائی اعتبار سے عرب ہے، صدر ناصر اس کے لئے سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن جو مسلمان عرب جغرافیائی حدود سے باہر ہے، اس کی لاش پر وہ آنسو بہانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

اب رہا ہندوستانی مسلمانوں کا معاملہ۔ ان بیچاروں کا کیا پوچھتے ہو۔ یہ جہاں ایک طرف مظلوم ہیں وہاں اندھے مقلد بھی ہیں۔

اگر یہ (نیشنلسٹ حضرات) اُس وقت اس حقیقت کو سمجھ لیتے اور قائدِ اعظمؒ کی مخالفت نہ کرتے، تو آج پاکستان کا نقشہ بھی کچھ اور ہوتا اور ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کی حالت بھی کچھ اور بلکہ ہمارا خیال ہے کہ اس صورت میں ہندوستان میں کوئی مسلمان پیچھے رہتا ہی نہیں۔ تمام مسلمان ایک آزاد مملکت کے باشندے ہوتے جس کی حدود ان کی آبادی کے لحاظ سے متعیّن ہوتیں، یعنی ملک کی تقسیم، تمام مسلمانوں کی تعداد کے تناسب سے ہوتی اور یہ سب اس جدید مملکت کے باشندے ہوتے۔ خیر یہ تو ضمنی بات تھی۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ قائدِ اعظمؒ کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہو رہا تھا اور چاروں طرف سے اس کی اس قدر شدید مخالفت ہو رہی تھی۔ یہ وہ جنگ تھی جس کے متعلّق علّامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن

اس معرکہ میں وہ مردِ مجاہد، اپنے آہنی عزم کے ساتھ چٹان کی طرح کھڑا رہا اور ہر دیدۂ بینا سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا!

اب برادرانِ عزیز! آگے بڑھیئے اور اس معرکۂ دین و وطن کا دوسرا انداز دیکھئے۔

ہندو، مسلمانوں سے یہ کہتا تھا کہ جب انگریز یہاں سے چلا جائے گا تو ملک آزاد ہو جائے گا اور اس کے بعد ہم تمہیں مذہبی آزادی دے دیں گے۔ تم اطمینان اور سکون سے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ادا کرتے رہنا۔ اب اور چاہتے کیا ہو، ہیں بڑی مل جائے! اس کے جواب میں ان سے کہا جاتا کہ مذہب کے متعلّق یہ تصوّر، ہندو دھرم کے سلسلہ میں تو درست ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک اسلام کا تعلّق ہے، یہ مذہب نہیں، دین ہے اور دین کے معنی ہیں طریقۂ زندگی، نہجِ حیات، آئینِ مملکت، دستورِ حکومت۔ مسلمان دین کے نقطۂ نگاہ سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتا جب تک اس کی اپنی آزاد مملکت نہ ہو

مذہب اور دین میں فرق

جس میں یہ دین کو ایک عملی نظام کی حیثیت سے رائج اور متمکن کر سکے۔ جب اسلام کا یہ تصوّر پیش کیا گیا تو یوں سمجھو گویا کسی نے بھڑوں کے چھتے میں پتھر دے مارا ہو۔ چاروں طرف سے مخالفت کی ایسی یلغار ہوئی کہ توبہ بھلی۔ یوں نظر آتا تھا گویا یہ لوگ جناح کو نوچ ہی ڈالیں گے۔ ایک طرف سے پنڈت جواہر لعل نہرو للکارے، "جس چیز کو دین یا

منظّم مذہب کہتے ہیں ،اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمّت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے تک کی آرزو کی ہے۔ یہ اندھے یقین، ترقی دشمنی، بے دلیل عقیدت اور تعصّب اور توہم پرستی کا دوسرا نام ہے۔" (میری کہانی)

دوسری طرف سے گاندھی جی کی آواز آئی کہ

اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو بالکل الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم، میں اس (علٰحدگی) کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ؟ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے، مثلاً صحت، رسل و رسائل، امورِ خارجہ وغیرہ۔ مذہب سے اسے کچھ واسطہ نہیں ـــــ مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔

(ہریجن، مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۴۶ء)

اِدھر ایوانِ اسمبلی سے مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے (جو اُس زمانہ میں مرکزی اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے) چلّا کر کہا۔

اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آ چکا ہے کہ ہم اس کا اعتراف کر لیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمانوں کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور انہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تو تصوّر بھی ناممکن ہے کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عصرِ حاضر میں بہترین نظامِ حکومت اس نظریہ پر قائم ہو سکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک قوم بن جائیں۔ (ہندوستان ٹائمز ۹/۵/۳۸)

بھولا بھائی ڈیسائی نے یہ کہا اور اُدھر سے جناب جوش ملیح آبادی نے مصرعہ اٹھایا اور کہا کہ بجا فرمایا آپ نے۔

مذہب ہے ہی ایسی چیز ـــــ عزیزانِ من! میں ان کے الفاظ کو سینہ پر پتھر رکھ کر دُھرا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا۔ عظیم الشّان پیغمبروں کی (معاذ اللہ معاذ اللہ) حسرتناک تاریخیں اور ان کی پاک زندگی کے حوصلہ شکن حالات ہمارے سامنے ہیں اور ہم سے صاف الفاظ میں کہہ رہے ہیں کہ انسان کی دکھتی ہوئی رگ کا چھیڑنا کس قدر بے نتیجہ اور خطرناک ہوا کرتا ہے۔ مذہب کا بیان یہ ہے کہ خدا نے انبیاء کے ذریعے نوعِ انسان کی

اصلاح کرنی چاہی تھی اور اس سلسلہ میں ہزاروں نہیں لاکھوں انبیاء مبعوث فرمائے تھے مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا؟
اس کا جواب مجھ سے نہ طلب فرمایئے۔ عام انسانی حالات و میلانات کو دیکھ کر ذرا اندازہ کر لیجئے کہ انسانیت کا سوادِ اعظم کس راستے پر گامزن ہے۔ (کلیم، نومبر ۱۹۳۷ء)

اس سے آپ، برادران! اندازہ لگا لیجئے کہ جس وقت قائدِ اعظمؒ نے یہ آواز اٹھائی تھی کہ مسلمان اپنے لئے ایک آزاد مملکت چاہتے ہیں تاکہ اس میں اپنے دین کو ایک عملی نظام کی حیثیت سے اختیار کر سکیں، اس وقت ملک کا ماحول کس قسم کا تھا۔ آج لوگوں کو عام طور پر اتنا ہی معلوم ہے (اس لئے کہ انہیں بتایا ہی یہ جاتا ہے) کہ یہ مہاتما گاندھی اور قائدِ اعظمؒ کے مابین لیڈری کی جنگ تھی یا زیادہ سے زیادہ بساطِ سیاست کی مہرہ بازی۔ کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ یہ جنگ درحقیقت، کفر اور اسلام کی جنگ تھی، حق و باطل کی جنگ تھی، شرک اور توحید کی جنگ تھی جس میں ایک مغربی وضع کا سن رسیدہ نحیف و نزار مسلمان ایک طرف تھا اور ہندو کی پوری قوم کے علاوہ، (بزعمِ خویش) اسلام کے مدعی — جمعیت العلماء — احرار جماعتِ اسلامی اور جوش جیسے نیشنلسٹ سب متحدہ محاذ بنائے اس کے مقابل کھڑے تھے۔ اور وہ ان سب سے اپنے یقینِ محکم کی پوری قوت کے ساتھ کہتا تھا کہ

جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا

تم دیکھنا کہ حق بالآخر کس طرح غالب آکر رہتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے ارمغانِ حجاز میں لکھا ہے۔

نگہ دارد برہمن کارِ خود را
نمی گوید بکس اسرارِ خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر
بدوش خود برد زنارِ خود را

اس میں، درحقیقت، اُس زمانے کی ہندوانہ سیاست کی صحیح صحیح تصویر کھینچی گئی ہے۔ ہندو کی ایک طرف تو یہ کیفیت تھی کہ وہ مسلمان کی زبان سے یہ لفظ بھی نہیں سننا چاہتا تھا کہ مذہب کو سیاست میں کوئی دخل ہے۔ اور دوسری طرف یہ لوگ، انگریز کے چلے جانے کے بعد ہندوستان میں جس معاشرہ کی تشکیل کرنا چاہتے تھے اس کی بنیاد خالص ہندو فلسفہ پر رکھتے تھے۔ چنانچہ اگست ۱۹۳۹ء میں، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سیکرٹری اچاریہ کرپلانی

نے ایک طویل بیان میں بتایا کہ جو لوگ کانگریسی سیاست سے دلچسپی رکھتے ہیں انہیں معلوم ہو جانا چاہیئے کہ یہ مسئلہ صرف سیاست کا نہیں، بلکہ ہندو فلسفۂ حیات اور نظریۂ زندگی کا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے گاندھی جی کی قیادت قبول کی ہے اور

گاندھی کا فلسفۂ حیات

گاندھی جی نے کانگریس کو بتایا ہے کہ ہمارا کام صرف یہ نہیں کہ ملک کی سیاسی باگ ڈور انگریز کے ہاتھ سے چھین کر اہلِ ملک کے ہاتھ میں دے دیں، بلکہ سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اپنی تمام جدّوجہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفۂ حیات پر رکھیں جس کے دائرے میں ہماری معاشرت، اخلاق اور روحانیت سب کچھ داخل ہو۔ بالفاظِ دیگر ہماری تحریک کو صرف سیاسی نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے روحانی اور اعلےٰ فلسفۂ زندگی کے تحت ہونا چاہیئے تاکہ اس جدّوجہد سے نہ صرف ہماری سیاسی زندگی متاثر ہو بلکہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ اس سے اثر پذیر ہو اور ہماری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو جسے ہم تاریخ کا نیا دور کہہ سکیں۔ زندگی کا یہی وہ نیا باب اور نیا دور ہے، جسے گاندھی جی کانگریس کے ذریعے ہندوستان میں لانے کی سعی کر رہے ہیں۔

اب ذرا یہ بھی سُن لیجیئے کہ جن گاندھی جی کے فلسفۂ حیات کو ملک گیر نظام کی حیثیت سے رائج کرنے کا تہیّہ کیا جا رہا تھا، وہ گاندھی جی کس فلسفۂ حیات کے داعی تھے۔ اس حقیقت کو خود گاندھی جی کے الفاظ ہی میں سنیئے۔ انہوں نے اپنے متعلّق فرمایا تھا کہ

ہندو گاندھی

میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیوں کہ میں ویدوں، اُپ نشدوں، پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں۔ اوتاروں کا قائل ہوں اور تناسخ پر عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں گئو رکھشا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہوں اور بت پرستی سے انکار نہیں کرتا۔ میرے جسم کا رُواں رُواں ہندو ہے۔

(ینگ انڈیا، ۱۲ ۱۹۲۱/۱۰)

یہ تھے وہ گاندھی جی جن کے متعلّق، مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کا ارشاد تھا کہ

گاندھی جی نے جنگِ آزادی میں اپنی جان اور مال دونوں لٹا دیئے۔ پس وہ فی الحقیقت مجاہد فی سبیل اللہ ہیں۔

(مضامینِ آزاد، ص ۱۹)

اور انہوں نے پرتاب گڑھ کانگریس کے موقع پر اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا کہ

وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا ایک ہی روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی روح کو تھکنے نہیں دیتا۔

ایک دفعہ شملہ کے ایک جلسہ میں مسٹر ستیا مُورتی کی تقریر تھی جس کی صدارت مسٹر آصف علی مرحوم کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا۔

ٹیچر کا درجہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ تم کرائسٹ، بُدھ، محمدؐ کو بھی ٹیچر کہتے ہو۔ مہاتما گاندھی بھی اسی قسم کے ٹیچر ہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ اُس وقت مسلمان کی ذہنیت کیا بنتی جا رہی تھی؟ اور یہ عقیدہ اُس گاندھی کے متعلّق پھیلایا جا رہا تھا جس کا کیریکٹر یہ تھا کہ ایک دفعہ انہوں نے ملک میں شراب بند کر دینے کی تجویز کی۔ لوگوں نے کہا کہ اسی طرح آپ جوا اور گھوڑ دوڑ بھی بند کرا دیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ

مہاتما گاندھی کا کردار

اگر میں جوئے کے خلاف مہم شروع کر دوں، تو خطرہ ہے کہ میں ان لوگوں کو ہاتھ سے کھو دوں گا جو میری مستقل طور پر روپے سے مدد کرتے ہیں۔ اگر گھوڑ دوڑ بند کرا دوں تو وائسرائے سے لے کر معمولی آدمی تک میرے خلاف ہو جائیں گے۔ اس طرح میری مہاتمائی ختم ہو جائے گی اور کیا عجب کہ میں اپنے سر کو بھی کھو دوں۔

(ہری جن ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۹ء)

اور سنیئے۔ جب دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی ہے تو مہاتما گاندھی اُس زمانے کے وائسرائے (لارڈ لنلتھگو) سے ملے اور اس کا تصور کر کے کہ اس سے لندن کی اہم عمارات کس طرح بمباری سے تباہ ہو جائیں گی، وہ رقّت میں آ گئے اور اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ "اگر انگلستان اور فرانس کو شکست ہو گئی تو ہندوستان کو آزادی حاصل کرنے سے کیا فائدہ ہو گا"۔ اس کے بعد انہوں نے ایک بیان جاری کیا جس میں جنگ کے حق میں پُرزور الفاظ میں تائید کی۔ اس بات کو بمشکل ایک مہینہ گزرا ہو گا کہ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان جنگ کے معاملے میں انگریزوں کی مدد نہیں کرے گا جب تک اس کا مطالبۂ آزادی تسلیم نہیں کیا جائے گا چنانچہ اس فیصلہ کی تعمیل میں کانگریس کے مرکزی اسمبلی کے ممبروں نے اسمبلی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اب لوگوں کی اور بالخصوص لارڈ لنلتھگو کی نگاہیں گاندھی جی کی طرف لگ رہی تھی کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ اور دنیا حیران رہ گئی جب انہوں نے گاندھی جی کا یہ بیان پڑھا کہ میں مجبور ہوں۔ میں تو ایک کی اقلیت ہوں۔ کانگریس ٹھیک کہتی ہے اور اس کے بعد لارڈ لنلتھگو کو مشورہ دیا کہ آپ ہمارا تعاون چاہتے ہیں تو کانگریس کی شرائط منظور کر لیجئے۔ یہ تھے وہ گاندھی جی جنہیں نیشنلسٹ مسلمان (معاذ اللہ) حضرت مسیحؑ اور جناب نبئ اکرمؐ کے پایہ کا ٹیچر مانتے تھے اور انہیں مجاہد فی سبیل اللہ کہہ کر پکارتے تھے۔

یہ تھی اُس وقت مسلمانوں کی ذہنیت جس کے خلاف قائدِ اعظمؒ کو یہ چومکھی لڑائی لڑنی پڑ رہی تھی ہندو نے اس حقیقت کو پالیا تھا کہ مسلمانوں کی اپنے دین کے ساتھ والہانہ وابستگی اس لئے ہے کہ وہ اسے تمام مذاہب عالم سے افضل و اعلیٰ سمجھتے ہیں بلکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اب دینِ خالص صرف اسلام ہے اس کے

تمام مذاہب یکساں ہیں

علاوہ باقی مذاہب اس سچّائی پر نہیں رہے جو انہیں خدا کی طرف سے ملی تھی۔ اس نے (ہندو نے) سوچا کہ ہندوستان سے اسلام کو (معاذ اللہ) ختم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کی نئی نسل کے دل سے اس خیال کو نکال دیا جائے اور اس کی بجائے انہیں یہ سکھایا جائے کہ تمام مذاہب یکساں طور پر سچّے ہیں اور کسی ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ اس سلسلہ میں مہاتما گاندھی کے اُس زمانہ کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر مہادیو ڈیسائی نے کہا کہ

> ایک جداگانہ قومیّت کا تخیّل اس خیال سے پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا مذہب دوسرے مذاہب پر فوقیّت رکھتا ہے۔
>
> (ہریجن، بابت ۲۵ ۱۱/۳۹)

اور خود مہاتما گاندھی نے کہا کہ۔

> میری روح اس بات کے تصوّر سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندومت مختلف اور متضاد کلچر اور نظریۂ حیات کے حامل ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مترادف ہے کیونکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کا خدا بھی وہی ہے جو گیتا کا خدا ہے۔
>
> (ہندوستان ٹائمز، مورخہ ۱۴ ۴/۴۰)

وہ اسے انتہائی تنگ نظری پر محمول کرتے تھے کہ یہ کہا جائے کہ مسلمان ایک جداگانہ اور برتر نظریۂ زندگی پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

> میں ایک تنگ نظر ہندو یا تنگ نظر اسلام کا تصوّر نہیں کر سکتا۔ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے اور ایک بہت بڑی قوم ہے جو مختلف تہذیبوں پر مشتمل ہے اور یہ تہذیبیں ایک دوسری میں جذب ہونی شروع ہو گئیں ہیں۔ لیکن مسلم لیگ نے مسلمانوں کو یہ سبق پڑھانا شروع کر دیا ہے کہ یہ تہذیبیں ایک دوسرے میں جذب نہیں ہو سکتیں۔
>
> (ہندوستان ٹائمز، مورخہ ۱۵ ۵/۴۰)

آپ نے خیال فرمایا کہ اس خیال سے ہندو کے دل پر کیا گزرتی تھی کہ مسلمانوں کا دین، ہندومت سے الگ اور افضل ہے اور مسلمان ایک جداگانہ تہذیب و تمدّن کے علمبردار ہیں۔ مسلمان بچّوں کے دل سے اس خیال کو نکالنے کے لئے

مہاتما گاندھی نے ایک تعلیمی اسکیم کا منصوبہ بنایا (جسے واردھا کی تعلیمی اسکیم کہا جاتا ہے) اس سلسلہ میں انہوں نے کہا۔

> یہ سخت خطرناک بات ہے کہ بچوں کو یہ پڑھایا جائے کہ ان کا مذہب باقیوں سے افضل ہے۔ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس لئے سب مذاہب برابر ہیں۔

مولانا آزاد کی طرف سے سند

لیکن ظاہر ہے کہ مسلمان، اسلام کے متعلق گاندھی جی کی رائے کو سند ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے لئے کسی عالمِ دین کی سند درکار تھی۔ یہ سند مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر (ترجمان القرآن) سے بآسانی مل گئی جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ

> عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ قرآن نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔

مولانا آزاد کی تفسیر کے اس حصے کا ہندی میں ترجمہ کیا گیا اور کانگریس کی طرف سے اس کی عام اشاعت کی گئی۔ اس تعلیمی اسکیم کا منصوبہ تو گاندھی جی کی اُپج کا نتیجہ تھا لیکن اسے مرتّب کیا ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے (جو اب بھارت کے نائب صدر[1] ہیں) یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علّامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

چنیں دور آسمان کم دیدہ باشد — کہ جبریلِ امیں را دل خراشد
چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا — پرستد مومن و کافر تراشد

یہ تعلیمی اسکیم اگر بروئے کار آجاتی، تو اس کے نتائج جس قدر خطرناک ہو سکتے تھے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لِلّٰہ الحمد کہ ہندو کا یہ منصوبہ بھی پروان نہ چڑھ سکا اور انہیں اس تعلیمی اسکیم کے مطابق تیار کردہ کتابیں بمبئی کے ساحل سے سمندر کی نذر کرنی پڑیں۔

مسٹر ساورکر

یہ تو تھے وہاں کے کانگریسی لیڈروں کے عزائم اور ارادے۔ دوسرے لیڈر اپنے تشدّد میں ان سے بھی بڑھ کر تھے یا یوں کہیئے کہ کانگریسی لیڈر جو کچھ اپنے سینوں میں چھپائے رکھتے تھے، دوسرے لیڈر انہیں برملا اُگل دیتے تھے۔ مثلاً ہندو مہاسبھا کے پریذیڈنٹ مسٹر ساورکر کہتے تھے کہ

> لفظ ہندو سے عبارت ہے ہر وہ شے جو ہندوستان کی ہو مثلاً کلچر نسل اور روایات اور ہندو کے معنی

---

[1] بعد میں وہ وہاں کے صدر مقرّر ہو گئے تھے اور اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ (۱۹۷۲ء)

ہیں ہر وہ شخص جو ہندوستان کا رہنے والا ہو اور جس کے آبا و اجداد یہاں کے باشندے ہوں۔

(ہندوستان ٹائمز ۲۰ ۲/۳۹)

یعنی انہوں نے (بزعمِ خویش) فیصلہ کر لیا تھا کہ ہندوستان میں رہنے والے مسلمان، ہندو ہی ہیں۔ ہندو مہاسبھا کے نائب صدر ڈاکٹر رادھا پرشاد مکرجی نے آل انڈیا ہندو ویدک یوتھ کانفرنس (لاہور) کی صدارت کرتے ہوئے کہا۔

ہندوستان کو نظری اور عملی طور پر ایک ہندو اسٹیٹ ہونا چاہیے جس کا کلچر ہندو اور جس کا مذہب ہندو ازم ہو اور جس کی حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہو۔

اس اسٹیٹ میں مسلم اقلیت کی کیا حالت ہو گی، اس کے متعلق آپ پنڈت جواہر لعل نہرو کا وہ بیان پہلے سن چکے ہیں جس میں انہوں نے کہا تھا کہ

جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے تابو میں رکھتی ہے۔

اور اس جواہر لعل کے متعلق مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کا ارشاد تھا کہ

جواہر لعل نہرو ہندو ہے۔ اس نے کبھی نہیں کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اس کے باوجود وہ مسلمانوں کی حفاظت چاہتا ہے۔

یہ تھا، برادرانِ عزیز! وہ ماحول جس میں قائدِاعظم محمد علی جناحؒ، گھرا ہوا اکیلا لڑ رہا تھا ـــــ اس طرح اکیلا جس طرح سمندر کی تلاطم خیز موجوں میں روشنی کا مینار کھڑا ہو۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں (بادنیٰ تصرّف)

ہوا تھی گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا تھا
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے تھے اندازِ خسروانہ

نظریۂ پاکستان کی مخالفت

ان حالات میں اس مردِ آہن گداز نے پاکستان کا مطالبہ پیش کیا اور اس پر انتہائی ثبات و استحکام سے کھڑا رہا۔ پاکستان کا مطالبہ اسلام کے نام پر کیا گیا تھا کہ اس سے مقصود ہی ایک ایسی آزاد مملکت کا حصول تھا جس میں اسلام کو ایک زندہ نظامِ حیات کی حیثیت سے متمکّن کیا جا سکے۔ پاکستان کے مطالبہ کا ریزولیوشن مارچ ۱۹۴۰ء میں پاس ہوا اور شروع اپریل ۱۹۴۰ء میں مہاتما گاندھی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں پوری جرأت اور جسارت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناح اور اُنکے ہم خیال حضرات اپنی اس روش سے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے بلکہ وہ اس پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہے

ہیں جو لفظ اسلام کے اندر پوشیدہ ہے مجھے یہ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آجکل مسلم لیگ کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے اس سے میرے دل پر سخت ٹھیس لگ رہی ہے۔ میں اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کوتاہی کروں گا۔ اگر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس دروغ بافی سے متنبّہ نہ کر دوں جس کا اس نازک وقت میں ان میں پراپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔

(ہندوستان ٹائمز، ۲۲/۴۴ ے)

مودودی صاحب کی تائید

یہ تھا گاندھی جی کا فتویٰ (کہ قائدِ اعظمؒ اور ان کے رفقاء اسلام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں) اس کی ہم نوائی میں دوسری طرف سے ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے آواز دی کہ بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے یہ لوگ واقعی اسلام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ

لیگ کے قائدِ اعظمؒ سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے پرکھتا ہو۔

(ترجمان القرآن، ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ۔ ص ۳۳)

پاکستان کے مطالبے کا مقصود یہ تھا کہ اس مملکت میں حکومتِ خداوندی قائم کی جائے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے، ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۱۴ نومبر ۱۹۳۹ء کی اشاعت میں لکھا کہ

حکومتِ خداوندی کا تصوّر ایک داستانِ پارینہ ہے اور یہ مسلمانوں کا فعلِ عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لئے ملک کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ علامت بڑی خوش آئند ہے کہ مسلمانوں کے ذمّہ دار راہ نما اس سراب کے پیچھے نہیں لگنا چاہتے۔

ہندوستان ٹائمز نے یہ کہا اور ادھر سے مودودی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔

جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلّط سے آزاد ہو جائیں، تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی، ان کا گمان غلط ہے۔ اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ (ترجمان القرآن، محرم ۱۳۶۲ھ ص ۲۹)

آپ نے غور فرمایا کہ وہی حضرات جو اب پاکستان میں حکومتِ خداوندی قائم کرنے کے دعویدار ہیں، اُس

مسلمانوں کی طرف سے مخالفت

وقت کس طرح ہندوؤں کی ہمنوائی میں اس تصوّر کی مخالفت کر رہے تھے۔ انہی کے ساتھ وہ مسلمان بھی شامل تھے جو

اپنے آپ کو نیشنلسٹ کہتے تھے۔ مثلاً سندھ کے خان بہادر اللہ بخش نے پاکستان کی تجویز کے متعلّق کہا۔

یہ اسکیم آزادیٔ ہند کے راستے میں روڑے اٹکاتی ہے۔

عبدالرحمٰن سرحدی صاحب نے فرمایا

یہ ہندوستان میں برطانوی تسلط قائم رکھنے کا ذریعہ ہے۔

مولانا حفیظ الرحمٰن سیوہاروی (مرحوم) نے کہا کہ

یہ برطانوی حکومت قائم رکھے گی۔

احراری لیڈر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی (مرحوم) نے فرمایا۔

یہ اسکیم ملک کے مفاد کے لئے بالعموم اور مسلمانوں کے مفاد کے لئے بالخصوص نقصان رساں ہے۔

اگر کبھی اسلامستان وجود میں آیا تو احرار کے ہاتھوں آئے گا۔

بظاہر "اپنوں" کی طرف سے

یہ لوگ تو پھر بھی تحریکِ پاکستان کے کھلے ہوئے مخالف تھے قیامت تو یہ تھی کہ بظاہر موافقین میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو اس مطالبہ کی مخالفت میں ان لوگوں سے پیچھے نہ تھے۔ تحریکوں کو جس قدر نقصان منافقین کے ہاتھوں سے پہنچا ہے کھلے ہوئے مخالف اتنا نقصان کبھی نہیں پہنچا سکے۔ اُس زمانے میں پنجاب میں سر سکندر حیات خان، وزیرِ اعظم تھے اور بنگال میں مولوی فضل الحق صاحب۔ سر سکندر کی یہ کیفیت تھی کہ عین اس زمانے میں جب پاکستان کا ریزولیوشن پاس ہوا ہے، وہ اسلامیہ کالج کے طلباء کو یہ تاکید کر رہے تھے کہ

زندگی میں تمہارا نصب العین کچھ ہی ہو لیکن یاد رکھو تم کسی ایسی اسکیم کی تائید نہ کرنا جس کا منشاء ہندوستان کو تقسیم کر کے مسلمانوں کے لئے الگ خطّہ منتخب کرنا ہو۔ یہ اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہوگا۔

ان کے دستِ راست سر چھوٹو رام نے کہا کہ

سر سکندر کسی خالص اسلامی حکومت میں وزیرِ اعظم تو ایک طرف، کوئی ذمّہ داری کا عہدہ لینے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ پنجاب میں صرف پنجابیوں کی حکومت ہوگا۔

دوسری طرف سے مولوی فضل الحق صاحب بولے کہ

ہم سے پوچھا جاتا ہے کہ تم نے جناح کی مدد کیوں نہیں کی۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ ہم نے کبھی ایسے شخص کو لیڈر نہیں مانا جو غیر بنگالی ہو۔

جناح، اپنوں اور بیگانوں کی ان بھانت بھانت کی بولیوں کو سنتا تھا اور دل کے پورے سکون اور اطمینان سے اپنے مخصوص تبسم کے ساتھ کہتا تھا کہ

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مجھے کیا غم کہ میری آستیں میں ہے ید بیضا

چنانچہ ان تمام اعتراضات اور ہفوات کے جواب میں انہوں نے، یکم مارچ ۱۹۴۱ء کو مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے لاہور کے سیشن میں اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا۔

لاہور کے پلیٹ فارم ہی سے مسلم لیگ نے پاکستان کا مطالبہ پیش کیا اور آج میں اسی پلیٹ فارم سے اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان ایک ایسی منزل ہے جس تک پہنچنے سے مسلمانوں کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ ہندوستان کے برِاعظم میں پاکستان کے علاوہ اور کوئی دستور کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پاکستان بن کر رہے گا۔ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ بن چکا ہے۔

اللہ اکبر! کس قدر یقین محکم تھا اس آہنی عزم والے انسان کو اپنے مطالبہ کی صداقت پر۔ اسی یقین محکم اور عزمِ راسخ کا نتیجہ تھا کہ آہستہ آہستہ شدید ترین مخالفین نے بھی اس مطالبہ کی تائید کرنی شروع کر دی۔ (مثلاً مسٹر این۔ سی دت (جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رکن تھے انہوں نے فروری ۱۹۴۰ء میں اپنی ایک کھلی چٹھی میں (جو اخبار مدینہ بجنور کی یکم فروری کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی) لکھا۔

اعترافِ حقیقت

ان حالات میں میرا خیال ہے کہ ہندو مسلم تصفیہ کا حل یہی ہو گا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کو دو قومیں سمجھ لیا جائے اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے متعلق ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا جائے۔ مسٹر جناح نے حال ہی میں گاندھی جی کو جواب دیتے ہوئے متحدہ قومیت کے تصور کو سراب کے لفظ سے تعبیر کر کے اس خیال کا اظہار کیا ہے وہ میرے خیال میں اب نہیں تو کل حقیقت بن کر رہے گا۔ بہر حال، اگر یہ چیز بھی جلد طے ہو جائے تو کچھ برا نہیں۔ اگر ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں میں بحیثیت فرقہ کے نہیں، بلکہ بحیثیت دو قوموں کے سمجھوتہ ہو جائے اور مسلم اکثریت کے علاقوں میں ہندو اکثریت کے علاقے مداخلت نہ کریں اور ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمان مداخلت نہ کریں، تب بھی ہندوستان کا اجتماعی مفاد محفوظ رہ سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں پاکستان کے خیال سے ڈرنا نہ چاہیئے، البتہ اس میں مناسب ترمیم و اصلاح کر کے اُسے اپنے حسبِ حال

بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ (مدینہ، یکم فروری ۱۹۴۰ء)

حتیٰ کہ لالہ لاجپت رائے جیسے کٹر ہندو اور نظریۂ پاکستان کے سخت ترین مخالف نے مسٹر سی۔ آر۔ داس کو ایک خط میں، جو اخبار 'مرہٹہ' کی ۲ فروری ۱۹۴۰ء کی اشاعت میں چھپا تھا، لکھا۔

ایک اور چیز جو کچھ عرصہ سے میرے لئے بے حد جنہ اضطراب ہو رہی ہے، وہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اس پر دعوتِ غور و خوض دوں گزشتہ چھ ماہ میں، میں نے اپنے وقت کا بیشتر حصہ اسلامی تاریخ اور اسلامی قوانین کے مطالعہ میں صرف کیا ہے اور اس سے جس نتیجہ پر میں پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ چیز (یعنی ہندو مسلم اتحاد) ایک امر محال اور ناقابلِ عمل شے ہے۔ وہ مسلمان راہنما جو عدم تعاون کی تحریک میں شامل ہیں، اگر ان کے خلوصِ نیّت کو تسلیم بھی کر لیا جائے پھر بھی میرے خیال میں ان کا مذہب اس چیز (ہندو مسلم اتحاد) کے راستے میں ایک زبردست رکاوٹ ثابت ہو گا۔

آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے کلکتہ میں اپنی اس گفتگو کا جو اس باب میں حکیم اجمل خاں صاحب اور ڈاکٹر کچلو سے ہوئی تھی، آپ سے تذکرہ کیا تھا، ہندوستان میں حکیم صاحب سے زیادہ سلجھا ہوا کوئی مسلمان نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا حکیم صاحب یا کوئی دوسرا مسلمان راہ نما قرآن کی تعلیم کے احکامات پر خطِ تنسیخ کھینچ سکتا ہے؟ خدا کرے کہ اسلامی قوانین کے مطالعہ کے بعد جس نتیجہ پر میں پہنچا ہوں، وہ غلط ہو۔ کیوں کہ میرے دل کی کھٹک کو دور کرنے کے لئے اس سے زیادہ عمدہ بات کوئی نہ ہو گی۔ لیکن اگر میرا خیال صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم (ہندو اور مسلمان) انگریز کے مقابلہ کے لئے متحد ہو سکتے ہیں لیکن برطانوی طرزِ حکومت کے مطابق ہندوستان میں نظامِ حکومت قائم کرنے کے لئے ایسا اتحاد ناممکن نظر آتا ہے۔ اس کا دوسرے لفظوں میں یہ مطلب ہو گا کہ ہم ہندوستان میں جمہوری طرزِ حکومت قائم نہیں کر سکتے۔ تو پھر اس کا علاج کیا ہے؟ میں ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں سے خائف نہیں ہوں۔ لیکن ہم ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں اور ان کے ساتھ افغانستان، وسط ایشیا، عرب، عراق اور ترکی کے مسلح لشکر دل کی تاب نہ لا سکیں گے۔ میں تہِ دل سے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت کا قائل ہوں۔ اس کے لئے میں مسلمان راہ نماؤں پر اعتماد کرنے کو بھی تیار ہوں۔ لیکن قرآن و حدیث کے احکام کو ہم کیا کریں گے؟ مسلمان راہنما ان پر تو خطِ تنسیخ نہیں کھینچ سکتے۔ تو پھر کیا ہماری یہ تباہی قضاء مبرم ہے؟ امیّد ہے کہ ایسا نہ ہو گا اور آپ کا ذہنِ رسا اور بصیرتِ قلب اس مشکل کا کوئی حل تجویز کر سکے گا۔"

چنانچہ اس طرح رفتہ رفتہ فضا ہموار ہوتی گئی۔ اس آہنی عزم والے انسان کے سامنے مخالفت کے پورے ہجوم کو جھکنا پڑا اور زمانے کو اپنا دھارا اس کی منشاء کے مطابق بدلنا پڑا اور ہندو انگریز اور خود مسلمان کے اس جمِ غفیر کی

پاکستان بن گیا

مخالفت کے علی الرغم ۱۹۴۷ء میں پاکستان وجود میں آگیا" کامیاب زندگی" کا جو معیار ہم نے شروع میں پیش کیا تھا، آپ اسے سامنے لائیے اور دیکھئے کہ اس زمانے میں اس مردِ مجاہد کی زندگی سے زیادہ کامیاب زندگی کسی اور کی بھی کہلا سکتی ہے؟ اس کے شعور نے جب آنکھ کھولی تو پورے ماحول کو اپنے مقصد کے خلاف پایا۔ اور جب اس نے اپنی طبعی آنکھ بند کی تو سارا ماحول اس کی منشاء کے قالب میں ڈھلا ہوا تھا۔ قابلِ صد رشک ہے ایسی زندگی اور در خورِ ہزار تبریک و تہنیت ہے ایسی موت

مرگے کہ زندگانی باُو آرزو کند!

یہ زندگی وہ ہے جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

یہ زندگی، کوہکن کی زندگی سے بھی زیادہ کامیاب ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس نے خارا شگافی ضرور کی تھی، لیکن جوئے شیر نہیں لا سکا تھا اور یہ کوہکن ہے کہ جس کی جوئے شیر، ہمارے، آپ کے اور آنے والی نسلوں تک کے لئے زندگی اور شادابی کا سرچشمہ ہے۔

لیکن (صد افسوس کہ) جو لوگ تحریکِ پاکستان کے مخالف تھے، پاکستان بن جانے کے بعد بھی، وہ اپنی آتشِ حسد و انتقام کو ٹھنڈا نہیں کر سکے۔ چنانچہ مودودی صاحب کے رسالہ ترجمان القرآن نے اگست ۱۹۴۸ء میں تحریکِ پاکستان کے ماضی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ

> اس پورے گروہ میں ایک کوہکن بھی نہ نکلا جو بازی کھو دینے کے بعد سر دے سکتا۔ ساری جماعت بازی گروں سے پٹی پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب قلابازیاں کھا کر دُنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزّت خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندے تھے۔

ٹھیک ہے، کوہ کن درحقیقت وہ تھے جو ساری عمر مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کرتے رہے اور جب پاکستان بن

خراجِ تحسین

گیا، تو سب سے پہلے یہاں آپہنچے۔ باقی رہا یہ کہ دنیا نے اس "بازی گر" کا تماشہ دیکھ کر کیا کہا تھا، اس کے متعلق زیادہ نہیں تو چند ایک کلماتِ تحسین و تبریک سُن لیجئے جو

قائدِاعظمؒ کی وفات پر بے ساختہ ان لوگوں کی زبان پر آ گئے۔ دنیا کے عظیم ترین اخبار، لندن ٹائمز نے لکھا۔

قائدِاعظم نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعوے کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیٰحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ ذہنی لچک نہیں تھی جو انگریز کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصّہ ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت، واضح اور شفّاف ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہ تھی بلکہ وہ جس نقطۂ نظر کو اپنا ہدف بناتے تھے اس پر براہِ راست نشانہ باندھ کر وار کرتے تھے۔ وہ ایک ناقابلِ تسخیر حریف تھے۔

بلبلِ ہند سروجنی نیڈو نے ان کی عظمت پر نذرِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا۔

وہ زندگی کے حقائق کو جانچنے، پرکھنے اور تسلیم کرنے میں بلا کے محتاط اور غیر جانبدار، معاملات میں سوجھ بوجھ اور سلامت روی کے مظہر، مگر حقیقی مقصد کے لئے ناقابلِ شکست چٹان تھے۔

امریکہ کے سابق صدر، مسٹر ٹرومین نے کہا۔

دولتِ پاکستان کا معمار، دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کا بانی۔ مجھے یقین ہے کہ مسٹر جناح کی غیر معمولی قیادت کی یاد حکومتِ پاکستان اور اس کے عوام کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔

اور اُس وقت کے مملکتِ ایران کے سفیر آقائے علی اصغر حکمت نے خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا۔

ایسے عظیم الشّان انسان آسمان کے ان ستاروں کی طرح ہیں جن کی روشنی ہم تک بعید از قیاس فاصلے طے کر کے پہنچتی ہے اور اگرچہ وہ انسانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں، لیکن ان کے نور سے ہمیشہ کسبِ فیض کیا جا سکتا ہے۔ قائدِاعظمؒ کی شخصیت آئندہ نسلوں کے لئے مینارۂ نور کا کام دے گی۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! وہ زندگی جس کی کامیابی کی شہادت دنیا اس طرح دے رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ افراد آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ واقعات رونما ہوتے ہیں اور مٹ جاتے ہیں۔ وقت کے دریا کا جو پانی آگے چلا جاتا ہے، وہ واپس نہیں آتا۔ یہ سب آنی اور فانی ہوتے ہیں۔

اوّل و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نَو، منزلِ آخر فنا

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

پاکستان، اسی مردِ خدا کے عملِ عشق کا وہ نقش۔ ہے جس میں رنگِ ثباتِ دوام جھلمل جھلمل کر رہا ہے یہ حقیقت ہے کہ

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

اور اسی کو کہتے ہیں برادرانِ عزیز! — **کامیاب زندگی!**

ایک چراغ اور لاکھ اندھیرے

(بتقریب یومِ پیدائش قائدِاعظمؒ۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۶۶ء بعد دوپہر، بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کے زیرِاہتمام وائی۔ ایم۔ سی۔ اے۔ ہال لاہور میں جلسۂ عام منعقد ہوا جس میں پرویز صاحب نے عنوانِ بالا پر سامعین سے خطاب کیا۔ تقریر ٹیپ پر ریکارڈ کر لی گئی تھی۔ اس کے بعد اسے ٹیپ سے از سرِنو مرتّب کر کے شائع کیا گیا۔)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

صدرِ محترم، میری عزیز بہنو اور بھائیو! سلام و رحمت۔

قرآن نے ایک جگہ کہا ہے کہ عَسٰٓی اَنۡ تَکۡرَهُوۡا شَیۡئًا وَّهُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ (۲/۲۱۶) ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار گزرے لیکن اس میں تمہارے لئے خیر کے پہلو مضمر ہوں۔ قرآن کریم نے یہ بات جنگ کے سلسلہ میں کہی تھی اور یہ عجب اتّفاق ہے کہ اس کی محسوس تفسیر بھی ہمارے سامنے حالیہ جنگ[1] کے وقت آئی۔ ہماری نئی نسل کے جو بچّے تقسیم کے بعد پیدا ہوئے یا جن کے شعور نے پاکستان میں آکر آنکھ کھولی، وہ بار بار اعتراض کیا کرتے تھے کہ مسلمانوں نے پاکستان کیوں بنا لیا۔ یہ ہندوستان سے الگ کیوں ہو گئے۔ وہ اتنا وسیع و عریض ملک تھا، اُس کے

---

[1] ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ۔

وسائل کثیر تھے۔ دنیا کے بڑے بڑے ممالک اس ملک کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھنے پر مجبور تھے۔ اگر ہم ان کے ساتھ رہتے تو ہمیں یہ آئے دن کی مصیبتیں کیوں بھگتنی پڑتیں، یہ تکلیفیں کیوں اٹھانی پڑتیں، یہ دشواریاں کیوں پیش آتیں۔

نوجوانوں کے اعتراضات

ہم نے ان سے الگ ہو کر خواہ مخواہ اپنے لئے پریشانیاں پیدا کر لیں، مفت میں ایسا تکلیف دہ دردِ سر خرید لیا۔ اگر ہم ان کے ساتھ رہتے تو نہ پانیوں کا سوال پیدا ہوتا اور نہ کشمیر کا مسئلہ ہمارے لئے سوہانِ روح ہوتا وغیرہ وغیرہ۔ یہ نوجوان اکثر میرے پاس آتے، میں پہلے انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کرتا کہ آزاد مملکت کا وجود ہمارے دین کا تقاضا اور ایمان کا مطالبہ تھا۔ ہم غیروں کی محکومی میں اسلامی زندگی بسر کر ہی نہیں سکتے۔ اسلام ایک نظامِ حیات، ایک ضابطۂ زندگی ہے جو اپنے متشکل ہونے کے لئے ایک آزاد خطۂ زمین چاہتا ہے۔ یہ تھی ہمارے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد لیکن اسلام کے متعلق جو کچھ وہ مسجدوں اور وعظوں میں سنتے، حتیٰ کہ جو کچھ انہیں اسلامیات کے نام پر پڑھایا جاتا، اس کی روشنی میں میری بات ان کی سمجھ میں نہ آتی ـــــ یہ بات ہمارے ہاں کے بڑے بڑے بزرجمہروں کی سمجھ میں نہیں آتی، ان بچوں کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کا کیا گلہ؟ گلہ تو اس بات کا ہے کہ انہیں پاکستان میں بھی صحیح اسلام سے روشناس نہیں کرایا گیا۔ اگر ان کی تعلیم کی عمارت صحیح بنیادوں پر اٹھتی تو پھر یہ سمجھ سکتے کہ دین اور مذہب میں کیا فرق ہوتا ہے۔ مذہب ہر فضا میں پنپ سکتا ہے، بلکہ محکومی اور بیچارگی میں وہ اور گہرا اور شدید ہو جاتا ہے اور دین آزاد مملکت کے علاوہ اور کہیں سانس نہیں لے سکتا۔

یہاں سے نیچے اتر کر جب ان نوجوانوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی جائے کہ ہندو ایسی قوم ہے ہی نہیں جس کے ساتھ کوئی شریف آدمی زندگی بسر کر سکے تو یہ بات پھر ان کی سمجھ میں نہ آتی۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے ہندو کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ ان کا اس کے ساتھ کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ ہمارے یہ نوجوان کہتے تھے کہ دنیا میں اور

ہندو کیا ہے؟

ملک بھی ہیں جن میں مختلف مذاہب اور مختلف نسلوں کے لوگ ایک جگہ آرام سے رہتے سہتے ہیں۔ ہم ہندوؤں کے ساتھ اس طرح کیوں نہیں رہ سکتے تھے۔ اس جنگ میں ہندو جو بے نقاب ہو کر سامنے آیا تو ہمارے ان نوجوانوں نے پہلی مرتبہ اسے اس کے اصلی خدوخال میں دیکھا اور اس کے بعد خود بخود بغیر کچھ سمجھے سمجھانے کے پکار اٹھے کہ آپ سچ کہتے تھے۔ اس قسم کے انسانوں کے ساتھ کوئی شریف آدمی نہیں رہ سکتا۔ غالبؔ نے ایک جگہ کہا ہے۔

فغانِ من دلِ خلق آب کرد ورنہ ہنوز
نگفتہ ام کہ مرا کار با فلاں افتاد

حقیقت یہ ہے کہ قائدِاعظمؒ کی صحیح عظمت بھی اسی وقت سامنے آتی ہے جب یہ معلوم ہو جائے کہ ان کا واسطہ کس قسم کے لوگوں سے پڑا تھا اور کس کس ذہنیت کے دشمنوں سے جنگ کر کے انہوں نے پاکستان حاصل کیا تھا۔ ان مخالفوں میں ایک طرف ہندو تھا جو اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام مسلمانوں کو اپنا محکوم رکھ کر لینا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ دوسری طرف انگریز تھا جس کے سینے میں صلیبی جنگوں کے زخم ابھی تک مندمل نہیں ہوئے یا یوں کہیئے کہ اس نے انہیں ابھی مندمل نہیں ہونے دیا اور وہ اس موقع کی تلاش میں رہتا ہے کہ مسلمانوں کو کس طرح نقصان پہنچایا جائے۔ ان دونوں مخالفوں کا متحدہ محاذ بھی کچھ کم جرأت آزما اور حوصلہ فرسا نہ تھا جو ان کے ساتھ، خود مسلمانوں کی کئی ایک جماعتیں بھی "شریکِ جہاد" ہو گئیں ـــ نیشنلسٹ مسلمان، جمیعت العلماء، مجلسِ احرار، سرخ پوش، انصار، جماعتِ اسلامی، سب تحریکِ پاکستان کے مخالفوں کی صفوں میں شامل تھے اور ان سب کا مقابلہ، اسلام کا یہ سپاہی (قائدِاعظم) تنہا کر رہا تھا۔

حالیہ جنگ کی علت

ہندوستان اور پاکستان میں جو حالیہ جنگ ہوئی ہے، اس کی علت مسئلہ کشمیر کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس مسئلہ کو ہندوستان اور پاکستان کی نزاع میں بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن یہ بھی علاماتِ مرض میں سے ایک علامت ہی ہے، علتِ مرض کچھ اور ہے۔ قرآنِ کریم نے اسلام کے دشمنوں کے متعلق کہا ہے قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ (۳/۱۱۷)۔ اسلام دشمنی کی کچھ باتیں بعض اوقات ان کی زبان سے (بے اختیار) نکل جاتی ہیں ورنہ جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا ہے، وہ ان سے کہیں زیادہ شدید ہے۔ اسی قسم کی ایک بات اگلے دنوں، ہندوستان کے وزیرِ دفاع مسٹر چوہان کی زبان سے بھی بے اختیار نکل گئی۔ اسے غور سے سنیئے۔ انہوں نے ایک بیان میں کہا کہ

> پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اسی دن سے مخاصمت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جس دن پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان آئیڈیالوجی کا اختلاف ہے۔ اس کے سوا کوئی اختلاف نہیں۔ اور یہ اختلاف اور دشمنی بہتے پانی کی طرح نہیں، بلکہ سالہا سال تک رہے گی۔ بھارت کو اس لئے ایک تازہ اور فیصلہ کن جنگ کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

اس سلسلہ میں مسٹر مہاجن نے اگلے دنوں اس حقیقت کا انکشاف کیا تھا کہ دسمبر ۱۹۴۷ء میں بھارت کے نیتاؤں (سربراہوں)

کی ایک خفیہ مجلس میں یہ تجویز زیر غور آئی تھی کہ پاکستان پر فوراً حملہ کر دیا جائے مسٹر مہاجن کو افسوس تھا کہ اس تجویز پر اس وقت عمل نہ کیا گیا اور پاکستان کو موقع دے دیا گیا کہ وہ اپنی مدافعت کی تیاریاں کر لے، ورنہ معاملہ اسی وقت صاف ہو جاتا۔

یہ تھے برادران عزیز! ان قوموں کے عزائم اور یہ ہے اس جنگ کی بنیادی وجہ۔ یعنی یہ کوئی ہنگامی اختلاف اور عارضی نزاع نہیں۔ یہ وہی کفر و اسلام کی نزاع ہے جو پہلے دن سے چلی آرہی ہے۔ یہ وہی حق و باطل کی کشمکش ہے جو "ازل سے تا امروز" مسلسل جاری ہے اور جاری رہے گی۔

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی، نہ حریف پنجہ فگن نئے
وہی فطرت اسد اللّٰہی، وہی مرحبی وہی عنتری

ہندی جمہوریت

انگریز ہندوستان سے جا رہا تھا۔ ہندو کا مطالبہ یہ تھا کہ ملک کا اقتدار "اہل ملک" کے سپرد کر دیا جائے تاکہ وہ یہاں جمہوری انداز کی حکومت قائم کر سکیں۔ سطحی طور پر آپ دیکھیں گے تو یہ مطالبہ بڑا معقول اور یہ روش بڑی انصاف پسندانہ نظر آئے گی لیکن اگر آپ سطح سے ذرا نیچے اتر کر دیکھیں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ جمہوریت کے اس معصوم سے جال میں کس قدر "مسلم شکار" کڑیاں پیوست تھیں۔ دنیا میں جہاں جہاں نظام جمہوریت رائج ہے، وہاں بالعموم کیفیت یہ ہے کہ سارے ملک میں ایک قوم بستی ہے اس قوم میں مختلف سیاسی پارٹیاں ہوتی ہیں۔ الیکشن میں ایک پارٹی اکثریت حاصل کر لیتی ہے اور زمام اقتدار اس کے ہاتھ آجاتی ہے۔ جو پارٹی اقلیت میں رہ جاتی ہے، وہ کوشش کرتی ہے کہ مخالف پارٹی کے کچھ ممبروں کو توڑ کر اپنے ساتھ ملا لے اور یوں اپنی اقلیت کو اکثریت میں بدل کر اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اگر وہ اس طرح کامیاب نہ ہو تو وہ آئندہ الیکشن تک کا انتظار کرتی ہے تاکہ اس وقت اکثریت حاصل کر لے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس انداز کی حکومت میں کوئی پارٹی مستقل طور پر برسر اقتدار اور دوسری پارٹی ابدی طور پر محکوم نہیں رہتی۔ اس میں ادل بدل اور اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں صورت حالات اس سے یکسر مختلف تھی۔ اس میں ہندو اکثریت میں تھے اور مسلمان اقلیت میں اور ان کی اقلیت کبھی اکثریت میں تبدیل نہیں ہو سکتی تھی (تاوقتیکہ یہ وہاں کے دس پندرہ کروڑ ہندوؤں کو مسلمان نہ کر لیں، جو ناممکن تھا)۔ لہٰذا ہندوستان کی جمہوری حکومت بحقیقت ہندوؤں کی مستقل حکومت اور مسلمانوں کی ابدی محکومی کے مترادف تھی۔ اس سلسلہ میں ہندوؤں کے عزائم کیا تھے، اس کا انکشاف قائداعظمؒ نے آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۴۲ء میں) ان الفاظ میں فرمایا تھا۔

ساورکر (صدر مہا سبھا) کی اسکیم یہ ہے کہ جب (انگریز کے چلے جانے کے بعد) میدانی، بحری اور فضائی فوج اور نظم و نسق میں ہندوؤں کو ۵۰ فیصد حصّہ مل جائے گا، تو پھر ہندو راج قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ان مسلمانوں کا کیا حشر ہو گا جو شمال مغرب اور شمال مشرق میں بستے ہیں۔ سنیئے وہ (مسٹر ساورکر) کہتے ہیں کہ سرحدوں پر ہندو فوج اس طرح بٹھا دی جائے گی جس طرح اب برطانوی فوج متعیّن ہے اور یہ فوج اس کا خیال رکھے گی کہ مسلمان سر نہ اٹھا سکیں۔

آپ نے اندازہ لگایا ـــــ عزیزانِ من! کہ جمہوری اندازِ حکومت کے ماتحت، ہندوؤں کے عزائم کیا تھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہندوؤں کی متشدّد مذہبی جماعت تھی۔ ان کا نیشنلسٹ طبقہ جو کانگریس سے متعلّق تھا، وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ ان کے پیشِ نظر سیکولر اسٹیٹ کا تصوّر تھا جس میں کسی خاص گروہ کے مذہبی تصوّرات کا دوسرے گروہ پر اثر نہیں پڑ سکتا۔ لیکن ایسا کہنے والوں کو اس کا علم نہیں کہ وہاں خود کانگریس کے کیا عزائم تھے۔

کانگریس کے عزائم

اگست ۱۹۳۹ء کا ذکر ہے، کانگریس کے جنرل سیکرٹری اچاریہ کرپلانی نے ایک طویل بیان شائع کیا تھا جس میں اس امر کی وضاحت کی گئی تھی کہ کانگریس کے سامنے صرف ملک کے سیاسی مقاصد نہیں، وہ ملک کی معاشرتی زندگی کو گاندھی جی کے فلسفۂ حیات کے مطابق، از سرِ نو متشکّل کرنا چاہتی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے لکھا تھا۔

> گاندھی جی نے کانگریس کو بتایا کہ ہمارا کام صرف یہ نہیں کہ ملک کی سیاسی باگ ڈور انگریز کے ہاتھ سے چھین کر اہلِ ملک کے ہاتھ میں دیدیں۔ بلکہ سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اپنی تمام جدوجہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفۂ حیات پر رکھیں جس کے دائرے میں ہماری معاشرت، اخلاق اور روحانیت سب کچھ داخل ہو۔ بالفاظِ دیگر، ہماری تحریک کو صرف سیاسی نہیں ہونا چاہئیے بلکہ اسے روحانی اور اعلیٰ فلسفۂ زندگی کے ماتحت ہونا چاہئیے تاکہ اس جدوجہد سے نہ صرف ہماری سیاسی زندگی متاثر ہو بلکہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ اس سے اثر پذیر ہو اور ہماری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو جسے ہم تاریخ کا نیا دور کہہ سکیں۔ زندگی کا یہی وہ نیا باب اور نیا دَور ہے جسے گاندھی جی کانگریس کے ذریعے ہندوستان میں لانا چاہتے تھے۔

یہ تھے برادرانِ عزیز! اس کانگریس کے عزائم جسے یکسر سیکولر باڈی سمجھا جاتا ہے ـــــ یہ گاندھی جی، جن کے فلسفۂ حیات کو ملک کی نئی معاشرتی زندگی کا سنگِ بنیاد بنانا مقصود تھا، خود کیا تھے، اس کے متعلّق انہی کی زبان سے سنیئے۔ انہوں نے اپنے اخبار "ینگ انڈیا" کی ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۱ء کی اشاعت میں لکھا تھا۔

میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں، کیونکہ میں ویدوں، اُپ نشدوں، پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں، اوتاروں کا قائل ہوں اور تناسخ پر عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں گئو رکشا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہوں اور بت پرستی سے انکار نہیں کرتا۔ میرے جسم کا رواں رواں ہندو ہے۔

منافقت

جنگ کے دوران، آپ نے ہندوستان کے وزیرِ اعظم مسٹر شاستری کی قلابازیوں کا تماشا دیکھا ہوگا۔ (یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے) — جو کچھ صبح کے وقت کہا اس کی تردید دوپہر کو کر دی۔ جو کچھ دوپہر کو کہا، اس سے شام کو مُکر گئے۔ الفاظ ہمیشہ ذومعنی استعمال کئے۔ آج ان کا مطلب کچھ لیا، کل کچھ اور — دھوکا، فریب، غلط بیانیاں، یہ ان کا معمول ہے۔ جو کچھ خود کیا یا کرنا چاہا، پہلے اس کا الزام پاکستان کے سر دھر دیا۔ جانا کسی اور طرف کو ہوا، رُخ کسی اور طرف کا کیا — بتایا کچھ اور، کیا کچھ اور — یہ ہے ان کی سیاست لیکن یہ روش مسٹر شاستری کی طبع زاد نہیں۔ اسے بھی انہوں نے اپنے بزرگوں سے ورثہ میں پایا ہے۔ "مہاتما" گاندھی بھی یہی کچھ کیا کرتے تھے۔ ان کے متعلق قائدِ اعظمؒ نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن، جالندھر کے اجلاس ۱۹۴۲ء میں کہا تھا

ان کا (گاندھی جی کا) مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں اور جو ان کا مقصد ہوتا ہے وہ کہتے نہیں۔

اسی طرح انہوں نے اگست ۱۹۴۵ء میں ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہمیں جس حریف سے پالا پڑا ہے وہ گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔

جب ان کے (مسٹر گاندھی کے) مفیدِ مطلب ہوتا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ کسی کے نمائندہ نہیں۔ وہ محض انفرادی حیثیت سے گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ کانگریس کے چار آنہ کے ممبر بھی نہیں رہتے اور جب ضرورت ہوتی ہے تو سارے ہندوستان کے واحد نمائندہ بن جاتے ہیں جب اور حربوں سے کام نہیں چلتا، تو مرن برت رکھ لیتے ہیں۔ جب کوئی دلیل پاس نہیں رہتی تو "اندرونی آواز" کو بلا لیتے ہیں۔ کہیئے کہ ایسے شخص سے ہم کس طرح بات کر سکتے ہیں؟ وہ تو ایک چیستان ہیں، ایک معمہ ہیں۔

ان کی دورُخی کا عالم یہ تھا کہ جنگِ عظیم کے دوران جب انگلستان پر دن رات بمباری ہو رہی تھی اور جاپانی کلکتہ تک بڑھ آئے تھے، وہ وائسرائے کے ہاں گئے اور کہا کہ جب میں لنڈن پر بمباری کی خبریں پڑھتا ہوں اور وہاں کے جوانوں، بوڑھوں، بچّوں، عورتوں پر جو کچھ گذرتی ہے، اسے سنتا ہوں، تو میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی۔ ایسے نازک حالات میں، میں انگریزوں کے لئے ہندوستان میں کسی پریشانی کا موجب نہیں بننا چاہتا۔ میں

تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر جنگ کے سلسلہ میں، بلا مشروط تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔ یہ کہتے کہتے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وائسرائے بہت متاثر ہوئے۔ ان کی ہمدردی اور تعاون کا شکریہ ادا کیا۔

گاندھی جی نے ادھر یہ کیا اور اُدھر کانگریس کی مجلس عاملہ سے ریزولیوشن پاس کرا دیا کہ اگر حکومت ملک کے اختیارات، کانگریس کی طرف منتقل کرنے کا وعدہ نہیں کرتی تو ہم ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دیں گے، یہاں کے نظم و نسق کو تہ و بالا کر دیں گے۔ انگریزوں کو یہاں سے نکال کر دم لیں گے۔

اور جب وائسرائے نے گاندھی جی سے پوچھا کہ یہ کیا؟ تو انہوں نے نہایت معصومانہ انداز میں کہہ دیا کہ میرا کانگریس پر کیا بس ہے۔ میں تو کانگریس کا چار آنہ کا ممبر بھی نہیں ہوں۔

آپ سوچیئے، برادرانِ عزیز! کہ جس قوم کے "مہاتما" کا یہ عالم ہو، اس کے "مسٹروں" کی کیا کیفیت ہو گی؟ اس سلسلہ میں مجھے حال ہی کی ایک دلچسپ بات یاد آ گئی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جوڑیاں کے معرکہ کے ضمن میں، آل انڈیا ریڈیو نے یہ خبر نشر کی تھی کہ پاکستانی بمباروں نے صبح کے آٹھ بجے جوڑیاں کی مسجد پر بم گرائے

جوڑیاں کی مسجد

اور پچاس نمازیوں کو شہید کر دیا اور اس کے بعد واویلا مچایا تھا کہ ان لوگوں کو دیکھو یہ اپنی پرستش گاہوں کو بھی تباہ کرنے سے باز نہیں آتے۔ اوّل تو آپ دیکھئے کہ صبح کے آٹھ بجے کون سی نماز ہوتی ہے جس میں پچاس نمازی شہید ہو گئے! پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ میں جوڑیاں کی مسجد میں گیا ہوں۔ وہ اتنی چھوٹی ہے کہ اس میں پچاس آدمی بیک وقت بمشکل کھڑے ہو سکتے ہیں۔ وہاں ہمیں بتایا گیا کہ جب جوڑیاں پر پاکستانیوں نے قبضہ کیا ہے تو یہ مسجد نہایت خستہ اور خراب حالت میں تھی اور اس میں ایک موچی بیٹھتا تھا۔ اسے مسجد کی شکل دوبارہ ہماری فوج کے سپاہیوں نے دی ہے۔

اور آگے بڑھیئے۔ اس مسجد پر (افسانوی) بمباری کی خبر نشر کر کے، بھارتیوں نے یہ تاثر بھی پیدا کرنا چاہا کہ انہیں دوسرے مذاہب کی پرستش گاہوں کا بڑا احترام ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت، ہندوستان میں مسلمانوں کی مساجد کی حالت کیا ہے۔ یہ میرے سامنے ہندوستان کے اخبار مدینہ کے

ہندوستان کی مساجد

۲۸ جولائی ۱۹۶۵ء کا پرچہ ہے۔ اس میں لدھیانہ سے شائع ہونے والے (ہندی) کے ایک اخبار "ترجمان" کے حوالے سے ایک دلچسپ خبر درج ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ ایک مسجد پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ اس کے ایک کمرے پر ایک سکھ نے قبضہ جما لیا۔ ہندوؤں نے اسے بے دخل کرنا چاہا تو اس نے (مسلم اوقاف بورڈ سے کہہ کر) ہندوؤں کے خلاف مقدمہ دائر کرا دیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار "ترجمان" نے کہا ہے

کہ اس سکھ سردار کو ایسا کرتے وقت ذرا خیال نہ آیا، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ

اس شہر کی ۱۱۷ پرانی مسجدوں میں سے ۱۰ میں گوردوارے قائم ہیں اور صرف ۱۵، ۱۶ میں مندر، باقیوں میں رہائش ہے۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! ہندوستان کی سیکولر اسٹیٹ میں مسلمانوں کی مساجد کی حالت — اُس سیکولر اسٹیٹ میں، جس کے نمائندوں کو جوڑیاں کی مسجد کی "تباہی" سے اس قدر صدمہ ہوا ہے۔

برطانیہ اور پاکستان

یہ تو ہندو تھا — اب اس محاذ کے دوسرے فریق "انگریز" کو لیجئے تحریکِ پاکستان کے دوران ہندوؤں نے بڑی شد و مد سے پراپیگنڈہ کر رکھا تھا کہ تقسیمِ ہند کی اسکیم انگریز کی پیدا کردہ ہے اور جناح، انگریز کے اشارے پر تشکیلِ پاکستان کی تحریک چلا رہا ہے — ہندو تو ایک طرف، خود پاکستان میں ابھی تک ایسے لوگ موجود ہیں جو اس خیال کو عام کرنے میں مصروف رہتے ہیں کہ پاکستان کا تصور برطانیہ کی پیدا کردہ سازش تھی — اور قائدِ اعظمؒ انگریز کا آلۂ کار تھا۔

لیکن سنیئے! کہ تحریکِ پاکستان کے دوران انگریز، مسلمانوں کے خلاف کیا کچھ کر رہا تھا اور اس محاذ میں ہندو اور انگریز دونوں کس طرح مسلمانوں کے خلاف شانہ بہ شانہ لڑ رہے تھے۔ انگریز مسلمانوں کے خلاف کیا کچھ کرنا چاہتا تھا، اس کے متعلق قائدِ اعظمؒ نے (سندھ مسلم لیگ کی سالانہ کانفرنس میں) اکتوبر ۱۹۳۸ء میں کہا تھا کہ

برطانیہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھیڑیوں کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ برطانیہ سے وہی بازی لے جاسکتا ہے جس میں توّت ہو، لیکن ہم ہندو اور برطانیہ دونوں سے لڑیں گے۔

پھر انہوں نے فروری ۱۹۴۰ء میں لیگ کونسل کے اجلاس میں کہا تھا۔

برطانیۂ عظمٰی ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ مسٹر گاندھی اور کانگریس، مسلمانوں پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم نہ برطانیہ کو مسلمانوں پر حکومت کرنے دیں گے نہ ہندو کو، ہم آزاد رہنا چاہتے ہیں۔

مارچ ۱۹۳۹ء میں مرکزی اسمبلی میں ایک ایسا بل پیش ہوا، جس سے مسلمانوں کے حقوق کی سخت پامالی ہوتی تھی۔ اس بل پر تقریر کرتے ہوئے قائدِ اعظمؒ نے کہا۔

میں، انگریز اور ہندو، دونوں کو متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ تم الگ الگ یا دونوں متفق ہو کر بھی، ہماری روح کو فنا کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکو گے نہ تم اس تہذیب کو مٹا سکو گے جو ہمیں ورثہ میں ملی ہے۔ ہمارا

نورِ ایمان زندہ ہے، زندہ رہا ہے اور زندہ رہے گا۔ تم ہم پر ظلم و ستم کرو، ہمارے ساتھ بدترین سلوک کرو،
ہم ایک فیصلہ پر پہنچ چکے ہیں اور ہم نے یہ عزم کر لیا ہے کہ ہم لڑتے لڑتے مر جائینگے۔

انہوں نے ۱۹۴۳ء میں یوم پاکستان کی تقریب پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

اگر ہندو قیادت یا برطانوی قیادت الگ الگ یا دونوں متحد ہو کر ہمارے خلاف فریب کاریوں اور سازشوں پر اُتر آئیں،
تو ہم اس کی مدافعت کریں گے، تاآنکہ ہم ایک ایک کر کے مٹ کر مر جائیں۔

انہوں نے ۱۹۴۵ء میں پشاور کے ایک جلسۂ عام میں فرمایا۔

ہمارا کوئی دوست نہیں۔ ہمیں نہ انگریز پر بھروسا ہے نہ ہندو پر۔ ہم دونوں کے خلاف جنگ جاری رکھیں
گے خواہ وہ آپس میں متحد بھی کیوں نہ ہو جائیں۔

متحدہ سازش

اس زمانے میں چین میں جنرل چیانگ کائی شک برسرِ اقتدار تھے جن کے پنڈت جواہر لال نہرو سے بڑے گہرے مراسم تھے اور دوسری طرف ان کا امریکہ پر بھی بڑا اثر تھا۔ ان سب کی تجویز یہ تھی کہ ہندوستان کے مسئلہ کو کسی طرح اقوامِ متحدہ میں لے جایا جائے۔ اس پر قائدِ اعظمؒ نے نومبر ۱۹۴۱ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

چین اور امریکہ کی متحدہ قوت بھی ہم پر کوئی ایسا دستور مسلط نہیں کر سکتی جس میں مسلمانوں کو قربان کر دیا گیا ہو۔ اگر
اقوامِ متحدہ کسی ایسی مجنونانہ حرکت کا ارتکاب کر بیٹھی تو اسے معلوم ہو جانا چاہیئے کہ اپنی حفاظت کے لئے ایک
چیونٹی بھی پلٹ کر حملہ کر دیا کرتی ہے۔ ان غیر ملکی سنگینوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جن کے سائے میں کانگریسی
راج رچایا جا رہا ہوگا، ہم ملک کے سارے نظام میں زلزلہ ڈال دیں گے اور اسے معطل کر کے رکھ دیں گے۔

کیبنٹ مشن

۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن ہندوستان آیا۔ حکومتِ برطانیہ نے اعلان کیا کہ جو پارٹی اس مشن کی تجاویز کو قبول کرلے گی اُسے تشکیلِ حکومت کا موقع دیا جائے گا۔ کانگریس نے اس مشن کی تجاویز کو نہ قبول کیا نہ مسترد، لیکن مسلم لیگ نے انہیں قبول کر لیا۔ اور آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ حکومتِ برطانیہ اپنے وعدے سے صاف مکر گئی اور لیگ کو تشکیلِ حکومت کا موقع نہ دیا۔ اس پر قائدِ اعظمؒ نے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس لکھنؤ میں کہا:۔

ہم بحث و تمحیص کرتے تھک گئے ہیں۔ کسی سے مدد مانگنا بے سود ہے۔ دنیا میں کوئی بھی عدالت نہیں جس
سے ہم داد خواہی کر سکیں۔ ہماری آخری عدالت ملّتِ اسلامیہ ہے اور ہم اسی کے فیصلے کی پابندی کریں گے۔

پھر انہوں نے جولائی ۱۹۴۶ء میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

ہم جانتے ہیں کہ برطانیہ کے پاس مشین گنیں ہیں۔ وہ اپنی طاقت کو جس طرح چاہیں استعمال کریں۔ دنیا کی کوئی عدالت نہیں جس کے پاس ہم اس کے خلاف اپیل کر سکیں گے۔ دوسری پارٹی کانگریس ہے۔ وہ پوری طرح دوسری قسم کے ہتھیاروں کو استعمال کرے گی۔ اس لئے اب ہم اپنے حفظ و بقا کے لئے آئینی طریقوں کو خدا حافظ کہنے پر مجبور ہیں اور اب ہم نے طے کر لیا ہے کہ براہِ راست اقدام کی تیاریاں اور عمل ہماری پالیسی اور پروگرام کا جزو ہوگا۔

اور اگست ۱۹۴۶ء میں بتقریبِ عید، قوم سے کہا کہ

مسلم ہندوستان کو برطانیہ کی بدعہدیوں اور وعدہ خلافیوں نے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ ہم نے اگست ۱۹۴۰ء کے اعلان کے مطابق اُن سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ جب تک ہندوستان کی بڑی سیاسی جماعتوں اور قومی زندگی کے دوسرے اہم عناصر میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو جائے حکومت کے اختیارات کسی ایک پارٹی کے نام منتقل نہیں کئے جائیں گے۔ اس اعلان میں یہ بھی تحریر ہے کہ جب تک ہندو مسلم سمجھوتہ نہ ہوگا، ہندوستان کے لئے کوئی نیا آئین متشکل نہیں ہوگا۔ لیکن آج حکومتِ برطانیہ نے اس صاف اور واضح اعلان کے پُرزے پُرزے کر دیئے ہیں۔

یہ تھا برادرانِ گرامی قدر! برطانیہ اور ہندو کا رویّہ ہمارے ساتھ اور قائدِاعظم کو ان دونوں سے برسرِ پیکار ہونا پڑا تھا۔

قتل و غارت گری

جب ہندوؤں نے دیکھا کہ وہ مسلمانوں سے آئینی بازی نہیں لے جا سکتے تو وہ ان حربوں پر اُتر آئے جو اس قسم کے دشمن کی دنایت کا آخری مظاہرہ ہوتا ہے۔ انہوں نے ان صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیّت میں تھے، فسادات برپا کرنے شروع کر دیئے اور اس طرح مسلمانوں کے جان مال، عزّت، آبرو کو تباہ کرنے لگے۔ پہلے بمبئی میں فسادات کرائے، پھر یو۔ پی میں اور آخر میں بہار میں وہ قتل و غارت گری شروع کر دی جس کی مثال ہلاکو اور چنگیز خان کی بے محابا خوں ریزیوں اور آتش فشانیوں میں بھی نہیں ملتی۔ جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں تھے، جب یہ خبریں وہاں پہنچیں تو لازمی تھا کہ اس سے ان کا خون کھول جاتا۔ وہ اس پوزیشن میں تھے کہ اپنے مظلوم بھائیوں کے خون کا بدلہ یہاں کے ہندوؤں سے لے لیں کہا جاتا ہے کہ "جنگ اور محبت میں ہر حربہ جائز ہوتا ہے"

لیکن یہ کچھ ان کے ہاں جائز ہوتا ہے جنکے سامنے زندگی کی کوئی مستقل اقدار نہیں ہوتیں۔ قائدِاعظم کی ساری جنگ اپنی مستقل اقدار کے تحفظ اور استحکام کے لئے تھی۔ ان کے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اس دعویٰ پر تھی کہ ہم ایک ایسا خطّۂ زمین چاہتے ہیں جس میں ہم اپنی ان

اقدار کو فروغ دے سکیں اور ان کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ اس لئے وہ کب روا رکھ سکتے تھے کہ بہار کے مسلمانوں کے قتلِ عام کا انتقام پنجاب کے ہندوؤں سے لیا جائے۔ انہوں نے ۱۱ر نومبر ۱۹۴۶ء کو اپنی قوم کے نام ایک ضبط انگیز اپیل شائع کی جس میں کہا کہ

> میں خدائے عظیم سے دعا کرتا ہوں کہ مسلمان کے دامن پر وہ بدنما داغ نہ لگے جس کا مظاہرہ مظلوم مسلمانوں پر انسانیت سوز مظالم کر کے بہار میں کیا گیا ہے۔ ہمیں تہذیب و شرافت کو کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ مسلمانوں پر جو ظلم ہو رہے ہیں، ان سے ہمارا کلیجہ چھلنی ہو رہا ہے۔ لیکن ہم مسلم اکثریت والے صوبوں میں بے گناہوں کو مار کر اپنا دل ٹھنڈا نہیں کریں گے۔ میں مسلمانوں سے بزور اپیل کروں گا کہ وہ جہاں بھی اکثریت میں ہوں غیر مسلموں کی حفاظتِ جان اور مال کے لئے جو کچھ بھی ممکن ہو کریں۔ اقلیت والے صوبوں میں مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے ہیں، جو بے گناہ مسلمان شہید کئے گئے ہیں یا زخمی ہوئے ہیں یا مال اسباب لوٹا گیا ہے، ان کی قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔ وہ سمجھ لیں کہ انہوں نے جنگِ پاکستان اور آزادی کے لئے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔

یہ تھی بلادران عزیز! قائدِاعظمؒ کی وہ عظمتِ کردار، جس کی قوت سے انہوں نے اس عظیم جنگ کو جیتا تھا۔

اس محاذ میں تیسرا فریق مخالف، خود مسلمانوں کے وہ گروہ تھے جو تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں ہندوؤں سے بھی چار قدم آگے تھے ــــ نیشنلسٹ علماء، جمعیت العلماء (مولانا آزاد، مولانا مدنی، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید وغیرہ)، احرار، مسلم مجلس، انصار، سرخپوش، جماعتِ اسلامی ــــ انہوں نے اس مطالبہ کی مخالفت میں کیا کچھ کیا، اب اس کے تذکرہ سے کیا حاصل!

سفینہ جبکہ کنارے پہ آلگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیئے!

آخری سازش

ان سب کے علی الرغم، قائدِاعظمؒ نے یہ جنگ جیت لی اور ہندوستان تقسیم ہو گیا ــــ لیکن ہم منزل پر پہنچ کر ایک ایسی سازش کا شکار ہو گئے جس کے لگائے ہوئے زخم ابھی تک مندمل نہیں ہو سکے ــــ بلکہ یوں کہیئے کہ جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے، وہ سرطان (کینسر) کی طرح پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔

تقسیمِ ہند کے سلسلہ میں اصول یہ طے پایا تھا کہ جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں وہ پاکستان کا حصہ قرار پا جائیں۔ یہ اصول، انگریز اور ہندو دونوں نے تسلیم کر لیا تھا، لیکن اس کے بعد پہلے تو اس قسم کی سازشیں

شروع ہوئیں کہ سرحد جیسے علاقہ میں جہاں مسلمانوں کی آبادی نوّے فیصد سے کم نہ تھی۔۔۔ استصواب رائے کرایا گیا کہ وہ ہندوستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ، خدا خدا کر کے یہ مرحلہ طے ہوا تو یہ چال چلی گئی کہ ملک اصولی طور پر تقسیم پہلے ہو جائے اور حدود بندی بعد میں ہو اور اس حدود بندی کا فیصلہ (ARBITRATION) یعنی ثالثی کی رُو سے ہو۔ آج اتنے عرصہ کے بعد ہم نہیں کہہ سکتے کہ قائدِ اعظمؒ کے پیشِ نظر وہ کون سی مصلحتیں تھیں یا وہ کن دشواریوں میں گھرے ہوئے تھے کہ انہوں نے ایسے بنیادی مسئلہ میں انگریز کی ثالثی قبول کر لی۔ لیکن اس کا نتیجہ بہر کیف یہ ہوا کہ ہم نے جیتی ہوئی بازی ہار دی۔ گورداسپور کا ضلع مسلم اکثریت کا علاقہ تھا اور کسی کو اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ یہ ضلع ہندوستان کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔ اس ضلع کی اہمیت کا اس سے اندازہ لگائیے کہ اگر یہ پاکستان کے ساتھ ملا دیا جاتا تو کشمیر کا مسئلہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ یہی وہ ضلع ہے جس سے ہندوستان کو کشمیر کی طرف جانے کا راستہ ملا۔ صاف نظر آتا ہے کہ ہندو اور انگریز دونوں کے پیشِ نظر اس وقت کشمیر کا الحاق تھا۔ اس کے لئے کیا یہ گیا کہ اس ضلع کو ہندوستان کے ساتھ ملا دیا اور اسی سے یہ سارے مسائل پیدا ہو گئے جو مسلسل اٹھارہ سال سے ہمارے لئے وجہ سوہانِ روح بن رہے ہیں اور نہ معلوم کب تک بنتے چلے جائیں گے۔ یہ وہ آخری تحفہ ہے جو ہمیں انگریز جاتے جاتے دے گیا۔ اس فریب کاری کا ذکر قائدِ اعظمؒ نے اگست ۱۹۴۷ء میں لاہور کی ایک تقریر میں ان الفاظ میں کیا۔

> ہم جانتے ہیں کہ ہمارے ساتھ کیسی کیسی بے انصافیاں اور زیادتیاں روا رکھی گئی ہیں۔ تقسیم کا کام ختم ہو چکا ہے اور ہمارے علاقے کو جس قدر کم کیا جا سکتا تھا کر دیا گیا۔ باؤنڈری کمیشن کا فیصلہ نہ صرف غیر منصفانہ ہے بلکہ بدنیتی پر بھی مبنی ہے۔ اسے قانونی فیصلہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ سیاسی فیصلہ ہے۔ بہر حال اب فیصلہ ہو چکا ہے۔ ہم نے جو وعدے کئے ہیں انہیں ہم پورا کریں گے ہم اپنے الفاظ پر قائم ہیں۔

یہ سب سازشیں کس مقصد کے لئے کی جا رہی تھیں، اس کی غمّازی لارڈ ایٹلی (جو اُس وقت میجر ایٹلی تھے اور برطانیہ کے وزیرِ اعظمؒ) کی وہ تقریر کرتی ہے جو انہوں نے پارلیمان میں (INDEPENDENT BILL) پیش کرتے وقت کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا۔

> ہندوستان تقسیم ہو رہا ہے لیکن مجھے امیدِ واثق ہے کہ یہ تقسیم زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکے گی اور یہ دونوں مملکتیں جنہیں ہم اس وقت الگ الگ کر رہے ہیں، ایک دن پھر آپس میں مل کر رہیں گی۔ (پاکستان ٹائمز ۱۲؍ ...)

برطانیہ کا وزیرِ اعظم یہ کہہ رہا تھا۔ ہندو، پاکستان پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا ــــ اور قائدِ اعظمؒ لارڈ مونٹ بیٹن سے کہہ رہے تھے کہ

ہم کوشش کریں گے کہ دولتِ برطانیہ، ہندوستان اور ہمسایہ حکومتوں سے ہمارے تعلّقات خوشگوار رہیں۔

ضمناً یاد آگیا ــــ جب لارڈ مونٹ بیٹن، ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کو انتقالِ اختیارات کے سلسلہ میں کراچی آیا ہے، تو اس نے پاکستان کے گورنر جنرل (قائدِ اعظمؒ) سے کہا تھا کہ پاکستان کو حکومت مل رہی ہے مجھے یقین ہے کہ جہاں تک غیر مسلم اقلیّتوں کا تعلّق ہے، پاکستان شاہنشاہِ اکبر کی (رواداری کی) پالیسی پر عمل کرے گا۔ اس پر قائدِ اعظمؒ نے چمک کر جواب دیا کہ ہمیں اس تلقین کی ضرورت نہیں۔ ہم ان روایات کے حامل ہیں جن کی رُو سے ہمیں غیر مسلموں کے ساتھ رواداری ہی کا نہیں بلکہ فیّاضانہ سلوک کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

خراجِ تحسین یہ تھا برادرانِ عزیز ملّتِ اسلامیہ کا وہ چراغ جس نے لاکھ اندھیروں کا مقابلہ کیا اور کامیاب و کامران دنیا سے رخصت ہوا۔ ان کی وفات پر دنیا کے عظیم سیاستدانوں اور مفکّروں نے ان کی بارگاہ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ حتّٰی کہ لنڈن ٹائمز جیسے اخبار نے لکھا۔

> انہوں نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعوٰی کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیٰحدہ قوم ہے۔ ان میں وہ ذہنی لچک نہیں تھی جو انگریزوں کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصّہ ہے۔ ان کے خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت، واضح اور بیّن ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہ تھی۔ بلکہ وہ جس نقطۂ نظر کو ہدف بناتے تھے اس پر براہِ راست نشانہ باندھ کر وار کرتے تھے۔ وہ ایک ناقابلِ تسخیر حریف تھے۔

غیر تو یہ کہہ رہے تھے، لیکن (کس قدر مقامِ تاسّف ہے کہ) خود "اپنے" ــــ جو ہندوستان سے بھاگ کر پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور تھے اور پاکستان نے انہیں ان کی مسلسل مخالفت کے باوجود، نہایت کشادہ ظرفی سے پناہ دی تھی ــــ اسی قائدِ اعظمؒ کے متعلّق یہ زہر افشانی کر رہے تھے کہ

> اس پورے گروہ میں ایک کوہ کن بھی نہ نکلا جو بازی کھو دینے کے بعد سر دے سکتا۔ ساری جماعت بازی گروں سے پٹی پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب قلابازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دکھایا۔ اور اس قوم کی رہی سہی عزّت خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندے تھے۔
>
> (ترجمان القرآن ماہ اگست ۱۹۴۷ء)

بسترِ مرگ سے

ایسا نظر آتا ہے کہ قائدِ اعظمؒ کو اپنی زندگی کے آخری ایّام میں ہندوستان کے مذموم عزائم کا اندازہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بسترِ مرگ سے کہا تھا۔

خدائے عظیم و برتر کی قسم، جب تک ہمارے دشمن ہمیں اٹھا کر بحیرہ عرب میں نہ پھینک دیں، ہم ہار نہ مانیں گے۔ پاکستان کی حفاظت کے لئے میں تنہا لڑونگا۔ اس وقت تک لڑوں گا جب تک میرے ہاتھوں میں سکت اور جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی موجود ہے۔ مجھے آپ سے کہنا ہے کہ اگر کوئی ایسا وقت آجائے کہ پاکستان کی حفاظت کے لئے جنگ لڑنی پڑے، تو کسی صورت میں ہتھیار نہ ڈالیں۔ پہاڑوں میں، جنگلوں میں اور دریاؤں میں جنگ جاری رکھیں۔

(ڈاکٹر ریاض علی شاہ کی کتاب، قائدِ اعظمؒ کے آخری ایام)

ہمارے فوجیوں کے کردار

سترہ سال کے بعد، بالآخر وہ وقت بھی آگیا اور للہ الحمد، کہ ہماری فوجوں نے قائدِ اعظمؒ کی توقعات کو پورا کر دکھایا۔ وہ اس وقت زندہ ہوتے تو اپنے ان شاہین بچوں پر بڑا فخر کرتے۔ نہ صرف اس لئے کہ انہوں نے میدانِ کارزار میں بے مثال جرأت اور بہادری کا ثبوت دیا ہے بلکہ اس لئے بھی کہ انہوں نے سخت آزمائش کے وقت اپنی ان اخلاقی روایات کو قائم رکھا ہے جس کی تلقین سانحہ بہار کے سلسلہ میں مسلم اکثریت کے صوبوں سے کی گئی تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ حالیہ جنگ میں جہاں ہندوؤں نے نہتّی شہری آبادیوں کو تباہ و برباد کیا وہاں ہماری عصمت و عفّت پر بھی ڈاکے ڈالے۔ وہ ہماری جوان بیٹیوں کو ٹرکوں میں بھر کے لے گئے۔ ہمارے جانباز، غیور، باہمّت سپاہیوں نے ان مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اس کے بعد انہی سپاہیوں کا ہندوؤں کے علاقوں پر قبضہ ہوا۔ اب موقع تھا کہ یہ ہندوؤں کی اس کمینہ روش کا انتقام یہاں کی عورتوں کی بے حرمتی سے لیتے۔ لیکن انہوں نے کیا کیا، اس کے متعلّق مجھ سے نہیں، خود ہندوؤں کے ذمّہ دار لیڈروں کی زبان سے سنیئے۔ ہندوستان کی لوک سبھا (پارلیمان) میں وہاں کے ایک ممبر (مسٹر کپور سنگھ) نے کہا کہ فاضلکا سیکٹر میں مسلمان سپاہیوں نے ہندوستانی عورتوں کو اغوا کیا۔ اس پر وہاں کے وزیرِ دفاع مسٹر چوہان نے کہا کہ میرے علم میں ابھی تک کوئی ایسا واقعہ نہیں آیا۔ تاہم میں اس کی تحقیق کرونگا۔ اور اس تحقیق کے سلسلہ میں مشرقی پنجاب کے وزیرِ اعظم مسٹر رام کشن نے اعلان کیا کہ

پاکستانی سپاہیوں نے کسی ایک عورت کو بھی اغوا نہیں کیا۔

انتقام لینے کی قوت رکھتے ہوئے، ضابطۂ اخلاق کی اس طرح پابندی کرنا، بڑی ہمت کا کام ہے اور

اس بلندیٔ کردار اور ضبطِ نفس کا مظاہرہ ان فوجی نوجوانوں کی طرف سے ہوا جنہیں ہمارا "مذہب پرست" طبقہ "ٹیڈی بائیز" "ٹیڈی بائیز" کہہ کہہ کر بدنام کیا کرتا تھا۔

خطرہ کا مقام

بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ قائدِ اعظم نے اپنے بستر مرگ سے پاکستان کی مدافعت کے لئے جو تلقین کی تھی، ہماری افواج نے اسے میدانِ جنگ میں پورا کر کے دکھا دیا۔ لیکن اس کے بعد اب ہم پھر اس مقام پر آ گئے ہیں جس مقام پر اگست ۱۹۴۷ء میں تھے، یعنی جب ہماری جنگ میدانِ کارزار سے ہٹ کر بساطِ سیاست کی طرف منتقل ہو گئی تھی اور جہاں ہم ثالثی کو مان کر اتنا بڑا فریب کھا گئے تھے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اب ہم اس تجربہ سے فائدہ اٹھائیں گے اور دوبارہ اس قسم کا دھوکا نہیں کھائیں گے۔ کیونکہ

مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا

کامیابی کا راز

اس قسم کے مہیب خطرات میں، کامیابی کا راز کیا ہے، اس کے متعلق قائدِ اعظمؒ ہی کی زبان سے سنیئے۔ انہوں نے پاکستان کی جنگ لڑتے ہوئے کہا تھا۔

> اس وقت میدانِ سیاست میں ہندو مسلمانوں کی جنگ ہو رہی ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ کون فتح یاب ہوگا۔ علمِ غیب تو خدا کو ہے، لیکن میں ایک مسلمان کی حیثیت سے علیٰ رؤس الاشہاد کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم قرآن مجید کو اپنا آخری اور قطعی رہبر بنا کر، ثبات و استقامت پر کاربند رہیں اور اس ارشادِ خداوندی کو کبھی فراموش نہ کریں کہ مسلمان سب بھائی بھائی ہیں تو ہمیں دنیا کی کوئی طاقت یا کئی طاقتوں کا مجموعہ بھی مغلوب نہیں کر سکتا۔

یعنی "قرآن مجید کو اپنا آخری اور قطعی رہبر بنا کر ثبات و استقامت پر کاربند رہنا اور اس ارشادِ خداوندی کو سامنے رکھنا کہ مسلمان سب بھائی بھائی ہیں"۔۔۔ اس سے وہ قوت حاصل ہوتی ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی۔ خدا کرے کہ ہمیں یہ قوت حاصل ہو جائے!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ!

والسلام!

ہم نے ...

پاکستان کیوں مانگا تھا؟

۱۴ر اگست ۱۹۶۴ء

تاریخ بتاتی ہے کہ حضورؐ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلّم کے عہدِ سعید میں مدینہ کے یہودی عاشورہ کے دن روزہ رکھا کرتے تھے حضورؐ کے استفسار پر بتایا گیا کہ اس دن بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات حاصل ہوئی تھی۔ چنانچہ اس یوم مسرت کی یاد تازہ رکھنے کے لئے شکرانِ نعمت کے طور پر، وہ اس دن کا روزہ رکھتے ہیں۔ حضور رسالتمآبؐ نے یہ سُنا اور مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ وہ بھی اس تقریب میں یہودیوں کا ساتھ دیں اور عاشورہ کا روزہ رکھا کریں۔ کیونکہ کسی قوم کی غلامی سے نجات صرف اسی قوم کے لئے وجہِ مسرت نہیں بلکہ یہ پوری نوعِ انسانی کے لئے باعثِ شرف وسعادت ہے۔ حضور رسالتمآبؐ نے یہ واضح کر دیا کہ غلامی ایک ایسی لعنت ہے جو قوموں کو شرفِ انسانیت سے محروم کر دیتی ہے۔ علّامہ اقبالؒ نے اسی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا تھا کہ

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن وزیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے، ہے وہی زیبا
بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

۱۴ اگست کو ہماری حیاتِ ملّی میں یومِ آزادی کی حیثیت حاصل ہے اور اس دن پاکستان کے طول و عرض میں آزادی کا جشنِ مسرت بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ یہ جشنِ آزادی ہمیں سے مخصوص نہیں بلکہ دنیا کی اکثر و بیشتر قومیں اپنے اپنے ہاں یومِ آزادی کی تقریب اسی وفورِ مسرت سے مناتی ہیں۔ اس دن کی یاد میں ان کے ہاں بھی فضا میں مسرت کے نغمے گونجتے ہیں، خوشی کے شادیانے بجتے ہیں۔ فضا جشنِ چراغاں سے بقعۂ نور بن جاتی ہے اور مسرت کے ان ہنگاموں میں چاروں طرف یہ احساس کارفرما ہوتا ہے کہ اس دن ان کی غلامی کی زنجیریں ٹوٹی تھیں، ان کی بے بسی اور محکومی کے بندھن کٹ گئے تھے۔ انہیں دوسروں کے استبداد سے نجات ملی تھی اور اب وہ اس قابل ہیں کہ اپنی مملکت کے دائرے میں اپنی مرضی کے آئین و قوانین رائج کر سکیں، اپنی منشاء کے مطابق احکام کا نفاذ عمل میں لا سکیں۔ ان کی آزادی پر خارج سے کوئی پابندی عاید نہ ہو۔

یہاں یہ بڑا اہم اور بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہماری آزادی کا مفہوم اور منشاء و مقصود بھی یہی تھا، یعنی ہم جو جشنِ آزادی کی تقریب مناتے ہیں، کیا یہ بھی آزادی کے اسی تصوّر کی آئینہ دار ہے جو دیگر اقوال و ملل میں رائج ہے؟ پاکستان کو آزادی حاصل کئے سترہ برس ہو گئے۔ کہا جائے گا کہ اتنے سالوں کے بعد اس انوکھے سوال کو اٹھانے کی ضرورت کیا پڑی ہے؟ ہم نے کئی سال تک اپنی آزادی کی جنگ لڑی۔ اس جنگ میں کامیابی حاصل کی اور اپنی آزاد مملکت میں زندگی بسر کرتے اتنے سال گذر گئے اور اب یہ سوال کہ "ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا؟" کیوں اٹھایا جائے۔

پیشتر اس کے کہ ہم اپنی آزادی کے منشاء و مقصود کے اہم اور بنیادی سوال کی طرف آئیں، ہم تمہیداً اس کی وضاحت کر دینا چاہتے ہیں کہ بعض وجوہات کی بنا پر یہ سوال ہمارے ہاں بڑی اہمیّت اختیار کر گیا ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حصولِ پاکستان کے بعد اکثر و بیشتر ان عناصر نے بھی پاکستان میں ڈیرے ڈال دیئے جو تحریکِ پاکستان کے دوران اس کی مخالفت میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگاتے رہے تھے۔ انہوں نے پاکستان کو اپنی جائے پناہ بنا لیا اور یہاں اپنی کمین گاہوں میں بیٹھ کر ایسے پروپیگنڈے کی اشاعت شروع کر دی جو مایوسی اور ذہنی انتشار کا باعث ہو۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہم نے کم و بیش دس برس تک حصولِ پاکستان کے لئے مسلسل جدّوجہد کی، لیکن جب یہ حاصل ہو گیا تو ہم نے ایک دوسرے سے یہ پوچھنا شروع کر دیا کہ ہم نے پاکستان مانگا کیوں تھا؟ اس مطالبے سے ہمارا مقصد کیا تھا؟ اور ذہنی انتشار کی یہ کیفیت یہاں تک پہنچ گئی کہ چاروں طرف سے عجیب و غریب آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایک نے کہا، ارے صاحب! پاکستان تو ہندو کی تنگ نظری

کا نتیجہ ہے۔ اگر وہ کشادہ دلی سے کام لیتے تو پاکستان کے بننے اور بنانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ گویا پاکستان کی بنیاد کسی مثبت جذبہ پر نہیں تھی۔ یہ محض ہندو کی تنگ نظری کا نتیجہ ہے۔ دوسری طرف سے آواز آئی کہ حضرات! یہ انگریز کی ایک چال تھی۔ وہ چاہتا ہی تھا کہ یہاں سے ایسی حالت میں رخصت ہو کہ ہندو اور مسلمان آپس میں ہمیشہ لڑتے رہیں، چنانچہ اس نے پاکستان کا تصوّر پیدا کیا اور مسٹر جناح کو اس مقصد کے لئے آگے بڑھا دیا۔ گویا مسٹر جناح انگریز کے اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے آلۂ کار تھے۔ یہ اس شخص کے متعلق کہا جا رہا ہے جس کے متعلق اس کے بدترین دشمنوں کو بھی یہ اعتراف تھا کہ وہ کسی قیمت پر کسی کے ہاتھ بک نہیں سکتا تھا۔

یہ لوگ تو خیر تھے ہی تحریکِ پاکستان کے مخالفین۔ تحریکِ پاکستان کی کامیابی کو انہوں نے اپنے لئے ایک گہرے زخم کے طور پر قبول کیا اور اس کی کسک سے انہیں آج تک چین نصیب نہیں ہوا۔ اس لئے یہ حضرات جو کچھ کہتے ہیں اور کرتے ہیں وہ ان سے غیر متوقع نہیں تھا۔ لیکن ہمیں جس چیز سے افسوس ہوا وہ یہ تھی کہ ایک ایسے ممتاز شخص کا قلم بھی نامحسوس طور پر ایسے پراپیگنڈے میں معاون ثابت ہوا جن کا ان عناصر سے کوئی تعلّق نہ تھا۔ ہماری مراد سابق چیف جسٹس آف پاکستان محترم محمد منیر صاحب سے ہے جنہوں نے پچھلے دنوں اخبارات میں (دو قسطوں میں) ایک اہم مقالہ شائع کیا۔ محترم منیر صاحب اس باؤنڈری کمیشن کے رکن تھے جس نے پاکستان اور بھارت کے مابین سرحدوں کا فیصلہ کیا اور اپنے اس مقالہ میں انہوں نے کمیشن اور اس کے فیصلہ سے متعلق بڑے اہم اور مضمر حقائق کا انکشاف کیا۔ ان کا یہ مقالہ بڑا معلومات افزا اور حقیقت کشا تھا لیکن پتا نہیں اپنے مقالہ کے آخر میں وہ کیوں ایک غیر متعلقہ سی بات کہہ گئے۔ ان سطور میں انہوں نے لکھا تھا کہ قیامِ پاکستان تک کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت کی صورت اختیار کر لے گا۔

آیئے ہم دیکھیں کہ ہمارے جن قائدین نے پاکستان کا تصوّر دیا اور اس تصوّر کو ایک محسوس پیکر عطا کر دیا، کیا ان کے ذہن میں اس کے متعلّق کچھ تھا یا نہیں۔ ہماری مراد علّامہ اقبالؒ اور قائدِاعظمؒ کی عظیم المرتبت شخصیتوں سے ہے جن کے فکر و بصیرت اور حسنِ تدبّر سے ہمیں یہ مملکت ملی۔ ظاہر ہے کہ مملکتِ پاکستان کے بارے میں ان سے بڑھ کر کسی دوسرے کی شہادت قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ سب سے پہلے ہم علّامہ اقبالؒ کے پیش کردہ تصوّرِ پاکستان کو سامنے لائیں گے۔

دین اور مذہب کا فرق

یہاں یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ اقبالؒ پاکستان میں اسلام کو "مذہب" کی حیثیت سے نہیں بلکہ "دین" کی حیثیت سے نافذ العمل دیکھنا چاہتے تھے۔ "مذہب" (جسے عام طور پر (RELIGION) کہہ کر پکارا جاتا ہے) خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق کا نام ہے جسے انسان کی تمدنی، عمرانی، سیاسی، معاشی زندگی سے کچھ واسطہ نہیں۔ اس پرائیویٹ تعلق کو ایک عیسائی اپنے گرجے میں، ایک پارسی اپنے آتش کدہ میں، ایک ہندو اپنے مندر میں اور (اسی خیال کے مطابق) ایک مسلمان اپنی مسجد میں — بلکہ یوں کہیئے کہ ہر شخص اپنے اپنے گھر کے کسی کونے میں یا پہاڑ کے کسی غار میں — اپنے طور پر قائم کر سکتا ہے۔ ایسا کرنے سے مذہب کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد یہ لوگ اپنی عملی، تمدنی زندگی میں اپنے اپنے ہاں کی سیاست کے مطابق کام کرتے ہیں۔ یہ تو ہے مذہب کا تصور، لیکن اس کے برعکس "دین" خدا اور بندے کے درمیان کسی پرائیویٹ تعلق کا نام نہیں بلکہ یہ زندگی کا ایک ضابطہ اور نظامِ حیات ہے جو انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔

اقبالؒ اور خطبۂ الٰہ آباد

چنانچہ ۱۹۳۰ء میں جب اقبالؒ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاسِ الٰہ آباد کے خطبۂ صدارت میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ مملکت کا مطالبہ پیش کیا تو اس میں فرمایا۔

> ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک علاقے میں مرکوز کر دیا جائے۔...... حقیقت یہ ہے کہ اسلام خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ کا نام نہیں۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روسو کے دل میں ایسے نظام کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے جس کی رُو سے انسان، جمادات اور نباتات کی طرح بالکل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اس خطۂ زمین سے منسوب کر دیا اور کبھی اس سے بلکہ وہ ایک ایسی بلند و بالا ہستی سمجھا جاتا ہے جس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فٹ ہو (اور یہ چیز اپنی آزاد مملکت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی)۔ اسی لئے میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد اسلامی ریاست قائم کی جائے۔

نیشنلسٹ علماء کا تصوّرِ آزادی

ہمارے ہاں کے اُس وقت کے نیشنلسٹ علما جن کے سرخیل مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) تھے، ان کے نزدیک اسلام اور مسلمانوں کی آزادی کا تصور وہی تھا جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا تھا کہ ؎

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

چنانچہ مولانا مدنی (مرحوم) کے اخباری بیان کا جواب دیتے ہوئے علامہ اقبال مرحوم نے کہا تھا کہ

مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے، لیکن آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں، بلکہ ہمارا اوّل مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقت ور بن جائے۔ اس لئے میں کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنے دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیۃً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے، تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے۔ ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہوں۔

قائدِ اعظمؒ

علامہ اقبالؒ کے بعد قائدِ اعظمؒ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے لئے جداگانہ مملکت کے قیام کی جدّوجہد میں سالارِ کارواں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے سامنے پاکستان اور اس کے نظامِ مملکت کے بارے میں بعینہٖ وہی تصوّر تھا جو علامہ اقبال کے ذہن میں تھا۔ چنانچہ تحریکِ پاکستان کی جدّوجہد میں وہ شروع سے آخر تک اس حقیقت کو دہراتے چلے گئے۔ مثلاً ۱۹۴۵ء میں فرنٹیئر مسلم سٹوڈنٹس کے نام اپنے پیغام میں انہوں نے فرمایا۔

پاکستان سے مطلب یہ نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف اپنی آزادی حاصل نہیں کرنی، ہم نے اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت بھی کر سکیں اور اسلامی تصوّرات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایڈورڈس کالج پشاور میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے

الگ الگ نظریۂ زندگی کی وضاحت فرمائی، بلکہ اس طرح دین اور مذہب کے فرق کو بھی نمایاں کر کے رکھ دیا۔ انہوں نے فرمایا۔

ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمیں ایک ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے ۱۹۴۰ء کے تاریخی اجلاسِ لاہور میں، جہاں پاکستان کی قرارداد منظور ہوئی، تقریر کرتے ہوئے قائدِ اعظمؒ نے فرمایا۔

میرے لئے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کر رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں "مذہب" نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھیئے! ہندو اور مسلمان، زندگی کے ہر معاملے میں جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصوّرات پر ہیں۔ دو ایسی قوموں کو ایک نظامِ سلطنت میں یکجا کر دینا باہمی مناقشت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا جو اس ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا گیا ہے۔

ان تصریحات کے ساتھ لاہور کے تاریخی اجلاس میں قراردادِ پاکستان منظور ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے دس کروڑ مسلمانوں نے اُسے اپنے ملّی نصب العین اور تقاضائے دین و ایمان کی حیثیت سے نہ صرف قبول کر لیا بلکہ اس کے لئے آخری خندق تک لڑ مرنے کے لئے کارزارِ سیاست میں نکل آئے۔

اس قرارداد کو قومی نصب العین کی صورت اختیار کئے ابھی ڈیڑھ سال نہیں گزرا تھا کہ اگست ۱۹۴۱ء میں قائدِ اعظمؒ حیدرآباد تشریف لے گئے اور وہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبا نے بھی ان سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے دوران، طلباء نے قائدِ اعظمؒ سے بڑے اہم اور بنیادی سوالات کئے جن کے جوابات قائدِ اعظمؒ نے ایسے متعیّن، دو ٹوک اور نکھرے ہوئے انداز میں دیئے کہ مملکتِ پاکستان کے حصول کا منشاء و مقصود پوری طرح واضح ہو کر سامنے آ گیا۔ اورینٹ پریس کے نمائندے نے اِس ملاقات کی جو رپورٹ مرتّب کی اس کے ضروری حصّے سوالات و جوابات کی صورت میں درج ذیل ہیں۔

سوال :۔ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں ؟

جواب :۔ جب میں انگریزی میں مذہب (RELIGION) کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کے باہمی پرائیویٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک، مذہب کا یہ محدود اور مقیّد مفہوم یا تصوّر نہیں۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملاّ، نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعوٰی ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلام کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشّان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور طریقِ کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہے، بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصّہ ہے اس سے بہتر کا تصوّر ناممکن ہے۔

قائدِ اعظمؒ کا اپنے متعلّق اعتراف واعلان یہ ہے کہ "میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ مُلاّ، نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعوٰی ہے"۔ لیکن اسلامی نظام کی اصل و بنیاد کے متعلّق جو کچھ انہوں نے سمجھا اور کہا ہے، ذرا غور کیجئے کہ دینیات میں مہارت کے مدّعی کتنے ہیں جو اسلام کے متعلّق اس گہرائی تک پہنچ سکتے ہیں۔

سرِّ خدا کہ زاہد و عابد بکس نگفت
در حیرتم کہ دُرد کشاں از کجا شنید؟

سوال :۔ اس سلسلے میں اشتراکی حکومت کے متعلّق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب :۔ اشتراکیت، بالشویت یا اسی قسم کے دیگر سیاسی اور معاشی مسالک، درحقیقت اسلام اور اس کے نظامِ سیاست کی غیر مکمّل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا ربط اور تناسب نہیں پایا جاتا۔

کتنی بڑی حقیقت ہے جسے چند الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا گیا ہے۔ روس کی کمیونزم ہو یا مغرب کی ڈیماکریسی، یہ سب اسلامی نظام کے مختلف اجزا کی بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ جب تک ان میں سے انسانی تصوّرات کو نکال کر، ان کی جگہ "خدا" شامل نہ کر دیا جائے، یہ مسلک نوعِ انسانی کے لئے کبھی ایسے منفعت بخش نتائج پیدا نہیں کر سکتے جو اسلامی نظام کا خاصّہ ہیں۔

اب، اس کے بعد وہ تیسرا سوال اور اس کا جواب ملاحظہ فرمایئے، جو ہمارے نزدیک اس موضوع پر مقطع کا بند ہے. غور سے سنیئے.

سوال :۔ اسلامی حکومت کے تصوّر کی امتیازی خصوصیّت کیا ہے؟

جواب :۔ اسلامی حکومت کے تصوّر کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ، قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں. اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی. قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعیّن کرتے ہیں. اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لا محالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے.

صرف قرآن کی اطاعت

آپ اس جواب کے ایک ایک فقرہ پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ اس حقیقت کو کس قدر غیر مبہم، مختصر لیکن جامع الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ کوئی مملکت اسلامی کس طرح بن سکتی ہے. اسلام کی بنیادی تعلیم لا الٰہ الا اللہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے سوا کوئی اور ہستی ایسی نہیں جس کی اطاعت اختیار کی جائے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۶/۵۷) اس کے سوا کسی اور کا فیصلہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتا. کسی اور کو اس کا حق ہی حاصل نہیں کہ کسی سے اپنا فیصلہ اور حکم منوائے.

لیکن خدا تو ایک اَن دیکھی، مجرّد ذات کا نام ہے. اس کی اطاعت کی عملی شکل کیا ہو گی؟ کیسے معلوم کیا جائے گا کہ فلاں معاملہ میں اس کا حکم اور فیصلہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ "اس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں". اسی لئے اس کا ارشاد ہے کہ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (۷/۳) جو کچھ خدا نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اس کا اتّباع کرو. اس کے سوا کسی اور سرپرست کا اتّباع مت کرو". بالفاظِ دیگر "اسلامی حکومت قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے". "اسی کے احکام ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں". یہی چیز کفر اور ایمان کا خطِ امتیاز قرار پاتی ہے. وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ. (۵/۴۴) جو خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے تو یہی لوگ ہیں جنہیں کافر کہا جاتا ہے

قائدِاعظم کی اس دوٹوک وضاحت سے مملکتِ پاکستان کا بنیادی دستور ابھر کر سامنے آجاتا ہے اور اس میں کسی ادنیٰ شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ان کے نزدیک مملکتِ پاکستان کے آئین و قوانین کی اساس قرآن کریم کے سوا اور کوئی ہو نہیں سکتی۔ اسی کتاب کو ہمارے قوانین کا سرچشمہ اور احکام کا ماخذ قرار پانا چاہیئے۔ اس کے علاوہ ہمارے نظامِ مملکت کے لئے کوئی دوسرا ماخذ قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم کی عظمت اور جامعیت ان کے دل و دماغ پر کس حد تک اثر انداز تھی؟ اس کا اندازہ ان کے اکثر بیانات سے سامنے آئے گا مثلاً ۱۹۴۵ء میں عید کی تقریبِ سعید پر قوم کے نام اپنے پیغام میں انہوں نے فرمایا۔

قرآن کی جامعیت

اس حقیقت سے ہر مسلمان باخبر ہے کہ قرآن کے قوانین صرف مذہبی اور اخلاقی حدود تک نہیں۔ گبن نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ بحرِ اطلانتک سے لے کر گنگا تک، ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے جس کا تعلق صرف الہیات تک نہیں، بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوعِ انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں اور یہ قوانین منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔"

اس حقیقت سے سوائے جہلا کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ضابطۂ اخلاق ہے جو مذہب، معاشرت، تجارت، عدالت، فوج، سول اور فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کی زندگی کے عام معاملات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی واجبات کا مسئلہ ہو یا انفرادی حقوق کا، ان تمام معاملات کے لئے اس ضابطہ میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جانا چاہیئے۔

یہ تھی قرآنِ کریم کی عظمت اور جامعیت جس پر قائدِاعظمؒ کا ایمان تھا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ ہندوستان کے مسلمان مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان کی الگ پارٹیاں بھی تھیں۔ ان میں نسلی اور صوبائی تعصّب بھی موجود تھا۔ خود پاکستان کو جن دو بڑے بڑے خطّوں پر مشتمل ہونا تھا۔ (یعنی مغربی اور مشرقی پاکستان) ہیں ہزاروں میل کا فاصلہ تھا۔ لسانی اور نسلی نقطۂ نگاہ سے بھی ان دونوں خطّوں کے رہنے والوں

مسلمانوں میں وجہِ جامعیت

میں کوئی وجہِ اشتراک نہ تھی۔ سوال یہ تھا کہ ان تمام وجوہِ اختلاف کے باوجود، وہ کون سی قدرِ مشترک تھی جو ان باہمد گر متضاد عناصر

کو ایک نقطہ پر جمع کر سکتی تھی۔ اس کا جواب قائدِاعظمؒ کے الفاظ میں سنیئے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (۱۹۴۳ء، واقع کراچی) میں پہلے خود ہی یہ سوال اٹھایا کہ:

> وہ کون سا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملّت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امّت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔

اس کے بعد خود ہی اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا کہ

> وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر، خدا کی کتاب عظیم، قرآن کریم ہے مجھے یقین محکم ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔
>
> ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب

حصولِ پاکستان کے بعد

مطالبۂ پاکستان کے منشاء و مقصود کی وضاحت کرتے ہوئے قائدِاعظمؒ نے حصولِ پاکستان تک مختلف مواقع پر جو کچھ ارشاد فرمایا، اس کے چند گوشے نکھر کر آپ کے سامنے آ گئے۔ اب حصولِ پاکستان کے بعد کا معاملہ ہمارے سامنے آتا ہے اور وہی حلقے جو حصولِ پاکستان کے مقاصد کو عوام کی نگاہوں سے اوجھل کرنے کے درپے ہیں، یہ کہتے سنائی دیں گے کہ حصولِ پاکستان سے قبل بے شک قائدِاعظمؒ نے یہی کچھ کہا تھا لیکن اس کے حصول کے بعد انہوں نے اپنے خیالات میں تبدیلی کر لی تھی۔ ہمارے نزدیک یہ نہ صرف قائدِاعظمؒ کی عظمتِ کردار پر ایک گھناؤنی الزام بازی ہے، بلکہ واقعات و حقائق کے سراسر منافی بھی۔ حصولِ پاکستان کے بعد بھی قائدِاعظمؒ کے موقّف میں ذرّہ بھر تبدیلی نہیں آئی۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے انہوں نے کراچی کے خالق دینا ہال میں افسرانِ حکومت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گذشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے، اب خدا کے فضل سے ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آ چکا ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشو و نما پا سکیں اور جہاں

اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر رُو بہ عمل لائے جاسکیں۔

پاکستان کا آئین

حصولِ پاکستان کے بعد سب سے اہم مسئلہ آئینِ مملکت کی ترتیب و تدوین کا تھا۔ اسلام کے نام پر ایک نئی مملکت نقشۂ عالم میں اپنا مقام پیدا کر چکی تھی اور ایک دنیا کی نگاہیں یہ دیکھنے کے لئے بےتاب تھیں کہ اس مملکت میں کس قسم کا آئین متشکّل ہوتا ہے۔ مشرق و مغرب کے کروڑوں انسان گوش بر آواز تھے کہ اس سلسلے میں کارفرمایانِ مملکت کی طرف سے کوئی واضح اور دو ٹوک اعلان سُن سکیں۔ فروری ۱۹۴۸ء میں قائدِاعظمؒ نے اس کی ضرورت محسوس کی اور اہلِ امریکہ کے نام ایک پیغام براڈکاسٹ کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔

> پاکستان کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتّب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیسی ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ بردار، جمہوری انداز کا آئین ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں، جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیّت اور ہر ایک کے ساتھ عدل اور دیانت کی تعلیم دی ہے آئینِ پاکستان کے مرتّب کرنے کا سلسلہ میں جو ذمّہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں، ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں کچھ بھی ہو، یہ مسلّمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) ”خدائی مشن“ کو پورا کریں۔

مذہبی پیشوائیت کی طرف سے مخالفت کیوں؟

قائدِاعظمؒ کا یہ اعلان مذہبی پیشوائیت کے لئے پیامِ موت سے کم نہیں تھا۔ یہاں اسلامی حکومت کے قیام سے یہ حضرات اس خوش فہمی اور خود فریبی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ جب یہاں اسلامی نظام کا قیام عمل میں لایا جائے گا تو شرعی احکام و قوانین اور فیصلوں کے لئے مختارِ ناطق وہی قرار پائیں گے لیکن قائدِاعظم نے دو ٹوک الفاظ میں بتا دیا کہ قرآنی نظام ایسے کسی گروہ کی اجارہ داری تسلیم نہیں کرتا۔ یہیں سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہمارے مذہبی پیشوا تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں کیوں اغیار کے آلۂ کار بن کر آگے بڑھے تھے اور ان کی مخالفت کا یہ سلسلۂ دراز آج تک کیوں نئے نئے فتنے بکھیرتا چلا آرہا ہے۔ سترہ برس سے یہاں اسلامی

نظام کے نقاب میں جو کچھ کہا اور کیا جا رہا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہاں وہ تھیا کریسی قائم ہو جس میں اقتدارِ اعلیٰ مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور جس میں انسانیت کا گلا بُری طرح سے گھٹتا ہے۔ ان حضرات نے مذہب کے نام پر جو انتشار پیدا کر رکھا ہے، اگر ملّت کو اس سے نجات مل جاتی تو اس کا سفینۂ حیات کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہوتا۔ اسی پیدا کردہ انتشار کا نتیجہ تھا کہ ہمارے عوام حصولِ پاکستان کے مقاصد سے دور ہٹتے چلے گئے اور ان کے لئے یہ سمجھنا تک مشکل ہو گیا ہے کہ ہم نے پاکستان مانگا کیوں تھا

ذہنی انتشار کی یہ کیفیت بپا تھی کہ (DAYS TO REMEMBER) کے عنوان سے محترم جسٹس منیر کا وہ مقالہ شائع ہوا جس کا ذکر ہم شروع میں کر چکے ہیں۔ محترم منیر صاحب نے اس مقالہ کے آخر میں کہا ہے کہ تشکیلِ پاکستان کے وقت تک کسی کے ذہن میں یہ بات نہیں تھی کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہو گی۔

جسٹس منیر صاحب کو شاید معلوم نہیں کہ بعینہٖ یہی بات بہت پہلے مودودی صاحب نے ان الفاظ میں کہی تھی کہ:-

> مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں کی کسی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمعِ نظر اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔
>
> (ترجمان القرآن، محرم ۱۳۶۰ھ)

ہندو سب کچھ جانتے تھے

یہ تو ہیں پاکستان کے بارے میں ہمارے ہاں کی بھانت بھانت کی بولیاں! یعنی ان حضرات کے نزدیک پاکستان کے ایک اسلامی مملکت قرار پانے کے متعلق نہ تو ہمارے رہنماؤں کے ذہن میں کوئی خیال موجود تھا اور نہ ایسا کوئی اعلان کیا گیا۔ رہنماؤں کے اعلانات تو آپ کے سامنے آ چکے۔ اب یہ دیکھئے کہ تحریکِ پاکستان کے مقاصد اس قدر متعیّن اور واضح تھے کہ ہر ہندو رہنما تک ان سے بخوبی آگاہ تھا اور اسے اس میں ادنیٰ شک و شبہ نہیں تھا کہ مسلمان پاکستان کا مطالبہ کیوں کر رہے ہیں۔ اور وہ یہ سب کچھ اس وقت سے بخوبی جانتے تھے جب کہ پاکستان کا مطالبہ پہلی بار دنیا کے سامنے آیا۔ چنانچہ یکم نومبر ۱۹۴۱ء کو لدھیانہ میں "اکھنڈ بھارت کانفرس" کے صدارتی خطاب میں مشہور کانگریسی رہنما مسٹر منشی نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا تھا کہ:-

> نہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سُن لیجئے کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے HOME LANDS

بنائیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے ڈھانچے میں ڈھل سکیں اور جہاں اردو ان کی قومی زبان بن سکے مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک خطّۂ ارض ہوگا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔

(ٹربیون ۱۱/۳ ۱۴)

منافقت کا الزام

محترم جسٹس منیر صاحب کی تائید کرتے ہوئے نئی نسل کے ایک نوجوان نے پاکستان ٹائمز میں لکھا:

پاکستان کی تشکیل کا اصل مقصد تو سیاسی اور معاشی اقتدار حاصل کرنا تھا لیکن اس مطالبہ کو عوام کے سامنے جذباتی اور مذہبی سوال بنا کر پیش کیا گیا تاکہ اس سے یہ عوامی تحریک بن سکے۔

(پاکستان ٹائمز ۱۲/ جولائی ۱۹۶۳ء)

یہ تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ اقبالؒ و جناحؒ کے عطا کردہ پاکستان میں رہتے ہوئے کوئی پاکستانی ان جلیل القدر شخصیتوں پر ایسا الزام عاید کر سکے گا جس کی جرأت غیروں کو بھی نہیں ہوتی تھی۔ اس الزام کی زد سب سے زیادہ قائدِ اعظمؒ پر پڑتی ہے کہ انہوں نے سیاسی اور معاشی اقتدار کے حصول کے لئے مطالبہ پاکستان کو جذباتی اور مذہبی نقاب پہنایا اور اصل غرض و غایت سب کی نگاہوں سے اوجھل رکھی۔ سنیئے کہ جناح کے بارے میں غیروں کی رائے کیا تھی مشہور کتاب (VERDICT OF INDIA) کے مصنّف بیورلی نکلس نے آج سے کچھ عرصہ پہلے اپنے ایک بیان میں کہا تھا

میں نے بیس سال پہلے پاکستان کی حمایت میں قلم اٹھایا اور ایک دنیا میری مخالف ہوگئی۔ لیکن میں نے پاکستان کی حمایت میں جو کچھ لکھا تھا اس کی صداقت پر مجھے اس لئے یقین تھا کہ میں مسٹر جناح کو جانتا تھا اور اگر پاکستان کی نئی نسل کے دل میں پاکستان کی محبّت کم ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جناح سے واقف نہیں۔

یہ ہے جناحؒ کی عظمتِ کردار کی جچی تلی شہادت غیروں کی بارگاہ سے!

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

ہماری قومی زندگی کا المیہ اب یہی نہیں رہا کہ نئی نسل جناح سے واقف نہیں بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر دلدوز حادثہ یہ ہے کہ اس نئی نسل کے افراد اس پر یہ الزام عائد کرنے سے نہیں چوکتے کہ وہ ساری عمر منافقت سے کام لیتا رہا اور سیاسی و معاشی اقتدار کے لئے عوام کے مذہبی جذبات سے کھیلتا رہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

لیکن نئی نسل کو جناح کی شخصیت سے اس قدر بے خبر رکھنے کا ذمّہ دار کون؟ اس کے ذمّہ دار ہم خود ہیں کہ ہم

نے نئی نسل کو تاریخ کی یہ عظیم حقیقت سمجھانے کی کوشش نہیں کی کہ اس عظیم مملکت کا حصول جناحؒ کی درخشندہ سیرت و کردار کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا۔ یہ اس کی سیرت و کردار کی بلندی تھی جو انگریز اور ہندو کی منظم قوتوں کو شکست پہ شکست دیتی چلی گئی اور جب تک پاکستان کا نام زندہ ہے جناحؒ کا نام بھی تاریخ کے صفحات پر جگمگاتا رہے گا جناح زندہ و پائندہ ہے اور ہمیشہ درخشندہ و پائندہ رہے گا۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام

قرآنی پاکستان کیسا ہوتا؟

۱۵ جنوری ۱۹۶۷ء کی صبح عید الفطر کی تقریب پر درسِ قرآن کریم

اسلام، ایک زندہ نظامِ حیات بننے کے لئے، اپنی آزاد مملکت کا متقاضی ہے۔ یہ وہ شرط ہے جس کے پورا نہ ہونے سے وہ، دیگر مذاہب کی طرح ایک مذہب بن کر رہ جاتا ہے، دین یعنی نظامِ حیات نہیں بن سکتا (مثلاً) اس نظام کے بنیادی ستون اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہیں اور اس کا اصل الاصول، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ ہمارے مروّجہ تصورِ اسلام کی رُو سے، اقامتِ صلوٰۃ کے معنی ہیں صرف نماز پڑھنا اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم، غریبوں اور گداگروں کو کچھ پیسے بطورِ خیرات دے دینا۔ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے مقصود ہے لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی بات کے لئے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ فرائض ہم، انگریز کے عہدِ غلامی میں بھی آزادانہ ادا کر سکتے تھے اور آج بھارت کا مسلمان، بایں ہمہ بے بسی و بے کسی، انہیں اپنے طور پر ادا کر سکتا ہے لیکن قرآن کریم ان کی ادائیگی کے لئے اپنی حکومت کا قیام، لازمی شرط قرار دیتا ہے جہاں کہتا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (22/41)۔ یہ وہ لوگ ہیں (یعنی جماعتِ مومنین) کہ جب انہیں حکومت ملے گی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا انصرام کریں گے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا فریضۂ حیات ہوگا (یا د مثلاً) مذہبی سطح پر اسلام سے مقصود یہ ہے کہ انسان خدا کی عبادت کرے اور شرک سے مجتنب رہے یعنی غیر اللہ کی پرستش نہ کرے۔ اس مقصد کے لئے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ ہر مقام پر، ہر حال

میں کیا جا سکتا ہے. لیکن قرآن کریم میں ہے کہ دین کے تمکّن کے لئے استخلاف فی الارض ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر نہ خدا کی عبودیّت اختیار کی جا سکتی ہے اور نہ شرک سے اجتناب ممکن ہے. سورۂ نور میں ہے کہ خدا نے تم سے حکومت کا وعدہ کر رکھا ہے تاکہ تم اس کی عبودیّت اختیار کر سکو اور شرک سے بچ سکو. یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡـًٔا (۲۴/۵۵) . جب رسول اللہؐ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو قبیلہ بنی عامر کا ایک بہت بڑا سردار آپ کے پاس آیا اور اس دعوت کے مقاصد کے متعلق وضاحت چاہی. آپ کی وضاحت پر اس نے پوچھا کہ اگر میں ان امور پر کاربند ہو گیا تو مجھے کیا ملے گا. آپؐ نے فرمایا کہ جنّت. یعنی باغ و بہار جنّت — ہمیشہ رہنے والی زندگی. اُس نے کہا کہ یہ بعد کی بات ہے. میں یہاں کے متعلق معلوم کرنا چاہتا ہوں. اس پر آپؐ نے فرمایا کہ — نعم النصر و التمکین فی البلاد اس دنیا میں فتوحات اور حکومت حاصل ہو گی۔ (الکامل)

اسلام کا تقاضا

یہ تھا اسلام کے دین (یعنی زندہ نظامِ حیات) بننے کا تقاضا جس کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصوّر پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ :-

> اس سے اسلام، اپنی تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے گا اور انہیں عصرِ حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے گا۔ (خطبۂ الٰہ آباد ۱۹۳۰ء)

اس سے بھی پہلے، انہوں نے اپنے خطبات میں اس حقیقت کی وضاحت کر دی تھی کہ :-

> اسلامی نقطۂ نگاہ سے، مملکت اس کوشش کا نام ہے جس کی رُو سے اسلام کے مثالی تصوّرات کو زمان و مکان کی قوتوں میں منتقل کیا جاتا ہے. یہ درحقیقت ان بلند تصورات کو انسانی ہیئتِ اجتماعیہ میں منتقل کرنے کا نام ہے۔

اس مملکت میں، عبادت نام ہوتا ہے قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کرنے کا اور شرک سے مفہوم ہوتا ہے انسانوں کے خود ساختہ احکام و قوانین کی اطاعت. اقامتِ صلوٰۃ سے مقصود ہوتا ہے ایک ایسے معاشرہ کا قیام جس میں تمام افرادِ معاشرہ، ان قوانین کا از خود، بہ طیبِ خاطر اتّباع کرتے جائیںؔ. اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم ہوتا ہے تمام افرادِ معاشرہ (بلکہ عالمگیر انسانیّت) کو سامان نشو و نما مہیّا کرنا. اس میں امر بالمعروف کے معنی ہوتے ہیں ان احکام و ضوابط کا نافذ کرنا جنہیں قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے اور اُن سے قانوناً روکنا جنہیں وہ مذموم قرار دیتا ہے چنانچہ

ؔ اجتماعاتِ صلوٰۃ اسی نظام کا ایک گوشہ اور اسی مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہیں۔

اس سلسلہ میں علامہ اقبالؒ نے لکھا تھا کہ:-

اسلام تحت و تاج سے وفا شعاری کا مطالبہ نہیں کرتا۔ وہ صرف خدا (کے قوانین) سے عہدِ وفا استوار کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ (خطبات)

اور قائدِ اعظمؒ نے کہا تھا کہ:-

اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام و اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لیے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ (حیدرآباد دکن، ۱۹۴۱ء)

یہ ہے ایک اسلامی مملکت، کی تخلیق و تشکیل کی وجہ جواز اور یہ تھی وہ بنیاد جس پر مطالبۂ پاکستان کی عمارت استوار کی گئی تھی اور جس کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔

لوحِ سادہ

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ نبی اکرمؐ نے جب اسلام کی انقلابی دعوت پیش کی تو اس میں مخالفین کے ساتھ، سب سے بڑی وجہِ نزاع اور سب سے شدید سبب تصادم کیا تھا؟ انہیں زندگی کے اس نظامِ نو کی طرف دعوت دی جاتی تھی اور وہ اس کے جواب میں کہتے تھے کہ اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ (۴۳/۲۲) ہم اس نئے نظام کو اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہم اُسی مسلک پر چلتے رہنا چاہتے ہیں جو ہمارے اسلاف سے ہم میں متوارث چلا آرہا ہے۔ ہم انہیں کے نقوشِ قدم کا اتباع کریں گے۔ ہم اپنی روایاتِ کہنہ کو نہیں چھوڑنا چاہتے۔ اُن سے، اس کے جواب میں کہا جاتا کہ — اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰی مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ (۴۳/۲۴) جو کچھ تمہارے سامنے پیش کیا جاتا ہے، اگر یہ اس سے بہتر ہو جس پر تم اپنے آباؤ اجداد کی تقلید میں چلتے جا رہے ہو، تو کیا تم پھر بھی اپنے اسلاف کے مسلک ہی کو ترجیح دو گے؟ — وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہاں! ہم اُسی مسلک کا اتباع کریں گے۔ ہمیں کسی نظامِ نو کی ضرورت نہیں —

حَسۡبُنَا مَا وَجَدۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا (5/104) وہ مسلک ہمارے لئے ہر اعتبار سے کافی ہے؛ یہ تھی وہ بنیادی کشمکش جو اس قدر شدید تصادمات کا موجب بنی۔ جب ان مخالفین نے دیکھا کہ یہ نظام زور پکڑتا جا رہا ہے تو انہوں نے چاہا کہ اس سے کچھ مفاہمت کی صورت نکل آئے، یعنی کچھ باتیں اس نظامِ جدید کی لے لی جائیں اور کچھ ان کے مسلکِ آباء کی اور دونوں کے امتزاج سے ایک نظام وضع کر لیا جائے۔ لیکن، دین کے نقطۂ نگاہ سے ایسا کرنا شرک ہوتا اس لئے رسول اللہ سے بتاکید کہہ دیا گیا کہ — وَلَا تَرۡكَنُوۡۤا اِلَى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا (11/113) دیکھنا! ان لوگوں کی طرف ذرا سا بھی جھک نہ جانا۔ اگر تم نے ایسا کیا، تو فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ تمہاری جماعت بھی اسی عذاب میں گرفتار ہو جائے گی جس میں یہ لوگ ماخوذ ہیں اور جس سے نکالنے کے لئے انہیں اس نظام کی طرف دعوت دی جا رہی ہے۔

لہٰذا، ایک قرآنی مملکت کی تشکیل کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ ان تمام نظریاتِ حیات و تصوراتِ زندگی، ان تمام روایاتِ کہنہ اور مسالکِ قدیمہ کو الگ کر کے رکھ دیا جائے جو اس قوم میں متوارث چلے آ رہے ہیں۔ اس مملکت کا بنیادی پتھر — لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ — ہے۔ اس میں لَآ اِلٰهَ کے معنی یہ ہیں کہ تمام متوارث تصورات کو الگ کر کے، ہر شے کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے۔ اس کے بغیر، اس جدید نظام کی عمارت (جس کی بنیاد اِلَّا اللّٰهُ پر استوار ہوتی ہے) قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ؎

ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند　　　اول آں بنیاد را ویراں کنند

اسلام میں "بت پرستی" کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ بت تو فارسی زبان کا لفظ ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کے لئے اَوۡثَان کا لفظ آیا ہے جو وَثَن کی جمع ہے اور وَثَن کے معنی ہوتے ہیں جمود و تعطل، عدم حرکت، جامد و غیر متحرک ہو جانا — اس بنیادی مفہوم کے اعتبار سے ہر وہ تصور یا نظام جس میں حرکت نہ رہے اور جامد ہو جائے، وَثَن ہے۔ جب قرآنی ضابطۂ حیات کو عملی شکل دے دی جائے، تو اس سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جو حرکتِ پیہم اور سعیٔ مسلسل کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ "حرکتِ پیہم" کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرہ، قرآنِ کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے زمانہ کے بدلتے اور بڑھتے رہنے والے تقاضوں کا ساتھ دیتا چلا جاتا ہے یوں یہ نظام ایک ذی حیات تحریک (DYNAMIC MOVEMENT) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگر یہ کسی ایک مقام پر رک جائے، اس میں جمود پیدا ہو جائے تو یہ وثنیت ہو گی۔ یہ وہ وثن (بت) ہے جس کی پرستش وہ قومیں کرتی ہیں جن پر ذہنی جمود اور عملی تعطل چھا چکا ہو۔ حیرت ہے کہ ہم نے قرآنِ کریم کے اس عظیم نکتہ کو پسِ پشت ڈال دیا اور مغرب کے مفکرین کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ چنانچہ "وہائٹ ہیڈ" لکھتا ہے کہ

بت پرستی کی کنہ و حقیقت مروجہ خداؤں پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا ہے[1]

اس قسم کی بت پرستی میں، ایک زندہ اور متحرک نظامِ حیات کے تصورات و مناسک کی محض شکلیں باقی رہ جاتی ہیں۔ ان کے معانی و مفہوم ختم ہو جاتے ہیں۔ مذہب، دین کی ممی شدہ لاش ہوتا ہے۔ ان بے روح رسوم اور بے جان معتقدات سے چپکے رہنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق وہائٹ ہیڈ لکھتا ہے کہ

> زندگی کے بے جان پیکروں کے ساتھ چپکے رہنے کا نتیجہ سست رفتار زوال ہوتا ہے جس میں ان رسوم کو بلا نتیجہ دہرایا جاتا ہے........ اس سے تہذیب و ترقی کا محض سراب باقی رہ جاتا ہے، حقیقت غائب ہو جاتی ہے[2]

انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوان، بلا سوچے سمجھے اور بلا اختیار و ارادہ اپنے اسلاف کے مسلک پر چلے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں آگے بڑھنے اور کچھ اور بننے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ بکری کا بچہ بکری ہی بن سکتا ہے، اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ انسانی تاریخ میں ایسے ادوار آتے رہے جن میں تقلید کی ان برفانی سلوں کو توڑ کر کاروانِ انسانیت کے لئے آگے بڑھنے کا راستہ ہموار کیا گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج کا انسان بھی، اپنے اسلاف کی طرح، غاروں میں پڑا زندگی بسر کرتا۔ یاد رکھیئے! جوہرِ زندگی کی نمود، اپنے اختیار و ارادہ اور فکر و بصیرت سے، تعمیری کام سرانجام دینے سے ہوتی ہے۔ اگر وہ کام جنہیں عام طور پر نیکی کہا جاتا ہے، محض تقلیداً کئے جائیں، تو یہ انسانی زندگی میں نشو و ارتقاء کا موجب نہیں بن سکتے۔ انسانی زندگی میں (MORAL) تو خیر بڑی چیز ہے، اس میں (IMMORAL) ہونا اتنا تباہ کن نہیں جتنا ہلاکت آفریں (AMORAL) ہونا ہے۔ تقلید میں انسان (AMORAL) ہو جاتا ہے۔

یہی وہ جمود ہے جسے توڑنے کے لئے اقبالؒ کہتا ہے کہ۔

تراشِ از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہِ دیگراں رفتن عذاب است

---

1. (A.N. WHITEHEAD - ADVENTURE OF IDEAS P-12)
2. ایضاً۔ (P-358)

گر از دستِ تو کارِ نادر آید
گناہے ہم اگر باشد ثواب است

قرآن کریم نے جس کا جشنِ نزول منانے کے لئے ہم آج جمع ہوئے ہیں، اپنا تعارف کراتے یا یوں کہیئے کہ اپنے نزول کا مقصد بتاتے ہوئے کہا ہے کہ ـــــ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ (۹۷/۱) یعنی قرآن دنیا میں نئی اقدار لایا ہے۔ اس کی آمد سے ہیئتِ اجتماعیۂ انسانیہ کے تمام قدیم پیمانے اُلٹ گئے ہیں اور اُن کی جگہ ان نئے پیمانوں نے لے لی ہے۔ قرآن کی اولین مخاطب قوم کیطرف سے جو اس کی مخالفت ہوتی تھی تو اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے قدیم پیمانوں کو، جو ان کے اسلاف کی طرف سے متوارث چلے آرہے تھے، ان جدید پیمانوں سے بدلنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اقبالؒ نے جب پاکستان کا تصور دیا تھا تو اس مملکت کو وجود میں لانے کا مقصد یہ بتایا تھا کہ

> اس سے اسلام کو ایسا موقع میسر آجائے گا جس سے یہ اس ٹھپہ کو مٹا سکے گا جو عرب ملوکیت نے زبردستی اس پر لگا رکھا ہے۔ (خطبۂ الٰہ آباد)

روشِ کہن

ہمارا مروجہ مذہب، ہماری شریعت، ہمارا کلچر، ہماری روایات، ہمارا فلسفۂ حیات، ہمارے رسوم و مناسک، غرضیکہ ہر وہ شے جسے ہم اس وقت عام طور پر اسلامی کہہ کر پکارتے ہیں، عرب ملوکیت کے دور کی پیدا کردہ ہے۔ اقبالؒ نے اس کے لئے "عجمی اسلام" کی اصطلاح وضع کی تھی کیونکہ یہ پیدا تو عرب ملوکیت کے زمانہ (بالخصوص دورِ عباسیہ) میں ہوا تھا لیکن تھا عجم سے مستعار لئے ہوئے تصورات کا مجموعہ ـــــ اسی لئے حکیم الامت نے مروجہ اسلام پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

تمدن، تصوف، شریعت، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

پاکستان کی تشکیل سے مقصد، ان "بتانِ عجم" کو حریم کعبہ سے نکال کر، اسے خالصتہً "خدا کے گھر" میں تبدیل کرنا تھا۔ یعنی ہمارے ہاں "جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے" اس کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لے کر معاشرہ کو از سرِ نو مستقل اقدارِ خداوندی کے خطوط پر متشکل کرنا۔

مذہبی پیشوائیت

"بتانِ عجم" کے یہ پجاری ہمارے مذہبی پیشوا ہیں۔ آپ کو معلوم ہے (اور قرآن اس حقیقت کو بار بار سامنے لاتا ہے) کہ قرآنی نظام کی دعوت کی شدید ترین مخالفت

اہلِ کتاب کے مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہوئی تھی۔ مذہبی پیشوائیت، ماضی کی کہنہ اور فرسودہ روایات کے محافظ ہونے کے مقدّس سہاروں سے قائم رہتی ہے اور ان روایات کے ختم ہو جانے سے ان کا اپنا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ وہ روایات کو زندہ اس لئے رکھنا چاہتے ہیں کہ ان کی زندگی سے خود ان کی اپنی زندگی وابستہ ہوتی ہے۔ ورنہ انہیں ان روایات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ان کی کیفیت یہی ہوتی ہے کہ ؎

حکایتِ قدِ آں یارِ دلنواز کنم
بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

قرآنی نظام میں جب یہ فرسودہ روایات ہی باقی نہیں رہتیں تو اس میں مذہبی پیشوائیت کیسے باقی رہ سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو نبئ اکرمؐ اور خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں مذہبی پیشوائیت کا نام تک نہیں ملتا۔ اُس نظام میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر حکومت کا فریضہ تھا جو قرآنی معروفات کو قانوناً نافذ کرتی اور اس کے برعکس اقدامات کو قانوناً روکتی تھی۔

اگر قرآنی پاکستان میں، زندگی کو ایک لوحِ سادہ (CLEAN SLATE) سے شروع کیا جاتا جس میں فرسودہ عجمی تصورات کی قبروں کے مجاوروں کے لئے کوئی گنجائش نہ ہوتی اور ملّتِ پاکستانیہ، حضور نبئ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے اُن الفاظِ گرامی کو پورے حزم ویقین اور کامل وثوق واعتماد کے ساتھ، بانگِ دُہل دنیا کے سامنے دُہرا سکتی جنہیں آپؐ نے اپنے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا تھا کہ

الا ــ کل شئ من امر جاھلیت تحت قدمی موضوع۔

ہاں! زمانہ جاہلیت کے تمام آئین ودستور میرے پاؤں کے نیچے پامال ہیں۔

تو قرآنی پاکستان، اس عظیم انقلابی اعلان کی نشرگاہ ہوتا۔ اسی کے لئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

وقت آنست کہ آئینِ دگر تازہ کنیم
لوحِ دل پاک بشوئیم وزسر تازہ کنیم

(٭)

حاکم ومحکوم کا امتیاز

قرآنی مملکت میں، حاکم ومحکوم کا تصور نہیں ہوتا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اس مملکت کا بنیادی فریضہ امر بالمعروف

اور نہی عن المنکر ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ فریضہ امت کے کسی خاص گروہ کا قرار نہیں دیا، بلکہ ساری کی ساری اُمت کا قرار دیا ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۱۰) تم وہ بہترین اُمت ہو جسے ہم نے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے تشکیل کیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے، تقسیمِ عمل کے اصول کے مطابق مختلف کام مختلف افراد کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔ گویا یہ ایک ٹیم ہوتی ہے جو باہمی تعاون سے زندگی کو اس کی منزلِ مقصود تک لے جاتی ہے۔ اس میں، افسر اور ماتحت یا حاکم اور محکوم کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ الدّین یعنی قرآنی نظام کی خصوصیتِ کبریٰ یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (۸۲/۱۹) کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر نہ کسی قسم کا کوئی کنٹرول یا حقِ حکومت رکھے نہ کوئی کسی دوسرے کا محتاج ہو۔ اس میں تمام معاملات قوانینِ خداوندی کے مطابق طے پاتے چلے جائیں۔ اس میں کسی کو اس کا حق نہیں ہوتا کہ دوسرے سے کہے کہ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ (۳/۷۸) تم میرے محکوم ہو جاؤ۔ نہ کسی کا کوئی محکوم نہ محتاج۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

کس نباشد درجہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں، ایں است و بس

جب عہدِ فاروقی میں روم کا سفیر مدینہ آیا اور اس نے دریافت کیا کہ تمہارا بادشاہ کون ہے، تو صحابہؓ کی طرف سے اس کا جواب یہ ملا تھا کہ۔ ما لنا ملك. بل لنا امیر۔ ہمارا بادشاہ کوئی نہیں، ہمارا صرف امیر ہے۔ واضح رہے کہ لفظ امیر کے بنیادی معنی مشورہ کرنے والے یا راہ نمائی کرنے والے کے ہیں۔ امّت، جس شخص کے سپرد یہ امانت کرتی ہے، اس کا فریضہ کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق اُمت کے سب سے بڑے منتخب کردہ امیر، صدّیقِ اکبر نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں، ان الفاظ میں وضاحت کر دی تھی کہ:۔

یاد رکھو! تم میں سے ہر کمزور، طاقت ور ہے، جب تک میں اس کا حق نہ دلاؤں اور ہر طاقت ور کمزور ہے جب تک اس سے کمزور کا حق نہ لے لیا جائے۔

اس فریضہ کو حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں دہرایا تھا کہ

یاد رکھو! اگر کوئی شخص کسی پر زیادتی کرے گا تو میں اس وقت تک اسے نہیں چھوڑوں گا جب تک

اس کا ایک رخسار زمین پر ٹکا کر دوسرے رُخسار پر پاؤں نہ ٹکا دوں، تاآنکہ وہ حق کے سامنے سپر انداز ہو جائے۔ لیکن تم میں سے حقدار کے لئے میں اپنا رخسار زمین پر رکھ دوں گا۔

خلافت اور ملوکیت میں فرق

وہ اکثر لوگوں سے دریافت کرتے رہتے کہ میں کہیں خلافت سے رُوگردانی کر کے، بادشاہت کی طرف تو نہیں جا رہا۔ ایک دفعہ جب انہوں نے یہی سوال دہرایا تو ایک شخص نے جواب میں کہا کہ خلافت اور بادشاہت کا فرق بڑا نمایاں ہے۔ اس لئے اس میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہو سکتا کہ ہمارے ہاں خلافت ہے یا بادشاہت۔ خلیفہ تمام افرادِ معاشرہ کے حقوق کا محافظ ہوتا ہے اور بادشاہ ان کے حقوق میں ظلم اور جبر کرتا ہے۔ وہ ایک طرف سے لوٹتا ہے اور دوسری طرف (اپنے مقاصد کے لئے) خرچ کرتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ خلیفہ ہیں، بادشاہ نہیں۔

انہوں نے اپنے پہلے خطبہ میں کہا تھا کہ:-

> لوگو! میرے اوپر تمہارے جو حقوق ہیں، میں ان کی وضاحت کرتا ہوں۔ تمہارا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ تمہارے اموال میں سے کوئی چیز نہ لوں مگر قانونِ خداوندی کے مطابق اور جو کچھ لوں، اس میں سے کچھ خرچ نہ کروں مگر حق کے مطابق۔

اور یہ بھی کہا تھا کہ

> تمہارا مجھ پر یہ بھی حق ہے کہ جب تم مہمّات کے سلسلہ میں اپنے بچّوں سے دور ہو جاؤ تو میں ان بچّوں کا باپ بنوں۔

وہ کہا کرتے تھے کہ میری اور دیگر افرادِ معاشرہ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پارٹی سفر کے لئے نکلے تو سب لوگ اپنے پیسے ایک شخص کے سپرد کر دیں کہ وہ سفر کے سلسلہ میں ضروری اخراجات کرتا جائے اور اس کا حساب رکھے۔ لہٰذا مسلمانوں کے مال میں میرا حصّہ اتنا ہی ہے کہ کپڑوں کے دو جوڑے: ایک گرمی کا اور ایک سردی کا —— اور میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے اتنا کھانا جو قریش کے عام آدمی کی خوراک ہے۔

بیوی بچّے فتنہ نہ بن جائیں

اہل و عیال کے معاملہ میں ایک طرف قرآن نے انہیں زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۱۸/۴۶) کہا ہے۔ انہیں آنکھوں کی ٹھنڈک قُرَّةَ اَعْيُنٍ (۲۵/۷۴) کا موجب قرار دیا ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی بتا دیا ہے کہ یاد رکھو! اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (۸/۲۸) یہ انسان کے لئے بہت بڑی آزمائش کا موجب بن جاتے ہیں اور مقاصدِ حیات میں تمہارے سب سے بڑے

دشمن۔ اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ (۶۴/۱۴) یاد رکھو! تمہاری اولاد اور بیویاں بعض اوقات تمہاری سب سے بڑی دشمن ہوتی ہیں۔ تمہاری زندگی کے بڑے بڑے بلند مقاصد انہی کے ہاتھوں تباہ ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے تمہارے پاؤں میں ایسی لغزش آتی ہے کہ تم اپنے مقامِ بلند و رفیع سے گر کر چکنا چور ہو جاتے ہو۔ اس لئے فَاحْذَرُوْهُمْ ان سے بہت محتاط رہنا۔ قرآنی مملکت میں اس لغزش کی گھاٹی کو ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی ایک بیوی تھی جسے انکے مزاج میں بڑا دخل تھا۔ جب امورِ خلافت ان کے سپرد ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ امورِ مملکت میں دخیل ہوتی ہے اور بعض اوقات غلط سفارشات کر دیتی ہے جب اس نے تنبیہ کے باوجود اپنی اس عادت کو نہ بدلا تو آپ نے اُسے طلاق دے دی۔ اولاد کے بارے میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ عراق کے گورنر (حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ) نے ان کے دو لڑکوں (جناب عبداللہ اور عبیداللہ) کو کچھ رقم خزانہ میں داخل کرنے کے لئے دی۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہم اس رقم کو قرض سمجھ کر اس سے تجارت کر لیں اور پھر اصل رقم بیت المال میں جمع کرا دیں تو اس کی اجازت ہے؟ انہوں نے اجازت دے دی۔ جب حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ اس مال کی تجارت سے جو منافع ہوا ہے وہ بھی بیت المال میں داخل کرنا ہو گا۔ بیٹوں نے کہا کہ گورنر نے انہیں اس کی اجازت دے دی تھی۔ اس پر آپ نے پوچھا، کہ کیا اس نے کسی اور کو بھی اس قسم کی اجازت دی تھی یا تمہارے ہی ساتھ یہ رعایت برتی تھی؟ انہوں نے کہا کہ کسی اور کو تو اس قسم کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اس پر آپؓ نے کہا کہ اس نے یہ رعایت تمہیں امیر المومنین کے بیٹے ہونے کی وجہ سے دی ہے اور یہیں سے فساد کی ابتداء ہوا کرتی ہے۔ قرآنی مملکت میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس لئے میں اپنے فیصلے کو واپس نہیں لینا چاہتا ــــ اس باب میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب وہ امہات المومنینؓ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات) کو بیت المال سے کوئی چیز بطور تحفہ بھیجتے تو حضرت حفصہؓ کا حصہ آخر میں لگاتے کہ اگر مقدار میں کچھ کمی رہ جائے تو وہ ان کے حصہ میں ہو۔ یہ اسلئے کہ حضرت حفصہؓ، حضرت عمرؓ کی بیٹی بھی تھیں ــــ قحط کے زمانے میں آپ نے گلی میں ایک بچی کو دیکھا کہ بھوک سے نڈھال ہو رہی ہے۔ آپ کو اس سے بڑا صدمہ ہوا۔ کہا کہ کوئی پہچانتا ہے کہ یہ بچی کون ہے؟ بیٹا ساتھ تھا۔ اس نے کہا کہ یہ آپ کی پوتی (فلاں) ہے۔ آپ نے کہا کہ اس کی حالت ایسی کیوں ہو رہی ہے۔ اس نے کہا کہ قحط کی وجہ سے جتنا کچھ ملتا ہے اس میں یہ حالت نہ ہو گی تو اور کیا ہو گا ــــ؟ آپؓ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور کہا

کہ پھر جو حال قوم کے دوسرے بچوں کا وہی عمرؓ کی پوتی کا ہو گا۔ تنگی ہو گی تو سب پر اور کشادگی ہو گی تو سب کے لئے ——— ان کا دستور تھا کہ

جب مملکت میں کوئی امتناعی حکم نافذ کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے ان سے کہتے کہ میں نے فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے اور لوگ تمہاری طرف ایسے دیکھ رہے ہیں جیسے پرندے گوشت کی طرف۔ اگر تم محتاط رہو گے تو وہ بھی رہیں گے۔ اور اگر تم میں سے کسی نے ایسا کیا تو (اس وجہ سے کہ تمہارے اعمال کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے) تمہیں اُن سے دگنی سزا دوں گا اب تمہارا اختیار ہے چاہے آگے بڑھو اور چاہے پیچھے ہٹو۔ (تاریخِ عمر، ابنِ جوزی)

عدل

قرآنی مملکت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر ایک سے عدل ہوتا ہے۔ عدل کی ایک شکل یہ ہے کہ ہر متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ قانون کے مطابق کیا جائے اور اس میں کسی کی رُو رعایت نہ کی جائے یہی ہے وہ مملکت جس میں ہر صاحبِ اختیار سے یہ کہا جاتا ہے کہ ——— اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى ($\frac{38}{26}$) تمہیں مملکت میں صاحبِ اختیار اس لئے بنایا گیا ہے کہ تم لوگوں کے فیصلے حق کے ساتھ کرو اور اس میں اپنے جذبات کو کبھی دخیل نہ ہونے دو یہاں کہا گیا ہے کہ لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ حق کے ساتھ کرو۔ یہ نکتہ بڑا غور طلب ہے۔ عدل کا عام تصوّر یہی ہے کہ اگر معاملات کا تصفیہ ملک کے رائج الوقت قانون کے مطابق ہو تو کہا جائے گا کہ عدل کا تقاضا پورا ہو گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر خود وہ قانون جس کے مطابق فیصلہ ہوا ہے عدل پر مبنی نہیں ہو گا تو اس کے مطابق فیصلہ کو مبنی بر عدل کیسے کہا جائے گا؟ اگر قانون کے استعمال میں جذبات اثر انداز ہو سکتے ہیں تو قانون سازی میں جذبات کیوں اثر انداز نہیں ہو سکتے! یہ وجہ ہے کہ قرآنی مملکت میں قانون سازی کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں تمام قوانین، اصولی طور پر خدا کے متعیّن فرمودہ (قرآن کی دفتین کے اندر محفوظ) ہوتے ہیں اور مملکت کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان قوانین کو اپنے زمانے کے حالات کے مطابق نافذ العمل بنائے۔ قرآن کریم کا تعارف، سب سے پہلی آیت میں، الکتاب کہہ کر کرایا گیا ہے۔ الکتاب ضابطۂ

قوانین کو کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں چند ایک قوانین تفصیلی طور پر دیئے گئے ہیں اور باقی تمام قوانین اصُولی طور پر درج ہیں۔ ان اصولی قوانین کی جزئیات، ہر زمانے کی اُمّت، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشاورت سے مرتّب کریگی۔ ان جزئیات، (یا بائی لاز) میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق تغیر و تبدل ہوتا رہے گا لیکن اصولی قوانین ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔ ان میں تبدیلی کا حق کسی ایک فرد یا پارلیمان تو ایک طرف ساری دنیا کی آبادی کو بھی حاصل نہیں ہوگا۔ جو مملکت قرآنی قوانین کے مطابق فیصلے کریگی اُسے اسلامی مملکت کہا جائے گا۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ٥ (۵/۴۴)

جو خدا کی طرف سے نازل کردہ کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

لہٰذا، قرآنی مملکت میں ہر فیصلہ قرآنی قوانین کے مطابق ہوتا ہے اور ان قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے میں نہ فیصلہ کرنے والے کے ذاتی رُجحانات و میلانات اثر انداز ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کے خارجی مؤثرات دخیل کار۔

يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (۲/۴۸)

اُس دور میں کوئی شخص (قانون کے مقابلہ میں) کسی دوسرے شخص کے کام نہیں آسکے گا۔ نہ ہی کسی کی سفارش مجرم کو بچا سکے گی، نہ ہی اس سے کچھ لے لوا کر اُسے چھوڑ دیا جائے گا۔ نہ ہی کوئی کسی اور طرح مجرم کی مدد کر سکے گا۔

اس میں مجرم چھپا نہیں رہ سکتا، دور سے پہچانا جا سکتا ہے — يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ (۵۵/۴۱) "اس میں مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے"۔ اس میں انتظام ایسا ہوتا ہے کہ مجرم، شریف انسانوں سے بالکل الگ نظر آئیں گے — وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (۳۶/۵۹) تاکہ کوئی ایسے لوگوں سے دھوکا نہ کھا سکے۔ اس میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی مجرم، مواخذہ سے بچ جائے یا کوئی بے گناہ یونہی دھر لیا جائے۔ لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا (۶/۱۶۵) اس میں ہر شخص اپنے اعمال کے مطابق بدلہ پاتا ہے — وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۶/۱۶۵) اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

قرآنی مملکت میں بڑی سے بڑی شخصیت بھی قانون کے دائرے سے باہر نہیں ہوتی۔ اس باب میں، اور تو اور، خود حضور رسالتمآبؐ کی زبانِ اقدس سے بھی یہ اعلان ہوتا ہے کہ

اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۶/۱۵)

اگر میں بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کے مواخذہ سے سخت ڈرتا ہوں۔

اور اس کے بعد فرمایا کہ اگر میری چہیتی بیٹی ـــــ فاطمہؓ ـــــ بھی قانون شکنی کرے تو میں اسے بھی سخت سزا دوں گا۔ جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ مصر کے گورنر نے، ان کے بیٹے کو وہ سزا جو پبلک کے سامنے دینی چاہیئے تھی، پرائیویٹ مکان میں دی ہے تو آپ نے بیٹے کو بلوا کر، اسے از سرِ نو، پبلک میں سزا دی ـــ جب اسی مصر کے گورنر کے بیٹے نے ایک مصری کو کسی بات پر یہ کہہ کر ہنٹر سے پیٹا کہ تم بڑے آدمیوں کی اولاد سے گستاخی سے پیش آتے ہو، تو آپ نے، گورنر، اس کے بیٹے اور اس مصری کو مدینہ بلوا بھیجا، مصری کے ہاتھ میں ہنٹر دیا اور کہا کہ اسے اُسی طرح مار و اور کہو کہ تم نے دیکھ لیا کہ بڑوں کی اولاد کا حشر کیا ہوتا ہے؟ اس کے ساتھ ہی اس گورنر کو بھی تادیب کی کہ اگر تم نے بیٹے کی تربیت صحیح کی ہوتی تو اس کے سر میں یہ خنّاس کیوں سمایا ہوتا کہ وہ بڑوں کی اولاد ہے اس لئے اُسے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا حق حاصل ہے۔ خود حضرت عمرؓ کو ایک مرتبہ ایک عدالت میں پیش ہونے کا اتّفاق ہوا تو جج نے انہیں امتیازی مقام پر بیٹھنے کی پیشکش کی۔ آپ نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا اور مدعی کے برابر بیٹھ گئے۔ مقدّمہ ختم ہونے کے بعد، آپ نے جج کو لکھا کہ تم جج بننے کے قابل نہیں ہو سکتے جب تک تم امیر المومنین اور ایک عام شہری کو یکساں نہ سمجھو۔

قرآنی مملکت میں یہ کیفیت تو عدالت کی ہوتی ہے لیکن اس میں مناسب تعلیم و تربیت سے خود افرادِ معاشرہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر ان سے کبھی کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو وہ خود اپنے آپ کو اپنے جرم کی سزا کے لئے پیش کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا ایمان یہ ہوتا ہے کہ ارتکابِ جرم کا کوئی اور شاہد ہو یا نہ ہو، خود خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل سب سے بڑا گواہ ہوتا ہے۔ وہ گواہ جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

یَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ (۴۰/۱۹)

وہ نگاہ کی خیانت اور دل کے اندر گذرنے والے خیالات تک سے واقف ہوتا ہے۔

یہی تھی وہ تعلیم جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک رات حضرت عمرؓ، حسبِ دستور، افرادِ معاشرہ کے حالات کا براہِ راست مطالعہ کرنے کے لئے گشت کر رہے تھے کہ آپ نے سنا کہ ایک خیمہ کے اندر، ماں اپنی بیٹی

سے کہہ رہی ہے کہ دودھ میں تھوڑا سا پانی ملا کر اسے چولہے پر چڑھا دو۔ بیٹی نے کہا کہ امّی! میں دودھ میں پانی نہیں ڈالوں گی کیونکہ خلیفہ نے اس سے منع کیا ہے۔ ماں نے جواب دیا کہ پانی ڈال دو، خلیفہ اس وقت کہاں دیکھ رہا ہے۔ لڑکی نے کہا کہ خلیفہ تو نہیں دیکھ رہا لیکن وہ خدا تو دیکھ رہا ہے جس کا حکم خلیفہ نے ہم تک پہنچایا ہے۔

خلیفہ نے گھر آکر بیوی سے کہا کہ صبح اُس خیمہ میں جاؤ اور اس لڑکی کی ماں سے لڑکی کا رشتہ مانگ لو۔ ایسی بچی جس گھر میں آجائے گی، وہ گھر نور سے بھر جائے گا۔

لیکن افرادِ معاشرہ میں اس قسم کی تبدیلی اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب پہلے برسرِ اقتدار طبقہ خود

پہل کہاں سے ہو؟

اپنے کیریکٹر میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرے۔ لوگ قانون کی اطاعت کرتے ہی اُس وقت ہیں جب اُن کے اربابِ حل و عقد خود قانون کی اطاعت کریں۔ اسی طبقہ کے بگڑنے سے ساری قوم بگڑتی ہے اور اسی کے سنورنے سے ساری قوم سنور جاتی ہے جب حضرت صالحؑ کو قومِ ثمود کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا تو آپ نے دیکھا کہ قوم تمام کی تمام بگڑی ہوئی ہے اس کی اصلاح کی صورت کیا ہو گی؟ تو خدا کی طرف سے جواب ملا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں کَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ (۲۷/۴۸)، مملکت کے مرکز میں قوم کے نو سرغنے ہیں اور وہی سارے فساد کا موجب ہیں اور قوم کے معاملات کو سنورنے نہیں دیتے۔ اگر وہ راہِ راست پر آجائیں تو ساری قوم سنور جائے گی۔ یہی تھی وہ حقیقت جسے حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ

> عوام میں اس وقت تک ٹیڑھ پیدا نہیں ہوتی جب تک ان کے لیڈر سیدھے رہتے ہیں۔ جب تک داعی اللہ کی راہ میں چلتا ہے، رعایا اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ جہاں اس نے پاؤں پھیلائے، رعایا اس سے پہلے پاؤں پھیلا دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنی مملکت میں، امیر کی اطاعت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرے۔ قرآن کریم نے اس باب میں واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ۔۔ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا۔۔ جو ہمارے قوانین کو فراموش کر دے۔۔ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ اور اپنے مفاد اور جذبات کے پیچھے لگ جائے وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (۱۸/۲۸) اور یوں اس کے معاملات قاعدے اور قانون کی حدود سے تجاوز کر جائیں، تو اُس کی اطاعت مت کرو۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا تھا کہ

اگر ایک ناک کٹا سیاہ فام حبشی بھی تمہارا امیر ہو تو جب تک وہ کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے، تم اس کے حکم کو سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ (مسلم)

اسی اصول کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے پہلے خطبۂ صدارت میں، ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ:-

تم میری اطاعت اس وقت تک کرو جب تک میں اللہ کے احکام کی اطاعت کروں۔ اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت فرض نہیں۔

اور حضرت عمرؓ نے اسے ان الفاظ میں دہرایا تھا کہ

یاد رکھو! کوئی صاحب اقتدار دنیا میں اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا کہ وہ اگر خدا کے قوانین کی خلاف ورزی کرے تو اس کی اطاعت کی جائے۔

یہ اس لئے کہ قرآنی مملکت میں اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی ہوتی ہے، کسی انسان کی نہیں۔ ان کا امیر ان قوانین کے مطابق معاشرہ متشکل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر وہ خود ہی ان قوانین کی اطاعت نہ کرے، تو دوسرے اس کی اطاعت کس طرح کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظام کے داعیٔ اوّل ــــ حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرما دیا کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۱۶۳ "سب سے پہلے میں خود اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔"

اس مقام پر اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ امیر کی اطاعت اس وقت تک ہے جب تک وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر ایک کو اس کا اختیار دے دیا جائے کہ جس وقت وہ سمجھے کہ امیر نے خدا کے کسی حکم کی اطاعت نہیں کی وہ بغاوت کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔ اس سے تو انارکی پھیل جاتی ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ قرآنی مملکت کے آئین میں اس قسم کا ضابطہ ہوگا جس کی رُو سے خود امیرِ مملکت کے اقدامات پر نگاہ رکھی جائے گی اور جونہی وہ حد سے تجاوز کرے، آئینی اور قانونی طور پر اس کا مواخذہ ہو سکے گا اور اگر وہ مجرم ثابت ہو گا تو اس کی جگہ دوسرا امیر مقرر کر دیا جائیگا۔

سوشل جسٹس

یہ تھا عدل ــــ یعنی قانون کے مطابق چلنے کا ایک گوشہ ــــ اس کا دوسرا گوشہ وہ ہے جسے آجکل

کی اصطلاح میں عدلِ عمرانی (SOCIAL JUSTICE) کہا جاتا ہے۔ سوشل جسٹس کی اصطلاح آجکل بڑی عام ہو رہی ہے اور اس کا ہر جگہ چرچا سنائی دے گا۔ لیکن اس اصطلاح کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس کے متعلق ابھی تک متفق علیہ کچھ نہیں کہا گیا۔ یہ اصطلاح بھی، سوشلزم کی طرح، ہر ذہن میں الگ مفہوم کی حامل ہے۔ بنیادی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس سوسائٹی کو مبنی بر عدل ((JUST)) کہا جائے گا جس میں ہر فرد کو وہ کچھ مل جائے جس کا وہ حقدار ہے۔ لیکن یہیں سے پھر دوسرا سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ کس طرح متعیّن کیا جائے کہ کوئی شخص کس چیز کا حقدار ہے۔ مختلف افراد کے حق (یا واجب، (DUE)) کا تعیّن، پہلے سوال سے بھی زیادہ مشکل ہے اور اسی سے ساری پیچیدگیاں اُبھرتی ہیں۔ ایک طرف سے جواب ملتا ہے کہ ایک شخص صرف اس کا حقدار ہے جو اسے معقول اخلاقی اصولوں (VALIC MORAL PRINCIPLES) کے مطابق ملے۔ لیکن یہ اخلاقی اصول کیا ہیں، یہ سوال پھر بحث طلب رہ جاتا ہے۔ اس موضوع پر جو کچھ اس وقت تک میری نظروں سے گزرا ہے، اس میں (EMIL BURNER) کا پیش کردہ مفہوم میرے نزدیک سب سے زیادہ صحیح ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

> جو شخص فی الواقع سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل (JUST) اور فلاں ظلم پر مبنی (UNJUST) ہے، وہ درحقیقت کہتا ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم و رواج سے ماوراء ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جا سکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق، الوہیاتی معیار موجود ہے ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا جو ایک کے نزدیک قابلِ قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابلِ تسلیم۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حقِ مطلق ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض جھوٹے نگوں کی مینا کاری اور ملمّع سازی ہوگی۔ (JUSTICE AND THE SOCIAL ORDER)

رزق کا حق

قرآن کی رُو سے عدل کی تعریف اسی قسم کی ہے، یعنی کسی شخص کو وہ کچھ مل جانا جس کا وہ، از رُوئے قوانینِ خداوندی، حقدار ہے، عدل کہلائے گا۔ اور یہ قوانین، قرآن کے اندر موجود ہیں۔ لہٰذا قرآن کی رُو سے سوشل جسٹس کے معنی ہونگے، ہر شخص کو اس کا قرآنی حق ادا کر دینا۔ قرآنی مملکت اس قسم کے سوشل جسٹس کو عملاً بروئے کار لانے کی ایجنسی ہے۔ ان ابدی اور غیر مشروط حقوق میں قرآن نے

سب سے پہلے، ہر ذی حیات کے لئے رزق کا حق شامل کیا ہے۔ رزق کے معنی ہیں تمام وہ سامان اور ذرائع جن سے انسان کی جسمانی پرورش اور اس کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔ اس حق کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے کہ:-

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (۱۱/۶)

سطحِ ارض پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمّہ داری خدا پر نہ ہو۔

قرآنی مملکت، جو خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے، خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا فریضہ اپنے اوپر لیتی ہے۔ اس لئے تمام افرادِ معاشرہ سے واضح الفاظ میں کہتی ہے کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ ۚ (۶/۱۵۲)

(تم مطمئن ہو کر بلند مقاصدِ حیات کے حصول کے لئے کوشاں رہو) ہم تمہارے رزق کے بھی ذمّہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

ہمارے ہاں یہ بحث اکثر وجہ نزاع بنی رہتی ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ وہ سرمایہ دارانہ ہے رفاہی ہے یا اشتراکی — لیکن ہم اگر قرآنی مملکت کی اس عظیم ذمہ داری کو سامنے رکھیں جسے مندرجہ بالا آیت میں متعیّن کیا گیا ہے تو بات نکھر کر سامنے آجاتی اور سارا مسئلہ صاف ہو جاتا۔ اسلام میں معاشی نظام کا انداز کچھ اہمیت نہیں رکھتا، کیونکہ وہ مقصود بالذات نہیں۔ سوال سارا یہ ہے کہ وہ ذمّہ داری جسے مملکت اپنے سر پر لیتی ہے۔ وہ کس طرح کے معاشی نظام سے پوری ہو سکتی ہے — یعنی تمام افرادِ معاشرہ اور ان کی اولاد کے سامانِ زیست کی ذمہ داری — اسی کو ایتائے زکوٰۃ کہتے ہیں، یعنی نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما فراہم کرنا۔ اور جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے، یہ قرآنی مملکت کے قیام کا بنیادی مقصد ہے، ظاہر ہے کہ مملکت اتنی عظیم ذمّہ داری سے عہدہ برآ ہو نہیں سکتی جب تک رزق کی پیداوار کے ذرائع اس کی تحویل میں نہ ہوں۔ رزق کی پیداوار کا بنیادی ذریعہ، زمین ہے اور قرآن کی رُو سے زمین پر — جو خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ، انسانوں کی پرورش کے لئے عطا ہوئی ہے — انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا — اسے قرآن نے سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (۴۱/۱۰) قرار دیا ہے، یعنی اسے تمام ضرورتمندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے، کسی کی ملکیت میں نہیں چلا جانا چاہیے۔ اسی حقیقت کو نبی اکرمؐ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے۔ اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیئے

اس سلسلہ میں آپ نے پہلا اصلاحی قدم یہ اٹھایا کہ زمینداری کے نظام کو ختم کر کے یہ فیصلہ کر دیا کہ زمین کاشتکار کے پاس رہے گی اور وہ بھی اتنی جتنی وہ خود کاشت کر سکے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ کے زمانے میں عراق کی وسیع و عریض زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں آئیں تو ان کی تقسیم کے سوال پر اچھی طرح بحث ہوئی اور بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ انہیں افراد میں تقسیم نہ کیا جائے بلکہ مملکت کی تحویل میں رکھا جائے۔ چنانچہ مملکت کی طرف سے اعلان کر دیا گیا کہ — لَنَا رَقَابُ الْاَرْضِ — زمین مملکت کی رہے گی۔ زمین کی ملکیت یا تحویل

ربوٰا کا مفہوم

کے بعد، سب سے اہم سوال، حصولِ دولت کا ہے عصرِ حاضر میں معیشت کا یہ مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ معاوضہ محنت، (LABOUR) کا ہونا چاہیئے یا سرمایہ CAPITAL کا اور جس انداز سے اس سوال پر بحث ہوتی ہے اس سے ایسا نظر آتا ہے گویا یہ سوال دنیا کے سامنے پہلی مرتبہ آیا ہے۔ حالانکہ اربابِ فکر و نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ قرآن کریم نے اس سوال کو مدّت ہوئی، حل کر کے رکھ دیا تھا۔ قرآن نے ربوٰ کو حرام قرار دیا ہے اور حرام بھی اس شدّت کا کہ اس کے لئے کہا گیا ہے کہ ایسا کرنا خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ ربوٰ کا ترجمہ ہمارے ہاں سود کیا جاتا ہے — اور اس ترجمہ کی بنا پر یہ بحثیں چل نکلی ہیں کہ تجارتی سود (COMMERCIAL INTEREST) اور بنکوں کا سود وغیرہ جائز ہے یا نہیں۔ آپ ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے کہ قرآن نے ربوٰ کے علاوہ اور بھی بہت سی باتوں کو حرام قرار دیا ہے لیکن ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو مجرم قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس ربوٰ کی یہ کیفیت ہے کہ اسے حرام قرار دیتے ہوئے کہا کہ — وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا — ربوٰ میں سے جو کچھ کسی کے ذمہ باقی ہے اسے چھوڑ دو۔ اور اس کے بعد کہا کہ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ (۲/۲۷۹) اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اسے خدا اور رسولؐ (اسلامی نظام) کی طرف سے اعلانِ جنگ سمجھ لو۔ اس سے آپ دیکھئے کہ ربوٰ اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کے ارتکاب کو نظامِ مملکت کے خلاف اعلانِ جنگ قرار دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے — ربوٰ کے معنی ہیں "سرمایہ پر بڑھوتی" — (سود تو صرف اس کی ایک شکل کا نام ہے) قرآن جس قسم کا نظام قائم کرنا چاہتا ہے اس میں سرمایہ کے معاوضہ کا اصول ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا، ربوٰ کا مرتکب اسلامی مملکت کے اس نظام کے علی الرغم دوسرا نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مملکت کے نظام کے خلاف دوسرا نظام قائم کرنا کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ اس لئے اسے "خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا قرآنی مملکت میں ایسا نظام جس میں سرمایہ کا معاوضہ لیا جائے، حرام ہی نہیں بلکہ مملکت

کے خلاف بغاوت ہے۔ اس میں معاوضہ صرف محنت کا ہوگا، سرمایہ کا نہیں ہوگا خواہ اس کی کوئی شکل ہو۔ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳/۳۹)۔ یعنی انسان صرف اس کا حقدار ہے جس کے لئے وہ محنت کرے۔ اس کے نظام کا بنیادی اصول ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ جب سرمایہ پر کچھ وصول ہی نہیں کیا جا سکے گا تو فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) کی، جو نظامِ سرمایہ داری کی اصل دبنیاد ہے، کوئی قیمت ہی نہیں رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ضرورت سے زیادہ سب کچھ دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دے دینے کا حکم دیا ہے۔ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۥ قُلِ الْعَفْوَ ط (۲/۲۹) تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زیادہ ہے، سب کا سب۔ اسی کی تفسیر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کی وہ حدیث کرتی ہے جس میں حضرت بلال رضؓ نے کہا کہ

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جو رزق تجھے عطا کیا گیا ہے اسے چھپا کر نہ رکھو اور اس میں سے جو کچھ تجھ سے مانگا جائے اسے مت رد کرو۔ میں نے کہا یا رسول اللہ! یہ کیسے ممکن ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ یا تو ایسا کرنا ہوگا یا جہنم کا ایندھن بننا پڑے گا۔ (حاکم)

دولت کی تقسیم

اِس وقت دنیا میں اشتراکی نظام (کمیونزم) کا بڑا شہرہ ہے۔ اس نظام کا سنگِ بنیاد یہ اصول بتایا گیا ہے:-

(FROM EACH ACCORDING TO HIS CAPACITY; TO EACH ACCORDING TO HIS NEEDS)

یعنی ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے اور اس کی ضروریات کے مطابق اسے دیا جائے۔

اشتراکیت کا یہ اصول اس وقت تک محض ایک نظری اصول ہی ہے۔ اس پر عمل کہیں نہیں ہو رہا۔ جن ممالک کو اس وقت کمیونسٹ کہا جاتا ہے ان میں بھی کمیونزم کا نظام رائج نہیں، سوشلزم کا نظام رائج ہے۔ اس لئے ہنوز کمیونزم کا مندرجہ بالا اصول شرمندۂ معنی نہیں ہوا۔ لیکن اس اصول پر آج سے چودہ سو سال پہلے حجاز کی قرآنی مملکت میں عمل بھی ہو چکا ہے۔ اس میں شروع میں مالِ غنیمت کی تقسیم ہوئی تھی تو اس تقسیم میں رسول اللہؐ کا دستور یہ تھا کہ آپ غیر شادی شدہ کو ایک حصّہ دیتے تھے اور شادی شدہ کو دگنا حصّہ کیونکہ اس

کی ضروریات زیادہ ہوتی تھیں۔ اس کے بعد جب افرادِ مملکت کے وظائف مقرر کر دیئے گئے تو ان میں بھی یہی اصول کارفرما رکھا گیا۔ یہ اس لیے کہ تمام افرادِ معاشرہ کو رزق — یعنی سامانِ زیست — مہیّا کرنا اس مملکت کا فریضہ تھا۔ اس میں کوئی دوسرا اصول نافذ العمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس مملکت نے ایسا معاشرہ قائم کرنا تھا جس میں کیفیت یہ ہو کہ — اَلَّا تَجُوْعَ فِیْھَا وَلَا تَعْرٰی۔ وَ اَنَّکَ لَا تَظْمَؤُا فِیْھَا وَلَا تَضْحٰی (۲۰/۱۱۹-۱۱۸) نہ کوئی شخص بھوک اور پیاس کی وجہ سے پریشان ہو اور نہ ہی وہ لباس اور مکان سے محروم رہے۔ یہ ہر فرد کی کم از کم بنیادی ضروریاتِ زندگی ہیں جن سے قرآنی مملکت میں کوئی بھی محروم نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس معاشرہ میں صرف انہی بنیادی ضروریات پر اکتفا کیا جاتا ہے اور دیگر سامانِ آسائش و زیبائش سے محرومی ہوتی ہے۔ جوں جوں اس معاشرہ میں ترقی ہوتی جاتی ہے اس کا نقشہ جنّتی بنتا جاتا ہے جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ — وَلِبَاسُھُمْ فِیْھَا حَرِیْرٌ (۲۲/۲۳) نہایت اعلیٰ درجہ کے ریشمی ملبوسات — ثِیَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ (۱۸/۳۱) و بیز و لطیف ریشم کے زرکار پردے۔ — سُرُرٍ مَّوْضُوْنَۃٍ (۵۶/۱۵) — مرصّع اور نرم و نازک صوفے۔ بِاٰنِیَۃٍ مِّنْ فِضَّۃٍ وَّ اَکْوَابٍ کَانَتْ قَوَارِیْرَا (۷۶/۱۵) — چاندی کے برتن اور بلّوریں آبخورے۔ غرضیکہ — نَعِیْمًا وَّ مُلْکًا کَبِیْرًا (۷۶/۲۰) عظیم مملکت اور اس میں سامانِ آسائش نہایت فراواں۔ اور پھر یہ سامانِ آسائش و آرائش کسی خاص طبقہ کے لئے مخصوص نہیں ہوگا بلکہ ہر فردِ معاشرہ کے لئے یکساں۔ قرآن میں آپ شروع سے آخیر تک دیکھ جائیے اس میں کہیں یہ نہیں لکھا ملے گا کہ جنّتی زندگی کی یہ آسائشیں ایک خاص طبقہ کے لئے ہوں گی اور عوام ان سے محروم رہیں گے قرآنی مملکت کے جنّتی معاشرہ میں یہ تمام سامان ہر ایک کو میسّر ہوگا۔ اس میں سب کا معیارِ زندگی اتنا بلند ہوگا۔ جنت کا کوئی گوشہ جہنّم نہیں ہو سکتا۔

دنیا میں آپ عام اخلاقی برائیوں پر غور کیجئے۔ ان کے اوّلین سرچشمے دو ہی نظر آئیں گے، یعنی افراطِ زر یا افلاس و نکبت۔ افراطِ زر سے سرکشی و طغیانی کے فساد انگیز معائب ظہور پذیر ہوتے ہیں اور نکبت و افلاس سے پستی و دنائت کے انسانیّت کش عیوب و ذمائم۔ جب قرآنی مملکت کے جنّتی معاشرہ میں نہ افراطِ زر ہوگا نہ افلاس و زبوں حالی، تو ظاہر ہے کہ اس میں، ان سے پیدا ہونے والے عیوب و ذمائم کا بھی وجود نہیں ہوگا — حسد، کینہ، انتقام، تنگ نظری، حرص، ہوس، فریب کاریاں، مکاریاں سازشیں — اور دوسری طرف بے حمیّتی، بے غیرتی، ذلتِ نفس، تملّق، خوشامد، منافقت وغیرہ، یہ سب عیوب معاشرتی ناہمواریوں کی وجہ سے پیدا

ہوتے ہیں۔ جب یہ ناہمواریاں مٹ جائیں تو ان وجہِ ننگِ انسانیت بدنہادیوں اور بدلگامیوں کا بھی وجود باقی نہیں رہتا۔ اس معاشرہ کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ — لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِیْمًا اس میں نہ لغویت اور بیہودہ پن ہوتا ہے، نہ کوئی ایسی حرکت جس سے کسی کے دل میں افسردگی و اضمحلال پیدا ہو۔ اِلَّا قِیْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (۵۶/۲۶) اس میں ہر طرف سے سلامتی کی نشیدِ دلنواز و آہنگِ جاں افروز سنائی دیتی ہے، وَ نَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ (۷/۴۳) ان کے سینے تمام ایسی کثافتوں سے پاک و صاف ہوں گے جنہیں انسان، غلط معاشرہ میں، دل میں چھپائے رکھتا ہے۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہوگی جسے ایک دوسرے سے چھپانے کی ضرورت پڑے۔ تکریمِ انسانیّت اور احترامِ آدمیّت وہاں کا عام اندازِ نگاہ ہوگا۔ وہاں نہ کوئی کسی کو ذلیل سمجھے گا نہ ذلیل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس معاشرہ کا اندازہ وہ ہوگا جس کا نقشہ اقبال نے (جاوید نامہ میں) ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ؎

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش!
خوبروئے و نرم خوئے و سادہ پوش!

فکرِ شاں بے درد و سوز اکتساب — رازدانِ کیمیائے آفتاب
کس ز دینار و درم آگاہ نیست — این بُتاں را در حرمہا راہ نیست
خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر — کارہا را کس نمی سنجد بزر
سخت کش دھقاں چراغش روشن است — از نہابِ دِہ خدایاں ایمن است
کِشت و کارش بے نزاعِ آبجوست! — حاصلش بے شرکتِ غیرے از دست
اندراں عالم نہ لشکر نے قشوں — نے کسے روزی خورد از کشت و خوں
نے قلم در مغربیں گیرد فروغ — از فنِ تحریر و تشہیرِ دروغ

نے ببازاراں ز بے کاراں خروش!
نے صداہائے گدایاں دردِ گوش!

آخر میں اقبال نے اس تمام تفصیل کو ایک شعر میں اس طرح سمٹا دیا ہے کہ اس کے بعد اس سلسلہ میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی، یعنی قرآنی مملکت وہ ہے کہ ؎

کس دریں جا سائل و محروم نیست — عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

إِنَّ هٰذِهٖۤ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (۲۱/۹۲) اوپر ایک خدا جس کی اطاعت کا قلادہ زیبِ گلو اور نیچے ساری اُمّت ایک صف میں دوش بدوش ایستادہ۔ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز۔۔۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳/۷۸) اس میں کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا خواہ اُسے ضابطۂ قوانین اور حکومت، حتیٰ کہ نبوّت بھی کیوں نہ مل جائے کہ وہ لوگوں کو اپنا محکوم بنائے اور ظاہر ہے کہ کسی کو محکوم بنانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اُسے محتاج بنا دیا جائے جب قرآنی مملکت میں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوگا تو وہ کسی کا محکوم کس طرح سے ہوگا۔

اس قرآنی معاشرہ کی تشکیل کی ابتدا ارباب نظم ونسق کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا یہ قول، قولِ فیصل کا حکم رکھتا ہے کہ:

> اگر میں پیٹ بھر کر کھڑا ہو جاؤں اور دیگر افرادِ معاشرہ بھوکے ہوں تو اس کے ایک ہی معنی ہیں کہ میں عوام کا اچھا رکھوالا نہیں ہوں۔۔۔ خدا کی قسم! اگر دجلہ کے کنارے ایک کتّا بھی بھوکا مر جائے، تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پُرس ہوگی۔

اور حضور نبیؐ اکرم کا یہ ارشادِ گرامی کہ

> جس بستی میں کسی ایک شخص نے بھی رات بھوکے بسر کی ہو تو اس بستی سے خدا کی حفاظت کا ذمّہ ختم ہو جاتا ہے۔

اس لئے قرآنی مملکت کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ اگر کسی بستی میں کوئی شخص بھوک سے مر جائے تو اس بستی کے باشندوں کو اس کا قاتل سمجھا جاتا ہے اور ان سے اس کا خوں بہا وصول کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ قرآنی مملکت کا یہ نظام اسی صورت میں قائم رہ سکتا اور بہ حُسن وخوبی چل سکتا ہے، جب اس کے عمّال (کارندے) دیانتدار اور قابل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ بار بار اس قسم کی تاکیدی ہدایات جاری کرتے رہتے تھے کہ:۔

> یاد رکھو! جس شخص کے سپرد امّت کا کوئی اقتدار ہوا اور پھر اُس نے قابلیت کے بجائے اپنی محبّت یا قرابت کی بنا پر کسی کو مسلمانوں کا حاکم بنا دیا، تو اس نے اللہ اور اس کے رسولؐ اور مسلمانوں سے غداری کی۔

اس باب میں ان کی احتیاط کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ انہیں ولایتِ کوفہ

کے لئے ایک خاص ٹائپ کے کارکن کی ضرورت تھی جو بسیار کوشش کے باوجود مل نہیں رہا تھا۔ ایک شخص نے ان سے کہا کہ میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں جو ان خوبیوں کا مالک ہے۔ آپ اسے منتخب کرلیں۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اس نے کہا کہ آپ کا بیٹا ـــ عبداللہ ـــ یہ سن کر انہوں نے کہا کہ قاتلک اللہ۔ خدا تجھے غارت کرے تو مجھے یہ کس قسم کا مشورہ دے رہا ہے! عبداللہ ابن عمرؓ بے شک ان خوبیوں کے مالک تھے، لیکن حضرت عمرؓ کو اس کا احساس تھا کہ اگر اس کی طرح پڑ گئی تو اس کا انجام کس قدر تباہ کن ہوگا۔ مملکت کے مناصب، اربابِ اقتدار کے عزیز واقارب میں بٹنے لگ جائیں گے۔ وہ عمالِ حکومت کو تاکیداً لکھتے رہتے تھے کہ:-

سخت کوشی کی زندگی بسر کرنے کے عادی بنو۔ موٹا جھوٹا کھاؤ، گاڑھا گزی پہنو، پرانے استعمال کرو۔ سواریوں کو خوب چارہ دو۔ ڈٹ کر گھوڑے کی سواری کرو اور جم کر تیراندازی کرو۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ میں جو ہم دیکھتے ہیں کہ اُس دور میں حکومت کا کوئی کارندہ بد دیانت اور رشوت خور نہیں تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قسم کے معاشی نظام میں کسی کو بد دیانت بننے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ بددیانتی اور رشوت خوری کی ابتدا تو اس سے ہوتی ہے کہ حکومت کے ملازمین کو اپنے مستقبل کے متعلق ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا ہے۔ یہ عدمِ تحفّظ (INSECURITY) کا احساس اور خدشہ ہے جو انہیں زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ اس کی ابتدا تو اس سے ہوتی ہے اور اس کے بعد، زراندوزی کی ہوس انہیں آگے ہی آگے لئے چلی جاتی ہے۔ قرآنی مملکت کے نظام میں عدمِ تحفّظ کا خیال تک نہیں پیدا ہو سکتا کہ اس میں تمام افرادِ مملکت اور ان کے بچّوں کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمّہ داری مملکت پر ہوتی ہے اس لئے کسی کو اس کی فکر ہی نہیں ہوتی کہ کل کو میرا یا میرے بیوی بچّوں کا کیا بنے گا اور نہ ہی اس میں جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس نظام میں کوئی شخص بد دیانت ہو نہیں سکتا۔ اسے بد دیانت ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

محیّر العقول کارنامے

اگلے دنوں میرے ایک فوجی دوست نے مجھ سے پوچھا کہ قرنِ اوّل میں مسلمان سپاہیوں (مجاہدین)، نے جو محیّر العقول کارنامے کر دکھائے، اس کی بنیادی وجہ کیا تھی؟ میں نے کہا کہ ذرا اس پر غور کیجئے کہ وہ کون سے اسباب واحساسات ہیں جن کی وجہ سے ایک سپاہی میدانِ جنگ سے بھاگ جاتا ہے یا کمزوری دکھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں پہلا احساس یہ ہوتا ہے

کہ میں مرجاؤں گا اور دوسرا احساس یہ کہ میرے بعد میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟ وہ تباہ ہو جائیں گے۔ قرآن نے یہ تصور دیا کہ موت صرف نقلِ مکانی کا نام ہے۔ کوئی انسان موت سے ختم نہیں ہو جاتا۔ وہ زندہ رہتا ہے۔ بس صرف مکان کی تبدیلی ہوتی ہے (اسی لئے ہمارے ہاں موت کے لئے انتقال کا لفظ رائج تھا جو اس تصور کی ٹھیک ترجمانی کرتا تھا) مسلمان سپاہی کے دل میں یہ تصور ایمان کی حیثیت لئے ہوتا ہے اس لئے اُسے موت کا ڈر ہی نہیں ہوتا۔ باقی رہا یہ دھڑکا کہ میرے مرنے کے بعد میرے بیوی بچوں کا کیا ہوگا، تو اس کی ذمہ داری پہلے ہی سے مملکت نے لے رکھی ہوتی ہے۔ لہٰذا، اسے یہ غم بھی نہیں ستاتا۔ اب سوچئے کہ جس سپاہی کو نہ موت کا ڈر ہو اور نہ ہی اپنے پسماندگان کے مستقبل کی طرف سے کسی قسم کا تردد، اس کے زورِ بازو کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ اس کی تو نگاہ سے (اقبال کے الفاظ میں) تقدیریں بدل جاتی ہیں حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اگر روٹی کی فکر سے آزاد کر دیا جائے، تو وہ جن بن جاتا ہے۔ اس کی وہ صلاحیتیں جو اس سے پہلے، چکی کے اس پاٹ (MILL - STONE) کے نیچے بُری طرح سے دبی اور کچلی رہتی ہیں، اس طرح ابھر کر باہر آجاتی ہیں کہ وہ کچھ اور کی اور مخلوق بن جاتا ہے۔ وہ صحیح انسانی پیکر میں سامنے آتا ہے۔ اس کی عظمتِ انسانیت چھلک کر باہر آجاتی ہے۔ اس کی ممکناتِ زندگی ایک ایک کر کے محسوس پیکر اختیار کر لیتی ہیں۔ وہ، وہ کچھ کر کے دکھا دیتا ہے جسے عام سطح کا انسان، معجزات اور کرامات سمجھتا ہے حالانکہ وہ نہ کوئی معجزہ ہوتا ہے نہ کرامت۔ روٹی کے چکر میں پھنسا ہوا انسان کبھی انسانی سطح پر آ نہیں سکتا۔ اسے کسی انسانی مسئلہ کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے جو قرآن کریم نے حضرت انبیاء کرامؑ سے کہا کہ:۔

يَاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (۲۳/۵۱)

اے ہمارے رسولو! خوشگوار رزق کھاؤ اور اعمالِ صالح کرو۔

آپ نے غور فرمایا کہ اعمالِ صالح اور روٹی کا کس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے۔ میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ یہ جو ہمارے ہاں ایک مذہبی افسانہ مشہور ہے کہ ابلیس نے آدم کو دانۂ گندم کھلایا جس سے وہ جنت سے باہر نکال دیا گیا، تو اس سے کسی سیانے نے اِسی طرف اشارہ تو نہیں کیا کہ انسان کو جنت سے نکلوانا مقصود ہو تو اُسے روٹی کی فکر میں الجھا دو۔ اس کی تائید خود قرآن سے بھی ہوتی ہے۔ اس نے قصہ آدم کے تمثیلی انداز میں بتایا ہے کہ آدم جس جنت میں رہتا تھا وہاں اُسے روٹی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہاں اس

کی کیفیت یہ تھی کہ ـــــ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵)۔ وہ جہاں سے جی چاہتا پیٹ بھر کر کھالیتا۔ اس سے کہا گیا کہ یاد رکھو! اگر تم ابلیس کے فریب میں آگئے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ـــ يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰ۔ (۲۰/۱۱۷) ـــ تو وہ تمہیں اس جنّتی زندگی سے نکلوا دے گا اور تمہیں اسی روٹی کی خاطر جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی۔ انسان اس کے فریب میں آگیا جس کا نتیجہ سرمایہ دارانہ نظام کی انفرادیت تھی اس سے بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔ (۲۰/۱۲۳) کی انسانیت سوز جہنم وجود میں آگئی جس میں ہر فرد کا مفاد دوسرے فرد کے مفاد سے ٹکرانے لگا۔ انسان کو اس جہنم سے نکالنے کے لیے آسمانی راہنمائی کا سلسلہ شروع ہوا۔

بعثتِ نبیٔ اکرمؐ کا مقصد

قرآنِ کریم نے نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ ـــــ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷) ـــ یہ ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا جن میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی اور اس کے سر سے ان بوجھوں کو اتار پھینکے گا جن کے نیچے وہ بُری طرح دبی ہوئی تھی۔ ان زنجیروں میں سب سے زیادہ کڑی، اور ان بوجھوں میں سب سے زیادہ بوجھل، وہ خوف و ہراس تھا جو "روحانی قوتوں" کے نام سے انسان کے اعصاب پر سوار چلا آرہا تھا۔ اس سے اس میں جس قسم کی نفسیاتی الجھنیں (COMPLEXES) پیدا ہوتی تھیں، ہماری علمی دنیا اب اُن سے اچھی طرح روشناس ہو چکی ہے۔ قرآنِ کریم نے ختمِ نبوت کے اعلان سے اس سارے بوجھ کو الگ کر کے رکھ دیا۔ اس نے کہا کہ اب کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے آکر یہ نہیں کہہ سکے گا کہ میں آسمان سے آیا ہوں اور تم زمینی مخلوق ہو[1]۔ خود نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر کہ ـــــ أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (۱۸/۱۱۰) اس باب میں سبقت کی۔

اب کوئی مافوق الفطرت عنصر، یا جسے عام طور پر روحانی قوّت کہا جاتا ہے، انسانی زندگی پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ اس سے انسانی صلاحیتوں کو ابھرنے اور نشو و نما پانے کا کلّی امکان حاصل ہو گیا۔ اور انسان کو پرکھنے کا معیار، شرفِ انسانیت (یعنی اس کی انسانی صلاحیتوں کی سطح) قرار پا گیا۔ اس حقیقت کو قرآنی معاشرہ کے

---

[1] ختمِ نبوّت کے بعد آسمانی آواز قرآن کے اندر محفوظ ہے جو قیامت تک تمام نوعِ انسانی کے لیے مکمّل ضابطۂ ہدایت ہے۔ اس کے علاوہ اب کوئی خدائی اتھارٹی نہیں بن سکتا۔

اربابِ فکر و عمل کیسے اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے۔ اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے پیش کردہ اس معیار سے لگائیے جو ہمیں تاریخ کے صفحات میں محفوظ ملتا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک بار کوئی شخص آپ کے سامنے کسی مقدمہ میں پیش ہوا۔ آپ نے اس سے کہا کہ تم کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو تمہیں اچھی طرح جانتا ہو۔ وہ ایک آدمی کو لایا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم اس شخص کو اچھی طرح جانتے ہو۔ اس نے ہاں کہا تو آپ نے پوچھا کہ کیا تم کبھی اس کے پڑوس میں رہے ہو اور اس کی اندر باہر کی زندگی سے واقف ہو۔ اس نے نفی میں جواب دیا تو آپ نے کہا کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر بھی کیا ہے؟ اس کا جواب بھی نفی میں ملا۔ تو آپ نے کہا کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ لین دین کا معاملہ کیا ہے؟ اس نے اس سے بھی انکار کیا۔ تو حضرت عمرؓ نے جو کچھ فرمایا وہ اس نکتہ کی اچھی طرح حقیقت کشائی کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:

پھر یوں نظر آتا ہے کہ تم نے اسے مسجد میں کھڑے قرآن پڑھتے، کبھی سر جھکاتے اور سر اوپر اٹھاتے ہی دیکھا ہے۔

اس نے اقرار کیا تو آپ نے کہا کہ "چلے جاؤ تم اسے خاک نہیں جانتے" اور اس شخص سے کہا کہ تم کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو تمہیں انسان کی حیثیت سے جانتا ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم کی عطا فرمودہ نئی اقدار اور نبئ اکرمؐ کے عدیم المثال عمل نے، انسانیت کے ماپنے کے کس قدر نئے پیمانے عطا کر دیئے تھے۔ یہ وہ پیمانے تھے جن کی رُو سے انسان کی قدر و قیمت اس کی انسانی صلاحیتوں کی بنا پر متعین ہوتی تھی اور ان صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع ان اقدار کی رُو سے ملتا تھا۔

نہ خوف نہ حُزن

وہ دوسری سلیں جنہوں نے انسان کو بُری طرح کچل رکھا تھا، چکّی کے پاٹ تھے یعنی روٹی کی فکر۔۔۔ قرآنی مملکت نے انسان کو اس فکر سے آزاد کر کے، اس محبوسِ قفس طائرِ لاہوتی کو آزادی کی حقیقی فضاؤں میں اِذنِ بال کشائی دے دیا جس سے اُسے اپنی منزل آسمانوں میں نظر آنے لگی۔ قرآنِ کریم نے قرآنی مملکت کی خصوصیّتِ کبریٰ یہ بتائی ہے کہ اس میں افرادِ معاشرہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ ۔۔۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۲/۶۲ ۔ ان پر نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حُزن ۔۔۔ یعنی وہ ہر قسم کے خوف اور حُزن سے مامون ہوں گے۔ خوف کے معنی تو ہم سمجھتے ہیں ۔۔۔ کسی آنے والے خطرہ کے احساس سے ہراساں ۔۔۔ قرآنی مملکت میں کس قدر بے خوفی اور امن ہوتا ہے، اس کے متعلق نبئ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نظام قائم کر دوں گا جس میں حالت یہ ہو گی کہ یمن میں ایک عورت تنہا، صحراؤں اور بیابانوں

سے سفر کرتی ہوئی شام تک چلے جائے گی اور اُسے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔ بے خوفی اور امن کے ماپنے کا اس سے بہتر پیمانہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ باقی رہا وہ خوف جو زیردستوں کو بالادستوں کی طرف سے ہر وقت وجۂ سوہانِ روح بنا رہتا ہے، سو اس کے متعلق وہ واقعہ سامنے لائیے کہ حضرت عمرؓ ایک دفعہ ایک وادی میں سے گزر رہے تھے کہ آپؓ نے یکایک سواری کو روکا۔ نیچے اُترے اور سجدے میں گر گئے۔ رفقاء نے پوچھا کہ آپؓ نے یہ کیا کیا۔ تو فرمایا کہ یہ وہ وادی ہے جس میں عمرؓ اپنے باپ کے اونٹ چرایا کرتا تھا اور سہمے سہمے پھرا کرتا تھا۔ باپ بھی سخت تھا اور یونہی بات بات پر پیٹ دیا کرتا تھا۔ ایک وہ دن تھا۔ اور ایک یہ دن ہے کہ عمرؓ اور اس کے خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں جس سے ڈرا جائے۔ یہ وادی دیکھ کر مجھے یہ احساس شدّت سے ہوا کہ میں بے اختیار بحضور ربّ العزّت سجدہ میں گر گیا۔

یہ ہوتا ہے، قرآنی مملکت میں بے خوفی کا عالم۔ اس میں، خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہوتی جس سے ڈرا جائے اور خدا کا ڈر بھی کسی مستبد حاکم کا ڈر نہیں ہوتا۔ خدا کے ڈر سے مراد ہوتا ہے اس نقصان اور تباہی کا احساس جو قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ مثلاً جس طرح ہم دریا کے کنارے چلتے ہوئے، پاؤں پھسلنے کے انجام سے ڈرتے ہیں — قرآنی مملکت میں قانون شکنی کے نقصان رساں نتائج کے احساس کے علاوہ اور کسی قسم کا خوف کسی کو نہیں ستاتا۔

باقی رہا حُزن، تو یہ لفظ بڑے گہرے معانی کا حامل ہے۔ عام طور پر اس کے معنی افسردگی اور اندوہناکی ہوتے ہیں خواہ اس کی وجہ کچھ بھی ہو، لیکن اسے بالخصوص اس افسردگی اور غمگینی کے لئے بولا جاتا ہے جو معاشی پریشانی کی وجہ سے حائل ہو۔ سورۂ فاطر میں جنّتی معاشرہ میں بسنے والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ آئیں گے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ کس قدر قابلِ حمد وستائش ہے خدا کا وہ نظام، جس نے ہمیں حُزن سے نجات دلائی۔ عربی زبان کے مستند لغت تاج العروس میں لکھا ہے کہ یہاں حُزن کے معنی ہیں صبح و شام کے کھانے کی فکر۔ اس کی تشریح خود اگلی آیت نے کر دی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ۔ (۳۵/۳۴-۳۵) وہ خدا جس نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں ایسا معاشرہ قائم کر دیا ہے جس میں نہ کوئی جگر پاش مشقت ہے، نہ ذہنی کاوش و نفسیاتی افسردگی، نہ اس میں روٹی کے لئے مارے مارے پھرنا پڑتا ہے اور نہ ہی باہمی معاملات میں اس قسم کا الجھاؤ پیدا ہوتا ہے جس سے انسان خواہ مخواہ پریشان رہے

فکرِ معاش کی طرف سے آسودگی اور باہمی خوش معاملگی یہ ہیں قرآنی مملکت کی بنیادی برکات وحسنات۔

قرآن کریم (میں سورۃ فاتحہ) کی ابتداء اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے ہوتی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا در خورِ حمد وستائش اس لئے ہے کہ وہ کائنات کی نشوونما کرتا ہے اور قرآن کی آخری سورۃ میں اسے رب النّاس کہا گیا ہے، یعنی پوری نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانے والا ۔۔۔ جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے، انسانی دنیا میں خدا کی یہ ذمّہ داری اس مملکت کے ذریعے پوری ہوتی ہے جو اس کے نام سے قائم کی جاتی ہے۔ یہ مملکت بھی اسی لئے مستحقِ حمد وستائش ہوتی ہے کہ یہ افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرتی ہے اور ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام کرتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو قطعاً مستحقِ تعریف وتوصیف قرار نہیں پا سکتی۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنی مملکت کے اربابِ بست وکشاد ہمیشہ اس فریضہ کی ادائیگی میں مصروف تگ وتاز رہتے ہیں۔ وہ سزاوارِ حمد وستائش قرار ہی اس وقت پاتے ہیں جب وہ یہ کچھ کر کے دکھائیں۔ ان کے برعکس، دوسرے اربابِ اقتدار کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا۔ (۳/۱۸۷) ان کی ہر وقت یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی تعریف ان کاموں کی بنا پر کی جائے جنہیں وہ سرانجام نہیں دیتے۔ قرآنی مملکت میں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس میں یہ لوگ سب کچھ کر کے بھی کسی صلہ کی توقع یا ستائش کی تمنّا نہیں رکھتے اگر کوئی بے ساختہ ان کا سپاس گذار ہونا بھی چاہتا ہے، تو وہ اس سے کہہ دیتے ہیں کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (۷۶/۹) ہم تم سے کسی معاوضے کے تو ایک طرف، شکریہ تک کے بھی متمنّی نہیں ہیں۔

ہمارے ہاں، بدقسمتی سے "امام مہدی" کا صحیح مفہوم نظریاتی بحثوں اور معتقداتی پیچیدگیوں میں کھو کر رہ گیا ہے، ورنہ (اگر وہ روایات صحیح ہیں) تو نبی اکرمؐ نے، ان میں صحیح قرآنی نظام کے سربراہ کی خصوصیات کی طرف اشارہ فرمایا تھا نہ کہ کسی مافوق الفطرت راستے سے آنے والی منفرد شخصیّت کی منفرد خصوصیات ۔۔۔ آپ نے اس سربراہِ مملکتِ اسلامیہ کی نمایاں خصوصیّت یہ بتائی تھی کہ يقسم المال صحيحًا وہ مال کی صحیح صحیح تقسیم کرے گا۔ کسی نے پوچھا کہ مال کی صحیح تقسیم کا معیار کیا ہو گا۔ آپ نے فرمایا کہ بالسويّة بين الناس تسویہ کے معنی ہوتے ہیں کسی شے میں ہر قوّت کا صحیح صحیح تناسب کے ساتھ موجود ہونا اور اس طرح اس کا اپنی انتہائی نشوونما تک پہنچ جانا۔ اَلسَّوِيُّ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو ہر اعتبار سے افراط وتفریط سے محفوظ ہو اور ٹھیک ٹھیک تناسب رکھتی ہو۔ اِسْتَوَى الرَّجُلُ کے معنی ہیں اس شخص کا شباب اپنے انتہا تک پہنچ گیا۔ لہٰذا مال کی تقسیم بالتَّسْوِيَةِ کے معنی یہ ہوں گے کہ معاشرہ میں سرمایہ کی تقسیم اس طرح ہو کہ نہ اس میں افراط ہو نہ تفریط بلکہ اس انداز سے کہ ہر شخص

کی صحیح صحیح نشوونما ہو سکے اور اس کی صلاحیتیں بھرپور شباب تک پہنچ جائیں۔

قرآنی مملکت کی خصوصیات کی تفصیل اتنی طویل ہے کہ اسے ایک نشست میں ختم نہیں کیا جاسکتا اس لئے میں آخر میں حضرت عمرؓ کے اس قول کو پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں جو میرے نزدیک "اس باب میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم میں سے جب بھی کسی شخص کو کوئی شکایت ہوتی ہے تو وہ کسی ایسے دروازے کو تلاش کرتا ہے جس پر دستک دینے سے اس کی شکایت رفع ہو سکے۔ اور جب وہ دنیا کے تمام دروازوں کو بند پاتا ہے تو مجبور ہو کر اپنے خدا سے فریاد کرتا ہے۔ اسے دعا کہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ایک خطبۂ عام میں کہا تھا کہ:۔

لوگو! مجھے اللہ نے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو اُس تک پہنچنے سے روک دُوں یعنی ایسا انتظام کر دوں کہ اوّل تو تمہیں کسی بات کے لئے خدا کے ہاں فریاد کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے اور اگر کبھی ایسا ہو جائے تو قبل اس کے کہ تمہاری شکایت خدا تک پہنچے، اس کا ازالہ ہو چکا ہو۔ یہ ہے قرآنی مملکت کی بنیادی خصوصیت اور یہی وہ امامتِ کبریٰ ہے جس کے حصول کے لیے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ امامت اس لئے کہ اس قسم کی مملکت کا وجود دنیا میں کہیں نہیں تھا۔ اس لیے پاکستان کی تشکیل سے یہ سبقت و امامت اسی کے حصّہ میں آنی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان کا تصوّر دینے والے (اقبالؒ) نے، یہ تصوّر دیتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

قرآنی پاکستان، اسی عالم افروز اور انسانیّت ساز تصوّر کا حسین و جمیل پیکر ہوتا۔

لیکن

اور یہ "لیکن" ایک داستان ہے جگر گداز اور ایک حدیث ہے دلخراش۔ اگر میں نے اسے بیان کرنا شروع کر دیا تو مجھے ڈر ہے کہ آپ یہ نہ کہہ دیں کہ ؎

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصّہ
لو آج کی شب بھی سو چکے ہم

اس لیے میں اس خواب رُبا قصّہ کی تفصیل میں جانے کے بجائے، اسے قرآن کے الفاظ میں کیوں نہ پیش کر دوں جن میں اختصار اور جامعیّت معجزانہ حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ آپ سورۂ اعراف کی آیت ۱۷۵ سامنے لایئے جہاں سے بات کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے کہ:۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا ... ...
تم انہیں اس شخص کی عبرت آمیز داستان (تمثیلاً) سناؤ جسے ہم نے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے تمام نشانات راہ عطا کر دیئے تھے لیکن وہ انہیں چھوڑ کر یوں الگ ہو گیا جیسے سانپ اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے کہ اُس پر اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ ایسا اس لیے ہوا کہ وہ اپنے ذاتی مفادات کے حصول اور پست جذبات کی تسکین کے پیچھے لگ گیا اور یوں راہ سے بے راہ رو ہو گیا۔
ہم چاہتے تھے کہ وہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جائے لیکن وہ زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔ انفرادی مفاد پرستیوں کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے۔ ان ہولناکیوں سے اس کی مثال کتے کی سی ہو گئی کہ اُسے اُکساؤ اور دوڑاؤ تو بھی وہ ہانپے اور زبان نکالے اور دیسے چھوڑ دو، تو بھی ہانپے اور زبان لٹکائے اس کا ہونکنا کسی صورت میں کم ہی نہ ہو۔

ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۔ یہ حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قوانین (کا زبانی اقرار تو کرتی ہے لیکن عملاً انہیں) جھٹلاتی ہے۔ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (۷/۱۷۶) انہیں ان کی یہ داستان سناؤ۔ شاید یہ اس پر غور و فکر کریں اور سوچیں کہ ہمیں کیا ہو گیا۔

مَثَلًا ۨالْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا اُف! کس قدر بُری حالت ہو جاتی ہے اُس قوم کی جو ہمارے قوانین کی عملاً تکذیب کرتی ہے۔ اس میں ہر ظلم و زیادتی کرنے والا سمجھتا ہے کہ میں دوسروں کو لوٹ کر اپنا فائدہ کر رہا ہوں۔ لیکن یہ نہیں سوچتا کہ وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ (۷/۱۷۷) وہ اس طرح کسی دوسرے کا نہیں، خود اپنا ہی نقصان کر رہا ہے۔ جذبات پرستی کے طوفان میں غرق ہونے سے ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۔ وہ سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن اُن سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن انہیں کچھ سنائی نہیں دیتا۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ ۔ تم انہیں انسان سمجھتے ہو؟ نہیں! یہ انسان نہیں حیوان ہیں۔ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ نہیں! یہ تو ان سے بھی گئے گذرے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ

الْغَافِلُوْنَ۔ (۱۷۹/۷) حیوان اپنی زندگی کے تقاضوں سے کبھی غافل نہیں ہوتا اور ان انسان نما حیوانوں کو خبر ہی نہیں کہ ان کی زندگی کے تقاضے کیا ہیں اور یہ کس طرف جا رہے ہیں۔ ؎

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

کیا پاکستان اسلامی ملک بن سکتا ہے؟

(اپریل ۱۹۶۷ء)

اے مُسلماں! اپنے دِل سے پُوچھ، مُلّا سے نہ پُوچھ

ہم نے یہ سوال اٹھایا تو اس کے ساتھ ہی، ہماری نگاہوں کے سامنے آپ کا وہ "خندۂ زیر لبی" تماشائے عبرت بن کر آگیا جو آپ کے اِس احساس کا پیدا کردہ ہے کہ یہ سوال اُس طلوعِ اسلام کی طرف سے اٹھایا جارہا ہے جو ۱۹۳۸ء سے مسلسل و متواتر یہ پیغام دیئے آرہا ہے کہ اسلام ایک زندہ حقیقت بن نہیں سکتا جب تک اس کی اپنی آزاد مملکت نہ ہو۔ پاکستان کا مطالبہ اس بنیاد پر پیش کیا گیا تھا کہ یہ ہمارے ایمان کا تقاضا ہے۔ اس خطۂ زمین کو حاصل ہی اس مقصد کے لیے کیا گیا تھا کہ اس میں صحیح اسلامی نظام قائم کیا جائے۔ اس سرزمین کے تحفّظ کی ہر کوشش اس لیے جہاد ہے کہ اسے نظامِ خداوندی کی تشکیل کا گہوارہ بنتا ہے۔ قوم کے ذہن میں یہ تصوّرات طلوعِ اسلام نے پیدا کیے۔ اس کے دل میں، اس مقصد کی عظمت و اہمیّت کو اجاگر اس نے کیا۔ اس کے لیے اس نے (تقسیم سے پہلے) انگریز، ہندو، قومیّت پرست علماء، جماعتِ اسلامی، غرضیکہ ہر اس قوّت و تحریک سے لڑائی مول لی جو اس مطالبہ کی مخالف تھی۔ اور (تقسیم کے بعد) اس نے ہر اس عنصر کا مقابلہ کیا جو اُس مملکت کے اسلامی بننے کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتا تھا (اور کرتا ہے) اب اسی طلوعِ اسلام کی طرف سے یہ سوال اٹھایا جارہا ہے کہ اس مملکت کے اسلامی بننے کا امکان بھی ہے یا نہیں؟ آپ کی حیرت بھی بجا اور (جیسا کہ آپ آگے چل کر دیکھیں گے)

اس سوال کا اٹھایا جانا بھی درست ہے لیکن (اس حقیقت کو ہم شروع ہی میں واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ) اس سوال سے آپ کے دل میں نا اُمیدی کی کوئی رمق پیدا نہیں ہونی چاہیئے۔ اس سے ہمارا مقصد آپ کو اس سوال پر غور و فکر کی دعوت دینا ہے کہ جو عناصر یہاں اٹھارہ سال سے کارفرما ہیں، اگر ان کی کارفرمائی بدستور جاری رہی تو کیا یہ ملک اسلامی بن سکے گا؟ اس سلسلہ میں ہم آپ سے گذارش کریں گے کہ جو کچھ آپ کے سامنے پیش کیا جائے، آپ اس پر خالی الذّہن ہو کر غور کریں۔ اس پر نہ تو اپنے ذاتی جذبات کو اثر انداز ہونے دیں اور نہ ہی کسی خارجی پروپیگنڈہ کی رو میں بہ جائیں۔ یہ سوال بڑا اہم اور سنجیدہ ہے۔ اس کا تعلّق پاکستان کی ایک الگ آزاد مملکت کی ہستی کی وجۂ جواز سے ہے۔ اس کا ہماری، آپ کی اور آنے والی نسلوں کی زندگی سے گہرا رشتہ ہے۔ اس لئے یہ سوال آپ کی گہری توجّہ کا محتاج ہے

ملک کے اسلامی بننے کا مفہوم

کسی ملک کے اسلامی بننے کے معنی یہ ہیں کہ اس میں اسلامی قوانین نافذ ہوں اور وہاں کا معاشرہ، اسلامی اقدار کے خطوط پر متشکّل ہو۔ اس وقت ہم صرف اس کے پہلے گوشے — یعنی اسلامی قوانین — سے متعلّق گفتگو کریں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی ملک میں اسلامی قوانین اسی صورت میں نافذ ہو سکتے ہیں جب وہاں اسلامی قوانین مرتّب کئے جائیں۔ لہٰذا، سوال یہ سامنے آئے گا کہ کیا پاکستان میں (بہ حالاتِ موجودہ) اسلامی قوانین مرتّب ہونے کی کوئی صورت ہے؟

یہ بھی ظاہر ہے کہ پاکستان میں، غیر مسلموں کی مختصر سی اقلیّت کو چھوڑ کر، باقی آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے اور مملکت کا اسلامی قانون وہی ہو سکتا ہے جس کا اطلاق ان تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو۔ لہٰذا، یہ سوال سمٹ کر یہ شکل اختیار کر لیتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ پاکستان میں ایک ایسا ضابطۂ قوانین مرتّب کیا جا سکے جسے یہاں کے رہنے والے تمام مسلمان اسلامی قوانین تسلیم کر لیں۔

کسی ملک میں قانون سازی کا بنیادی اصول اس کے آئین میں درج ہوتا ہے۔ پاکستان کا پہلا آئین ۱۹۵۶ء میں مرتّب ہوا، تو اس میں، قانون سازی کے سلسلہ میں، یہ شق درج تھی کہ ملک کا کوئی قانون "قرآن و سنّت" کے خلاف نہیں ہوگا۔ جو آئین ۱۹۶۲ء میں مرتّب ہوا اس میں یہ شق درج کی گئی کہ ملک کا کوئی قانون "اسلام" کے خلاف نہیں ہوگا۔ اس کے خلاف اعتراضات اٹھائے گئے تو اس شق کو یوں بدل دیا گیا کہ ملک کا کوئی قانون "قرآن و سنّت" کے خلاف نہیں ہوگا — اس سے معترضین مطمئن ہو گئے۔

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کیا اس اصول کے تابع، کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتّب کیا جا سکتا ہے جسے

یہاں کے تمام مسلمان، اسلامی قوانین تسلیم کر لیں؟

کوئی قانون کتاب و سنّت کے خلاف نہیں ہوگا

اِس شق کی رُو سے، کسی قانون کے اسلامی ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ (۱) قرآن کے خلاف نہ ہو اور (۲) سنّت کے خلاف نہ ہو — قرآن کے متعلق ہر شخص جانتا ہے کہ یہ ایک متعیّن معروف کتاب ہے جس کا ایک ایک لفظ تمام مسلمانوں کے لیے مسلّم ہے اس کی کسی سُورت یا آیت کے متعلق تو ایک طرف، اُس کے کسی ایک لفظ کے متعلّق بھی یہ سوال پیدا نہیں ہو سکتا کہ یہ قرآن میں ہے یا نہیں۔ یہ کتاب ایسی متفق علیہ اور مسلّم ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس شرط کے دوسرے جزو — سُنّت — کی بھی یہی پوزیشن ہے؟ یہ وہ بنیادی سوال ہے جس پر اس سارے مسئلہ کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس لیے یہ بڑی ہی گہری توجّہ کا محتاج ہے۔ اس لیے بھی کہ (ایک خاص مصلحت کے ماتحت) یہ مشہور کر دیا گیا ہے کہ طلوعِ اسلام منکرِ سُنّت ہے۔ اس لیے سنّت کی بحث کے سلسلہ میں اس کی کوئی بات درخورِ اعتنا نہیں ہونی چاہیئے۔ اس پراپیگنڈہ کا نتیجہ یہ ہے کہ جونہی طلوعِ اسلام نے قانون سازی کے متعلق کوئی بات کی، اسے یہ کہہ کر جھٹک دیا جاتا ہے کہ اس منکرِ حدیث اور منکرِ سنّت کا کیا ہے! اسے اسلام سے کیا تعلق؟ ہماری آپ سے اتنی گذارش ہے کہ آپ اس سوال کو تھوڑے سے وقت کے لئے الگ رکھ دیں کہ طلوعِ اسلام منکرِ سُنّت ہے یا کچھ اور۔ آپ صرف یہ دیکھیں کہ جو کچھ آئندہ سطور میں کہا جا رہا ہے، وہ ٹھیک ہے یا نہیں؟ اگر وہ ٹھیک ہے تو اسکے بعد جس نتیجے پر آپ کی فکر آپ کو پہنچائے اسے صحیح تسلیم کر لیجیئے ہمارا خیال ہے کہ اس پر آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔ اب غور سے سنیئے کہ سنّت کی پوزیشن کیا ہے۔

بحثِ سنّت

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، قرآن کریم ایک متعیّن اور متعارف کتاب ہے۔ لیکن دنیا میں کوئی ایسی کتاب نہیں جس کے متعلّق کہا جا سکے کہ وہ سنّتِ رسول اللہؐ کا مجموعہ ہے۔ کوئی ایسی کتاب نہیں — اہلِ حدیث حضرات کہتے ہیں کہ سنّت اور حدیث مُترادف الفاظ ہیں، یعنی حدیث ہی کو سنّت کہا جاتا ہے۔ اس تعریف کی رُو سے "قرآن و سنّت" کے معنی ہونگے، "قرآن اور حدیث"۔ لیکن دیگر حضرات اس سے متفّق نہیں۔ چنانچہ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اس باب میں (اپنی کتاب، رسائل و مسائل حصہ اوّل میں) لکھتے ہیں:-

سنّت اس طریق عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو

مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبیؐ نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے ایک خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کئے۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق و امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کون سا جز سنت ہے اور کون سا جز عادت، بغیر اس کے ممکن نہیں ہو سکتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔ تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لئے نبی صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اصولوں کی پیروی کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضورؐ کے شخصی مذاق اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں، کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپ پیدا ہوئے تھے اور کچھ اس زمانے کے حالات پر جن میں آپؐ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص اور تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لئے سنت بنا دینا مقصود نہ تھا۔ (صنا ۳ ۔ صہ ۳۱۲)

اسی کتاب میں وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضورؐ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرزِ معاشرت اور آپؐ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو سنت بنانا نہ تو مقصود تھا نہ اس کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی رُو سے اس طرزِ خاص کا لباس نبی پہنتے تھے۔ اور شرائع الہٰیہ اس غرض کے لئے آیا کرتی تھیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن یا کسی خاص زمانے کے رسم و رواج کو دنیا بھر کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سنت بنا دیں۔ سنت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاحِ شرعی میں سنت نہیں ہیں۔ ان کو خواہ مخواہ سنت قرار دے لینا منجملہ اُن بدعات کے ہے جن سے نظامِ دینی میں تحریف واقع ہوتی ہے۔ (صہ ۳۱۴)

دونوں میں اختلاف

یعنی اہلِ حدیث حضرات کے نزدیک، ہر وہ بات جو احادیث کے صحیح مجموعوں میں درج ہے، سنت ہے۔ لیکن مودودی صاحب کے نزدیک ایسا سمجھنا صحیح نہیں۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ "سنت صرف اس طریقِ عمل کو کہیں گے جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے اپنے نبیؐ کو مبعوث کیا تھا ۔۔۔ اس سے وہ تمام باتیں خارج ہیں جنہیں نبی اکرمؐ نے اپنی

بشری حیثیت سے کیا تھا۔ اگر کوئی شخص ان باتوں کو بھی سنت قرار دے تو اس کے متعلق مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ:۔

میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور خطرناک تحریف دین ہے جس سے نہایت برے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔ (ایضاً صفحہ ۳۰۸)

اس سے ذرا پہلے وہ لکھتے ہیں۔

جو امور آپؐ نے عادۃً کئے ہیں، انہیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کر لیں، اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے۔ (صفحہ ۳)

مودودی صاحب کی پیش کردہ، سنّت کی اس تعریف (DEFINITION) کے متعلق، مولانا محمد اسماعیل صاحب (صدر جمعیتِ اہلِ حدیث مغربی پاکستان) لکھتے ہیں کہ:۔

میری رائے میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے نظریات، نہ صرف مسلک اہلِ حدیث کے خلاف ہیں، بلکہ یہ نظریات تمام ائمہ اہلِ حدیث کے خلاف ہیں۔ ان میں آج کے جدید اعتزال اور تجہّم کے جراثیم مخفی ہیں۔ (جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث، صفحہ ۱۱)

آپ نے غور فرمایا کہ خود سنّت کی تعریف کے سلسلہ میں ان حضرات میں باہمی اختلافات کس قدر گہرے ہیں۔ مودودی صاحب، اہلِ حدیث حضرات کے مسلک کو دین میں "خطرناک تحریف" قرار دیتے ہیں اور اہلِ حدیث حضرات کے نزدیک مودودی صاحب کا مسلک، معتزلہ کا مسلک ہے۔

اگر اہلِ حدیث حضرات کے مسلک کو قبول کر لیا جائے تو اس سے کیا دشواریاں پیش آتی ہیں، اس کے متعلق ذرا آگے چل کر بات کی جائے گی۔ اس مقام پر یہ دیکھئے کہ اگر مودودی صاحب کے مسلک کو اختیار کیا جاتے تو صورت کیا بنے گی؟ حدیث کی کسی کتاب میں یہ نہیں واضح کیا گیا کہ رسول اللہ نے فلاں بات رسالت کی حیثیت سے کی تھی

اس مسلک کی مشکلات

اور فلاں بات بشری حیثیت سے فلاں بات اپنے شخصی مذاق یا قومی طرزِ معاشرت کی رُو سے کی تھی اور فلاں بات دینی حیثیت سے۔ حدیث کی کسی کتاب میں تفریق و تمیز نہیں کی گئی۔ لہٰذا اس کے لیے پہلے یہ کرنا ہوگا کہ احادیث کے تمام مجموعوں سے، ان دونوں قسموں

کے امور کو الگ الگ کیا جائے اور اس طرح سنّتِ رسول اللہ کو متعیّن کیا جائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ یہ کام کون کرے۔ اور جو لوگ بھی اس فریضہ کو سرانجام دیں اس کی کیا ضمانت ہے کہ دیگر حضرات ان کے نتائج سے مُتّفق ہوں۔ اہلِ حدیث حضرات تو سرے سے اس تحریک ہی کے مخالف ہوں۔ سُنّی حضرات ؎ میں یہاں فقہ حنفی کے پیرؤوں کی اکثریت ہے، (بلکہ بہ ہیئتِ مجموعی یوں سمجھیئے کہ یہ سب کے سب حنفی ہیں) ان کے ذمّہ دار علماء میں سے کوئی بھی اس بات سے متفق نہیں ہوگا کہ مودودی صاحب یا ان کے ہم خیال حضرات، سنّت کا جو مجموعہ اس طرح مرتّب کریں، اسے مستقل شریعت کا درجہ دے دیا جائے۔ نہ ہی مودودی صاحب اس کے لئے آمادہ ہوں گے کہ کسی دوسرے کے اس طرح مرتّب کردہ مجموعۂ سنّت کو وہ مستقل شریعت تسلیم کر لیں۔

یہاں تک بات یہ ہوئی ہے کہ ایک گروہ، احادیث ہی کو سنّت قرار دیتا ہے اور دوسرے گروہ کا مسلک یہ ہے کہ احادیث سے سنّت کو مرتّب کیا جانا چاہیئے، لہٰذا ان دونوں کے نزدیک حدیث قدرِ مشترک ہے اگرچہ اس کے قانونِ شریعت بننے کے عملی انداز میں ان دونوں میں بنیادی فرق ہے۔ اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا "حدیث" کے متعلّق یہ حضرات ایک دوسرے سے متفق ہیں؟

حدیث کے متعلّق اختلاف

احادیث لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ ان میں سے چھ کتابیں ایسی ہیں جنہیں صحیح احادیث کے مجموعے سمجھا جاتا ہے انہیں صحاحِ ستّہ کہا جاتا ہے (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابنِ ماجہ اور نسائی)۔ ان میں سے بخاری اور مسلم کو صحیحین کہا جاتا ہے اور بخاری کو اصح الکتاب بعد کتاب اللہ، کا درجہ دیا جاتا ہے۔ بظاہر یہ سمجھا جائے گا کہ احادیث کے ان مجموعوں میں جس قدر احادیث درج ہیں، وہ (شیعہ حضرات کو چھوڑ کر باقی) مسلمانوں کے نزدیک، صحیح احادیث ہیں لیکن حقیقت یہ نہیں۔ اہلِ حدیث کا اس باب میں مسلک یہ ہے کہ

> بخاری اور مسلم کی صحت پر اُمّت متفق ہے .... ان احادیث کی صحت قطعی ہے۔
>
> (جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث، ص ۴۸)

؎ ہم نے اس سلسلہ میں شیعہ حضرات کے متعلّق بات نہیں چھیڑی۔ اس لئے کہ ان کے احادیث کے مجموعے الگ ہیں اور فقہ کے قوانین الگ۔ وہ سنّت، حدیث، یا فقہ کے متعلّق، سنّی حضرات کے کسی فیصلے کے مُتّبع نہیں ہو سکتے۔

قطعی صحت کے معنی یہ ہیں کہ

تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآن عزیز کا ہے۔ اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان و دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا........ جو احادیث قواعدِ صحیحہ اور ائمہ سنّت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں، ان کا انکار کفر ہوگا اور ملّت سے خروج کے مرادف

(ایضاً) صـ۵۵

یعنی، ان حضرات کے عقیدہ کی رُو سے، بخاری یا مسلم کی کسی ایک حدیث سے انکار کفر ہے اور دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مرادف۔ اس کے برعکس مودودی صاحب کا مسلک یہ ہے کہ:۔

یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں ہے کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو بھی جوں کا توں، بلا تنقید، قبول کر لینا چاہیئے۔ (ترجمان القرآن۔ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۵۲ء)

اس ایک نکتہ کی رُو سے بھی دیکھئے، تو مودودی صاحب اور ان کے ہمنوا حضرات، اہلِ حدیث حضرات کے عقیدہ کے مطابق، کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج قرار پا جاتے ہیں۔ جمعیتِ اہلِ حدیث کا عقیدہ یہ ہے کہ:۔

جبریل، قرآن اور سنّت دونوں کو لے کر نازل ہوتے تھے۔ آنحضرتؐ کو سنّت بھی قرآن کی طرح سکھاتے تھے۔ اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں۔

(جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث صـ۶)

اس کے برعکس، مودودی صاحب کا مسلک یہ ہے کہ:۔

قولِ رسولؐ اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں، لازماً ایک ہی چیز نہیں ہیں اور نہ ان روایات کو استناد کے لحاظ سے آیاتِ قرآن کا ہم پلّہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیاتِ قرآن کے منزّل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں۔ بخلاف اس کے، روایات میں اس شک کی گنجائش ہے کہ جس قول یا فعل کو نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کی طرف منسوب کیا گیا ہے، وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں۔

(رسائل و مسائل، جلد اوّل، صـ۲۷)

حدیث کی تاریخ

جو حضرات علمِ حدیث اور اس کی تاریخ سے واقف نہیں، ان کی اطلاع کے لئے، یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتّب کر کے امّت کو نہیں دیا تھا۔ نہ ہی خلفائے راشدینؓ یا دیگر صحابہ کبارؓ نے کوئی ایسا مجموعہ مرتّب کیا۔ جسے

احادیث کا صحیح ترین مجموعہ (یعنی بخاری) کہا جاتا ہے۔ وہ، رسول اللہ کی وفات کے قریب اڑھائی سو سال بعد انفرادی طور پر مرتب ہوا۔ وہ بھی کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کی رُو سے نہیں، بلکہ اس طرح کہ امام بخاریؒ سے ایک شخص نے آکر رسول اللہ کی کوئی بات بیان کی۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ تمہیں اس کا کیسے علم ہوا۔ اس نے کہا کہ میں نے اسے فلاں شخص سے سنا تھا جو اب فوت ہو چکا ہے اس نے فلاں سے، اس نے فلاں سے --- اور اس طرح آخری راوی نے رسول اللہ سے سُنا تھا۔ ان راویوں کو اس حدیث کی سند کہا جاتا ہے اور اس سلسلہ کو سلسلۂ اسناد جس حدیث کو صحیح کہا جاتا ہے، اس کے صحیح ہونے کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ اس کے بیان کرنے سے راویوں کے متعلق، بعد میں (یعنی ان کی وفات کے سینکڑوں برس بعد) یہ تحقیق کر لیا گیا تھا کہ وہ بڑے قابلِ اعتماد لوگ تھے۔ لہٰذا، جس بات کو رسول اللہ کی حدیث کہا جاتا ہے، وہ دراصل، قول منسوب الی الرسول" ہوتی ہے، یعنی ایسی بات جسے رسول اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ:-

> اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح و معتبر ہونا بجائے خود زیرِ بحث ہوتا ہے۔ آپ (فریقِ مقابل) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسول مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ (رسائل و مسائل، صفحہ ۲۵)

یعنی جس بنیاد کی رُو سے آج تک احادیث کو صحیح یا غلط قرار دیا جاتا تھا، مودودی صاحب سرے سے اس بنیاد ہی کو غلط قرار دیتے ہیں اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ:-

> مثال کے طور پر آج میں ایک تقریر کرتا ہوں اور کئی ہزار آدمی اس کو سنتے ہیں جلسہ ختم ہونے کے چند گھنٹے بعد ہی، (مہینوں اور برسوں کے بعد نہیں، بلکہ چند گھنٹے بعد ہی) لوگوں سے پوچھ لیجئے کہ مقرر نے کیا کہا؟ آپ دیکھیں گے کہ تقریر کا مضمون نقل کرنے میں سب کا بیان یکساں نہ ہوگا۔ کوئی کسی ٹکڑے کو بیان کرے گا، کوئی کسی ٹکڑے کو۔ کوئی کسی جملے کو لفظ بہ لفظ، نقل کرے گا، کوئی اس مفہوم کو جو اس کی سمجھ میں آیا ہے، اپنے الفاظ میں بیان کر دے گا۔ کوئی زیادہ فہیم آدمی ہوگا اور تقریر کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اس کا صحیح ملخص بیان کر دے گا۔ کسی کی سمجھ زیادہ اچھی نہ ہوگی۔ اور وہ مطلب کو اپنے الفاظ میں اچھی طرح ادا نہ کر سکے گا۔ کسی کا حافظہ اچھا ہوگا اور وہ تقریر کے اکثر حصے، لفظ بہ لفظ نقل کر دے گا۔ کسی کی یاد اچھی نہ ہوگی وہ نقل و روایت میں غلطیاں کرے گا۔
>
> (تفہیمات، حصّہ اوّل، صفحہ ۳۲۹،۳)

اس سے واضح ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک :-

(۱) حدیث کی کوئی کتاب بھی ایسی نہیں جس کی ہر حدیث کو صحیح تسلیم کر لیا جائے۔

(۲) احادیث کو پرکھنے کا جو اصول، ائمہ حدیث نے بیان اور اختیار کیا تھا اور جس کی رُو سے احادیث کی جانچ پڑتال کر کے، صحیح احادیث کو غلط سے الگ کر لیا تھا، وہ اصول ہی صحیح نہیں۔

لہٰذا،__

احادیث کا صحیح مجموعہ نئے سرے سے مرتب کیا جائے

(۳) احادیث کے تمام مجموعوں کی از سرِ نو جانچ پڑتال کر کے، صحیح احادیث کو ضعیف احادیث سے الگ کیا جائے گا۔

اس سے یہ اہم سوال سامنے آیا کہ ایسا کون کرے گا اور اس کے پاس وہ کون سا معیار ہو گا جس کی رُو سے وہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی نکھار کر الگ کر دے گا۔ اس کے متعلق مودودی صاحب جو کچھ فرماتے ہیں، وہ غور سے سننے کے قابل ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایسا وہی شخص کر سکتا ہے__

مزاج شناسِ رسولؐ

جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو۔ کثرتِ مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ کا مزاج شناس ہو جاتا ہے...... اس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے...... اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد، وہ اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر افتادہ پتھر کے اندر، ہیرے کی جوت کو دیکھ سکتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس جامِ زرّیں میں جو بادہ معنی بھری ہوئی ہے، وہ طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبویؐ کے مناسب نظر نہیں آتی۔ (تفہیمات حصہ اوّل، صـ ۳۰۲ ; صـ ۳۲۴)

مودودی صاحب کی اس "مزاج شناسیٔ رسولؐ" کے متعلق مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کا ارشاد ہے کہ :-

اگر ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے اپنے کسی بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا رسولؐ

کا مزاج شناس تصور کر لے پھر اسے اختیار دے دے کہ اصولِ محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کر لے اور جسے چاہے رد کر دے۔ یا کوئی عالم یا قائد بلا وجہ کسی موضوع یا مختل، مرسل یا منقطع حدیث کے متعلّق یہ دعویٰ کر دے کہ میں نے اس میں "ہیرے کی جوت" دیکھ لی ہے تو یہ مضحکہ خیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے۔ ہم انشاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنّتِ رسولؐ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ (جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث، ص ۶۳)

ملخّص

جو کچھ اس وقت تک لکھا گیا ہے، اس سے واضح ہے کہ

(۱) آئینِ پاکستان (۱۹۶۲ء) کی رُو سے، ملک میں کوئی قانون ایسا نافذ نہیں ہوگا جو کتاب و سنّت کے خلاف ہو۔

(۲) اس وقت دنیا میں کوئی کتاب ایسی نہیں جس کے متعلّق یہ دعویٰ کیا جاتا ہو کہ وہ سنّتِ رسولؐ اللہ کا متفق علیہ مجموعہ ہے۔

(۳) ابھی تک یہ بھی متفقہ طور پر طے نہیں پا سکا کہ "سنّت" کی تعریف کیا ہے۔

(۴) مودودی صاحب کا مسلک یہ ہے کہ سنّت کو احادیث کے مجموعوں سے چُن کر مرتب کیا جائے گا۔ (اہلِ حدیث حضرات ایسا کہنے والے کو کافر قرار دیتے ہیں۔)

(۵) لیکن، ان کے نزدیک، احادیث کا بھی کوئی ایسا مجموعہ نہیں جس کی ہر حدیث کو صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ احادیث کے مجموعوں کی ازسرِ نو جانچ پڑتال کر کے، صحیح احادیث کا مجموعہ مرتب کرنا ہوگا۔

(۶) اس جانچ پڑتال کے لئے کوئی اصول نہیں ہوگا۔ اس کا کلیتہً دارومدار، مزاج شناسِ رسولؐ کی نگۂ جوہر شناس پر ہوگا۔ جسے وہ صحیح کہہ دے اُسے صحیح تسلیم کرنا ہوگا۔ جسے وہ مسترد قرار دیدے اسے رد کر دینا پڑے گا۔

(اور آپ کو غالباً یاد ہوگا کہ "منیر انکوائری کمیٹی" کے رُوبرُو جماعتِ اسلامی کے ذمہ دار حضرات نے اس کا اعتراف کیا تھا کہ ان کے نزدیک، یہ "مزاج شناسِ رسولؐ" خود مودودی صاحب ہیں۔)

(۷) مزاج شناسِ رسولؐ، اس طرح سنّت کا مجموعہ مرتب کرنے میں مصروف ہوگا اور اہلِ حدیث حضرات (بلکہ ان کے ساتھ حنفی حضرات بھی) سنّتِ رسولؐ کو اس کے ان "ہوائی حملوں" سے بچانے کی کوشش میں

مشغولِ جہاد!

ایسا ہونا ناممکن ہے

ان تصریحات کی روشنی میں آپ غور فرمایئے کہ کیا یہ کسی طرح ممکن بھی ہے کہ پاکستان میں کوئی ایسا متفق علیہ مجموعۂ قوانین مرتب ہو سکے جو "کتاب وسنت" سے مطابقت کی شرط کو پورا کر سکے؟ اور کیا آپ (ایسا باور کرنے کے لئے تیار ہیں کہ داور لوگوں کو تو چھوڑیئے) مودودی صاحب اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ایسا ہونا ناممکن ہے! وہ اس سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ اسی لئے وہ اس شرط پر اصرار کئے جاتے ہیں۔ اس کی تہ میں راز یہ ہے کہ اس سے انہیں ہر برسرِ اقتدار پارٹی کے خلاف پراپیگنڈہ کرنے کے لئے یہ مستقل LEVER مل جاتا ہے کہ دیکھئے! یہ لوگ یہاں اسلامی قوانین نافذ نہیں کرتے، اس لئے اقتدار ان کے ہاتھ سے چھین لینا چاہیئے۔ اگر مودودی صاحب اپنے اس مطالبہ میں صادق تھے تو ان کے لئے کرنے کا کام یہ تھا کہ وہ مختلف مکاتبِ فکر کے علماء کو ساتھ لے کر ایک ایسا مجموعۂ قوانین مرتب کرتے جو یہاں کے بسنے والے تمام مسلمانوں کے نزدیک کتاب وسنت سے مطابقت کی شرط پر پورا اُترتا اور اس کے ساتھ ہی ہمارے زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتا۔ اگر کوئی برسرِ اقتدار پارٹی اس کی مخالفت کرتی، تو پھر انہیں اس کا حق حاصل تھا کہ خدا اور رسولؐ کے نام پر اس پارٹی کی مخالفت کرتے لیکن وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے، اس لئے وہ اس قسم کا قدم اٹھا کر اپنے کھیل کو کیوں بگاڑ لیں۔ وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ جب "کتاب وسنت" کی مطابقت کی شرط کی رُو سے، دُنیا بھر کے مسلمان، ہزار برس میں، نماز کی کوئی متفق علیہ شکل متعیّن نہیں کر سکے، تو وہ ایسا ضابطۂ قوانین کس طرح مدوّن کر لیں گے جو زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہو؟ لہٰذا، کامیابی اسی میں ہے کہ اس ناممکن العمل شرط پر زور دیئے جائیں اور اپنا پراپیگنڈہ جاری رکھیں۔

بہر حال، آپ نے یہ دیکھ لیا کہ ملک میں کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب ہو ہی نہیں سکتا جو یہاں کے بسنے والے تمام مسلمانوں کے نزدیک "کتاب وسنت" کی مطابقت کی شرط پہ پورا اُتر سکے اور ظاہر ہے کہ جب ایسا ضابطۂ قوانین بن ہی نہیں سکتا تو پھر

پاکستان اسلامی ملک کس طرح بن سکتا ہے؟

امکانی صورت کیا ہے؟

اس مقام پر آپ یقیناً یہ کہیں گے کہ یہ تو یکسر نا امیدی کی صورت ہے۔ اور تم نے شروع میں کہا تھا کہ اس میں نا امیدی کی کوئی بات نہیں، تو پھر امید کی صورت کیا ہے؟

اس میں اُمیّد کی صورت ہی نہیں بلکہ یقینی بات ہے کہ یہاں اسلامی قوانین مرتّب ہو سکتے ہیں اور اس طرح پاکستان اسلامی مملکت بن سکتا ہے۔ اس کے لئے ہمیں قرآن کریم کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

آپ قرآنِ کریم پر غور کیجئے۔ اس میں (معاشرتی زندگی سے متعلق چند قوانین کے علاوہ) زندگی کے تمام معاملات سے متعلّق صرف اصولی راہنمائی دی گئی ہے۔ ان کے جزئی احکام متعیّن کر کے نہیں دیئے گئے۔ جس کتاب کو، قیامت تک کے انسانوں کے لئے ضابطۂ ہدایت بننا تھا، اس کا انداز ہونا ہی ایسا چاہیئے تھا۔ انسانی زندگی کے تقاضے عہد بہ عہد بدلتے رہتے ہیں۔ ان بدلنے والے تقاضوں سے متعلّق جزئی احکام اس طرح متعیّن ہی نہیں کئے جا سکتے کہ ہر زمانے کے انسانوں کے لئے ان کی پابندی ممکن ہو۔ ذرا سوچئے کہ اگر وہ قوانین، جو ہمارے زمانے کے تقاضوں کو پورا کر سکیں، آج سے چودہ سو برس پہلے کے عربوں کو دے دیئے جاتے، تو ان پر عمل کرنا تو ایک طرف، وہ انہیں سمجھ بھی نہ سکتے۔ (مثلاً) ان سے اگر کہا جاتا کہ انشورنس کے متعلّق قانون یہ ہے اور بنکنگ کے متعلق یہ، تو وہ جب انشورنس اور بنکنگ کے سسٹم ہی سے ناآشنا تھے اور یہ سسٹم اس زمانے میں اس طرح موجود ہی نہ تھا، تو ان کے لئے یہ قوانین بے معنی ہوتے۔ اس کے برعکس، جو قوانین صرف اس زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے دیئے گئے تھے اگر انہیں ابدی طور پر مستقل اور غیر متبدّل قرار دے دیا جاتا تو زندگی ایک خاص ماحول میں جکڑ کر رہ جاتی اور ہمارے لئے ان پر عمل کرنا مشکل ہو جاتا۔ اس کے لئے یا تو یہ صورت ممکن تھی کہ ہر دور میں ایک نیا رسول آتا جو اپنے دور کے انسانوں کے لئے نئے قوانین دیتا (جیسا کہ نبیٔ اکرمؐ سے پہلے ہوتا چلا آیا تھا) لیکن ختمِ نبوّت نے اس شکل کو بھی ختم کر دیا۔ اب دوسری صورت یہی تھی کہ جزئی قوانین دینے کے بجائے ایسے اصولِ حیات دے دیئے جاتے جن کے تابع انسانی زندگی کو رکھنا مقصود تھا۔ اور ہر زمانے کے انسانوں کو اس کی آزادی ہوتی

ثبات و تغیّر کا امتزاج

کہ وہ، ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے باہمی مشاورت سے، جزئی قوانین خود مرتّب کریں۔ یہ اصول ہمیشہ کیلئے غیر متبدّل رہتے اور ان کے اندر مرتّب کردہ جزئی قوانین زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہتے۔ قرآنِ کریم نے یہی انداز اختیار کیا۔ علامہ اقبالؒ کہ جنہوں نے پاکستان کا تصوّر دیا تھا تاکہ یہ مملکت اسلامی بن سکے، اس باب میں لکھتے ہیں۔

> اسلام کا پیش کردہ تصوّر یہ ہے کہ حیاتِ کلّی کی روحانی اساس ازلی و ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیّر و تنوّع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلّق اس قسم کے تصوّر پر متشکّل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیّر پذیر عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری

ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و نسق کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں......... لیکن اگر ان ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے کے اندر تغیّر کا امکان ہی نہیں تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے یکسر جامد اور متصلّب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی ابدی اور غیر متبدّل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیّر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

(خطبات، تشکیلِ جدید)

قرآن کریم کے ان غیر متبدّل اصولوں کی جزئیات، سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق مرتب فرمائیں۔ ان جزئیات کا ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رکھا جانا، نہ مقصودِ دین تھا، نہ منشائے رسالت۔ یہ وجہ تھی کہ حضورؐ نے ان جزئیات کو مدوّن کر کے ان کا مجموعہ اُمّت کو نہ دیا اور نہ ہی خلفائے راشدین نے ایسا کیا۔ اس کے برعکس، ہمیں تاریخ میں متعدد واقعات ایسے ملتے ہیں، جن میں خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں ان جزئیات میں ردّ و بدل کیا گیا۔ (طلوعِ اسلام اس باب میں اس سے پہلے اس قدر تفصیل سے لکھ چکا ہے کہ اس مقام پر اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ جو حضرات ان تفاصیل کا مطالعہ کرنا چاہیں، وہ ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "سلیم کے نام خطوط" (حصّہ دوم) کے متعلقہ خطوط مطالعہ فرمالیں) علّامہ اقبالؒ اس باب میں لکھتے ہیں۔

احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اوّل الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلّم نے علیٰ حالہٖ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جا سکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانۂ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا ہے۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسولؐ اللہ نے علیٰ حالہٖ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحب نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریقِ تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسولؐ کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص

طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اوّلین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے۔ لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلکِ زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا، پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رُو سے رسولؐ کے احکام اُس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امامِ اعظم ابو حنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنے فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث سے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے............ ان حالات کی روشنی میں، میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے، امام ابو حنیفہ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا۔ اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنّن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من و عن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہِ اسلامی کے بلند ترین مقنّنین میں ہوتا ہے۔ (خطبات اقبالؒ صفحہ ۱۶۴۔ ۱۶۳)

شاہ ولی اللہؒ کا مسلک

علامہ اقبالؒ نے اس باب میں شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ کے مسلک کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ہمارے زمانے میں مسلکِ ولی اللّٰہی کے سب سے بڑے شارح اور مبلّغ (مولانا) عبیداللہ سندھی مرحوم تھے۔ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:۔

واضح رہے کہ جب اساسی قانون پر عمل درآمد شروع ہوتا ہے تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنائے جاتے ہیں۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ قانونِ اساسی غیر متبدّل ہوتا ہے اور تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں۔ ہم سنّت ان تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں جو رسولؐ اللہ

اور آپؐ کے بعد خلفائے ثلاثہؓ نے مسلمانوں کی مرکزی جماعت کے مشورہ سے تجویز کئے تھے ......

سنت کو ہمارے فقہائے حنفیہ رسولؐ اللہ اور خلفائے راشدینؓ میں مشترک مانتے ہیں اور یہی ہماری رائے ہے۔ اور یہ سنت قرآن ہی سے پیدا ہوگی۔ آجکل کی اصطلاح میں اس کو بائیلاز کہا جاتا ہے۔ اصل قانونِ اساسی متعیّن ہے۔ بائیلاز، اُس وقت اور تھے، اِس وقت اور ہوں گے جن میں زمانے کے اقتضات کے مطابق فروعی تبدیلیاں ہوں گی۔ نئی نئی پیش آمدہ صورتوں کے متعلق تفصیلی احکام کا استخراج ہوگا اور اس کا نام فقہ ہے۔[1] (رسالہ الفرقان، ولی اللّٰہی نمبر ۱۹۴۱ء)

مودودی صاحب اسکی تائید کرتے ہیں

اور، آپ کو یہ معلوم کر کے شاید تعجب ہوگا کہ مودودی صاحب بھی اس مسلک کی تائید کرتے ہیں۔ وہ تفہیمات (جلد اوّل) میں لکھتے ہیں:۔

دین کے اصول سب کے سب کتاب اللہ میں موجود ہیں جو روایات سے بالاتر اور سب مسلمانوں میں مشترک ہیں۔ (ص ۳۳۹)

وہ رسائل و مسائل (جلد اوّل) میں لکھتے ہیں۔

یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جن چیزوں پر کفر و اسلام کا مدار ہے اور جن امور پر انسانوں کی نجات موقوف ہے انہیں بیان کرنے کا اللہ تعالےٰ خود ذمہ لیتا ہے۔ وہ سب قرآن میں بیان کی گئی ہیں اور قرآن میں بھی ان کو کچھ اشارۃً یا کنایۃً بیان نہیں کیا گیا بلکہ پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۹۲/۱۲ (ص ۶۷)

وہ اپنی تفسیر، تفہیم القرآن (ص ۵۹۸) میں لکھتے ہیں:۔

حرام اور حلال..... جائز اور ناجائز کی حدود مقرر کرنا اور انسانی زندگی کے لئے قانون اور شرع تجویز کرنا، یہ سب خدا ہی کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں سے کسی کو غیر اللہ کے لئے تسلیم کرنا شرک ہے۔

اس حقیقت کی تشریح کرتے ہوئے وہ تفہیمات (حصّہ دوم) ص ۳۸۹ میں لکھتے ہیں:۔

---

[1] جو حضرات اس باب میں مزید تفاصیل معلوم کرنا چاہیں وہ ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقامِ حدیث" (جدید ایڈیشن) کا مطالعہ فرمائیں۔ یہ اقتباس بھی وہیں سے لیا گیا ہے۔

اسی اصل کی طرف وہ حدیث اشارہ کرتی ہے جو ابوداؤد نے سلمان فارسیؓ سے بدیں الفاظ نقل کی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ الحلال ما احل اللہ فی کتابہ والحرام ما حرم اللہ فی کتابہ وما سکت عنہ فھو مما عفا عنہ۔ حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا۔ رہی وہ چیزیں جن کا ذکر نہیں کیا گیا تو وہ معاف ہیں۔

وہ اس سوال کا جواب کہ اللہ تعالےٰ نے دین کی جزئیات بھی خود ہی متعیّن کیوں نہیں کر دیں، اپنی تفسیر تفہیم القرآن (جلد اوّل) کے صفحات ص۵۰۶، ۵۰۷) پر ان الفاظ میں دیتے ہیں:۔

ایک دوسری حدیث میں ہے۔ ان اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا وحرم حرمٰت فلا تنتھکوھا وحد حدودا فلا تعتدوھا وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا۔ اللہ تعالےٰ نے کچھ فرائض تم پر عاید کئے ہیں انہیں ضائع نہ کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے ان کے پاس نہ پھٹکو، کچھ حدود مقرر کی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو، اور کچھ چیزوں کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے، بغیر اس کے کہ اسے بھول لاحق ہوئی۔ لہٰذا ان کی کھوج نہ لگاؤ۔

ان دونوں حدیثوں میں ایک اہم حقیقت پر متنبہ کیا گیا ہے جن امور کو شارع نے مجملاً بیان کیا ہے اور ان کی تفاصیل نہیں بتائیں یا جو احکام بر سبیلِ اجمال دیئے ہیں اور مقدار یا تعداد یا دوسرے تعیّنات کا ذکر نہیں کیا ہے ان میں اجمال اور عدم تفصیل کی وجہ یہ نہیں ہے کہ شارع سے بھول ہو گئی تفصیلات بتانی چاہئیں تھیں مگر نہ بتائیں بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ شارع ان امور کی تفصیلات کو محدود نہیں کرنا چاہتا اور احکام میں لوگوں کے لئے وسعت رکھنا چاہتا ہے اب جو شخص خواہ مخواہ سوال پر سوال نکال کر تفصیلات اور تعیّنات اور تقییدات بڑھانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر شارع کے کلام سے یہ چیزیں کسی طرح نہیں نکلتیں تو قیاس سے استنباط سے کسی نہ کسی طرح مجمل کو مفصّل، مطلق کو مقیّد، غیر معین کو معین بنا کر ہی چھوڑتا ہے۔ وہ درحقیقت مسلمانوں کو بڑے خطرے میں ڈالتا ہے (یہودیوں نے ایسا ہی کیا)، جن کے نقشِ قدم پر چلنے میں قرآن اور محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تنبیہات کے باوجود مسلمانوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔

(جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) قرآن کریم میں بیان کردہ اصولی احکام کی جزئیات، سب سے پہلے، عہدِ رسالت مآبؐ اور خلافتِ راشدہ میں متعیّن ہوئیں۔ کیا یہ جزئیات ابدالآباد تک جوں کی توں رہیں گی یا ان میں، حسبِ اقتضائے حالات تغیّر و تبدّل کیا جا سکے گا۔ اس کے متعلّق مودودی صاحب لکھتے ہیں:-

> یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجاآوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام مقامات اور تمام حالات میں اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسی بھی ہیں جن میں تغیرِ حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیّر ہونا ضروری ہے۔ جو حالات عہدِ رسالتؐ اور عہدِ صحابہؓ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے، لازم نہیں کہ بعینہٖ وہی حالات ہر زمانہ اور ہر ملک کے ہوں۔ لہٰذا احکامِ اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئیں تھیں، ان کو ہو بہو تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح اور حکم کے لحاظ سے ان کی جزئیات میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روحِ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں...... پس معلوم ہوا کہ جزئیات میں دلالۃ النص اور اشارۃ النص تو درکنار، صراحۃ النص کی پیروی بھی تفقّہ کے بغیر درست نہیں ہوئی اور تفقّہ کا اقتضاء یہ ہے کہ انسان ہر مسئلہ میں شارع کے مقاصد و مصالح پر نظر رکھے اور انہیں کے لحاظ سے جزئیات میں تغیرِ احوال کے ساتھ ایسا تغیر کرتا رہے جو شارع کے اصولِ تشریع پر مبنی اور اس کے طرزِ عمل سے اقرب ہو۔
>
> (تفہیمات، حصّہ دوم، صہ ۳۲۷)

ہم نماز کیسے پڑھیں

آپ نے دیکھا کہ مودودی صاحب خود اس اصول سے متفق ہیں کہ جن احکام کو قرآنِ کریم نے مجمل طور پر بیان کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تفاصیل زمانے کے تقاضے کے ساتھ بدلتی رہیں گی۔ اس اصول کے ماتحت پاکستان میں اسلامی قوانین آسانی سے مرتّب ہو سکتے تھے۔ لیکن جب (جیسا کہ ہم ذرا آگے چل کر بیان کریں گے) یہی اصول دوسروں نے پیش کیا تو یہی مودودی صاحب اس کی مخالفت میں سب سے آگے بڑھ آئے اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے، تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے سب طریقے بدل جائیں گے کیونکہ ان کی تفاصیل تو قرآن میں نہیں ہیں، یہ تفاصیل ہمیں احادیث سے ملتی ہیں۔ لہٰذا، جو تفاصیل احادیث میں ملتی ہیں وہ بھی سب کی سب غیر متبدّل ہیں۔ البتہ یہ مسئلہ کہ ان میں کون کون سی بات صحیح ہے اور کون سی غلط، اس کا فیصلہ مزاج شناسِ رسولؐ ہی کرے

گا. آپ نے غور فرمایا کہ یہ صاحب کس طرح پھر پھرا کر اسی ایک نقطہ پر آجاتے ہیں کہ قانون سازی کے آخری اختیارات مزاج شناسِ رسولؐ کو حاصل ہونے چاہئیں۔

بہر حال، یہ ہے وہ طریق جس کے مطابق پاکستان میں اسلامی قوانین مرتّب کئے جا سکتے ہیں، یعنی جو کچھ قرآن کریم میں دیا گیا ہے، وہ غیر متبدّل ہے اور زندگی کے جن معاملات میں اس نے اصولی راہنمائی دی ہے، ان کے تفصیلی احکام، ہم اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشاورت سے خود مرتّب کر سکتے ہیں. اس ضمن میں، دو ایک اعتراضات کئے جاتے ہیں، جن کا جائزہ لینا ضروری ہے مثلاً

اعتراضات کا جواب

(۱) یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن کے اصولوں میں بھی تو تعبیر (INTERPRETATION) کا اختلاف ہو سکتا ہے. لہٰذا، اس سے بھی متفق علیہ قوانین کس طرح مرتّب ہو سکیں گے۔

ہم نے دیکھا یہ ہے کہ یہ اعتراض اکثر ان لوگوں کی طرف سے کیا جاتا ہے جنہوں نے قرآن کریم کا خود غائر مطالعہ نہیں کیا۔ وہ محض سنی سنائی باتوں سے ایسا کہہ دیتے ہیں۔ قرآن کا اندازِ بیان ایسا صاف، سیدھا اور واضح ہے کہ اس کے سمجھنے میں کسی قسم کا ابہام نہیں ہوتا. مودودی صاحب کے الفاظ میں :۔

> قرآن کریم اپنے مدّعا کو بغیر کسی ابہام کے صاف صاف بیان کرتا ہے اور اس نے کسی ایسی حقیقت کو جس کا جاننا آدمی کے لئے ضروری تھا. واضح کئے بغیر نہیں چھوڑا ۔
>
> (ترجمان القرآن، بابت اپریل، مئی ۵۲ء)

قرآن کی تعبیر کے اختلاف کے سلسلہ میں یہ لوگ، مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے اختلافات کو بطور دلیل پیش کر دیتے ہیں۔ انہیں اس کا علم نہیں کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کا اختلاف روایات کے اختلاف کا نتیجہ ہے قرآن کی تعبیر میں اختلاف کا نتیجہ نہیں۔ ہمارے مختلف فرقوں کے عقائد، عبادات، مناسک، فقہی قوانین، سب کی بنیاد روایات ہیں. حتیٰ کہ ان کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ حدیث، قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے (ملاحظہ فرمایئے۔ حافظ محمدؐ ایوب صاحب کا کتابچہ، فتنۂ انکارِ حدیث") اور صرف حدیث ہی نہیں ائمۂ فقہ کے اقوال بھی قرآن کو منسوخ کر سکتے ہیں. اس ضمن میں فقہ حنفی کے امام، ابوالحسن عبید اللہ الکرخیؒ کا ارشاد ہے کہ

> ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں، وہ یا تو ماوّل ہے اور یا منسوخ۔
>
> (تاریخ فقہ اسلامی علامہ الخضری صفحہ ۳۲۲)

اس لئے ہمارے مختلف فرقوں کے اختلافات کا سبب روایات اور فقہ کے اختلافات ہیں، قرآن کریم نہیں۔

فرقۂ اہلِ قرآن

بعض لوگوں کو یہ بھی کہتے سنا گیا ہے کہ فرقۂ اہلِ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ قرآن خالص سے احکام متعین کرتے ہیں لیکن ان میں بھی باہمی اختلاف ہے۔ ایسا کہنے والوں کو دراصل اس کا علم نہیں کہ فرقۂ اہلِ قرآن نے کون سی باتیں قرآن سے متعین کرنے کی کوشش کی اور ان میں باہمی اختلاف ہوا۔ قرآن نے جن امور کو اصولی طور پر بیان کیا ہے، یہ فرقہ ان کی جزئیات کو قرآن سے متعین کرنے لگ گیا۔ اب ظاہر ہے کہ جو باتیں قرآن میں ہوں ہی نہ، اگر کوئی انہیں بھی قرآن سے متعیّن کرنے بیٹھ جائے تو ان میں اختلاف نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا؟ جو لوگ یہ بھی قرآن سے متعیّن کرنا چاہیں کہ نماز میں ہاتھ کہاں باندھنے چاہئیں، ان میں اختلاف کے سوا اور کیا ہوگا؟ فرقۂ اہلِ قرآن کی یہی بنیادی غلطی تھی جس کی وجہ سے وہ خود ناکام رہا اور اس کی وجہ سے قرآن بدنام ہوگیا۔ دوسرے یہ کہ ان حضرات کے نزدیک، اسلام کی حیثیت بھی (عام تصوّر کے مطابق) مذہب کی تھی، نظامِ حکومت کی نہیں تھی۔ اس فرقہ کے بانی (مولانا) عبیداللہ چکڑالوی مرحوم کے ہاں "نظام" کا لفظ تک نہیں ملتا۔ اس لئے یہ حضرات انفرادی طور پر قرآنی فقہ مرتّب کرنے لگ گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری امّت کے لئے ایک متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب کرنا تو ایک طرف، یہ آپس میں بھی اتنا طے نہ کرسکے کہ نماز کتنے وقتوں کی فرض ہے۔ قرآن نے زندگی کے جو اصول و احکام دیئے ہیں وہ صاف اور واضح ہیں۔ جن جزئیات سے متعلق وہ خاموش رہا ہے ان کے متعلق اس کی تعلیم یہ ہے کہ انہیں امت باہمی مشورے سے مرتّب کرے۔ اس طریق کو اختیار کیجئے۔ اور پھر دیکھئے کہ اس باب میں کوئی اختلاف پیدا ہوتا ہے؟ اس دعویٰ کا زندہ ثبوت خود عہدِ رسالتمآب اور دورِ خلافتِ راشدہ ہے جس میں اس طریق کو اختیار کیا گیا اور امت میں کوئی اختلاف (یا فرقہ) پیدا نہ ہوا۔

اور اگر یہ واقعہ بھی ہو کہ فرقۂ اہلِ قرآن یا کسی اور کو قرآن کریم کے کسی حکم کے سمجھنے میں غلطی لگ گئی ہے تو کیا اس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ قرآنی احکام کا صحیح مفہوم متعیّن ہی نہیں کیا جا سکتا اور اس میں اختلافی باتیں بھی موجود ہیں؟ ایسا سمجھنے سے تو نہ قرآن کی کوئی حیثیت باقی رہتی ہے نہ اس پر ہمارا ایمان ـــــ اس نے تو اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا. (۴/۸۲)

کیا یہ لوگ قرآن میں غور و تدبّر نہیں کرتے۔ اگر یہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس

میں یہ لوگ بہت سے اختلاف پاتے۔

لہٰذا، قرآن فہمی میں اختلاف، غور و تدبر سے رفع ہو سکتا ہے۔ پھر اسے بھی سمجھ لیجئے کہ جو سوال ہمارے زیرِ نظر ہے، وہ قرآنی اصولوں کی روشنی میں، جزئی احکام کی تدوین ہے اور یہ کام انفرادی طور پر کرنے کا نہیں، یہ قرآن کریم اور حالاتِ حاضرہ پر غائر نگاہ رکھنے والے نمائندگانِ امّت کا اجتماعی فریضہ ہوگا۔ قانون سازی کا یہی طریقہ عہدِ رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ میں تھا۔ اسی کو اب اختیار کرنا چاہیئے۔ آپ نے غور نہیں فرمایا کہ قرآن کریم میں خود نبئ اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ ـــ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۸) امورِ مملکت میں لوگوں سے مشورہ کیا کرو۔

خدا اور رسولؐ کی اطاعت

پھر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ قرآن میں خدا اور رسولؐ کی اطاعت کا حکم ہے۔ اس طرح کی قانون سازی میں "اطاعتِ رسولؐ" کس طرح کی جاسکے گی؟

سوال یہ ہے کہ جس طرح اس وقت اطاعتِ رسول کی جاتی ہے کیا اس کے متعلّق کوئی فرد یا کوئی فرقہ حتمی اور یقینی طور پر ثابت کر سکتا ہے کہ وہ فی الواقع اطاعتِ رسول کر رہا ہے؟ مثلاً نماز کو لیجئے۔ اس کے ادا کرنے میں ہر فرقے میں اختلاف ہے اور ہر فرقہ یہ کہتا ہے کہ اس کا طریقِ نماز، رسول اللہؐ کے طریقہ کے عین مطابق ہے۔ کیا آپ باور کر سکتے ہیں کہ ہر فرقے کا یہ دعویٰ صحیح ہے۔ ایسا ہو نہیں سکتا۔ لہٰذا، اس وقت، اطاعتِ رسولؐ کا

فرقہ بندی شرک ہے

عملی مفہوم اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ جس طریق پر کوئی چل رہا ہے، اس سے اس نے اپنے آپ کو اطمینان دے رکھا ہے کہ وہ اطاعتِ رسول کر رہا ہے۔ یہ وہی ذہنیت ہے جو فرقہ بندی کا فطری نتیجہ ہے اور جسے قرآن نے ان الفاظ میں واضح کیا ہے کہ:-

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۙ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۔ (۳۰/۳۱-۳۲)

مسلمانو! دیکھنا، تم کہیں اسلام لانے کے بعد، مشرک نہ ہو جانا، یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے۔ پھر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے ہر فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ جس طریق پر میں چل رہا ہوں وہ حق کا طریق ہے۔

آپ اس آیتِ جلیلہ پر سے یونہی سرسری طور پر نہ گزر جائیے۔ یہ ایک عظیم حقیقت کی آئینہ دار ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ

(۱) مسلمانوں میں فرقوں کا وجود شرک ہے۔

(۲) فرقہ بندی سے کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ بجائے اس کے کہ فرقہ پرستانہ عصبیت سے الگ ہو کر یہ سوچا جائے کہ حق کی راہ کون سی ہے، ہر فرقہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو جھوٹا اطمینان دلا لیتا ہے کہ ہم حق پر ہیں، اطاعتِ خدا اور رسولؐ اسی طریق سے وابستہ ہے جسے ہم نے اختیار کر رکھا ہے۔

کیا اس قسم کی خود اطمینانی کو اطاعتِ رسولؐ کہا جا سکتا ہے؟

قرآن کریم کی رُو سے "اطاعتِ خدا اور رسولؐ" کا مفہوم کیا ہے، اس کے متعلق ہم بارہا بار شرح و بسط سے لکھ چکے ہیں۔[1] اس وقت صرف آنا دہرا دینا کافی ہے کہ اس سے مفہوم ہے اس نظامِ حکومت کی اطاعت جو خدا کے احکام کو نافذ کرنے کے لئے قائم کی جائے۔ اس نظام کو سب سے پہلے نبیٔ اکرمؐ نے قائم فرمایا اور اس کے بعد حضورؐ کے سچے جانشینوں نے اسے جاری رکھا۔ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد، اس نظامِ حکومت کی اطاعت جسے خلافت علیٰ منہاجِ نبوّت کہا جاتا ہے "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" تھی۔ جب تک یہ سلسلہ قائم رہا "خدا اور رسولؐ" کی اطاعت ہوتی رہی۔ اس کے بعد، خدا اور رسول کی اطاعت سے مفہوم اُس فرقہ کے مسلک کی اطاعت رہ گیا جس سے کوئی شخص منسلک ہو گیا۔ اس طریق کی رُو سے اطاعتِ رسولؐ کے مدعیوں کے متعلق قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ رسول کو ان سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ۔ (۶/۱۶۰)

جو لوگ دین میں فرقے پیدا کر لیں اور خود ایک گروہ بن بیٹھیں، (اے رسولؐ!) تیرا ان سے کوئی تعلّق نہیں۔

یاد رکھیے! "خدا اور رسولؐ" کی اطاعت کا صحیح طریق وہی ہے جو خلافت علیٰ منہاجِ نبوت میں رائج تھا یعنے ایک اُمّت جس میں کوئی فرقہ نہ ہو۔ ان کا ایک ضابطۂ قوانین اور ان قوانین کو نافذ کرنے والی ایک اتھارٹی۔ اُمّت کے لئے واحد ضابطۂ قوانین مرتّب کرنے کی اس کے سوا کوئی شکل نہیں کہ قرآن کریم کو (جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہے) قانون کی اصل و بنیاد اور سند و حجّت قرار دیا جائے اور اس میں جن امور کی اصولی طور پر رہنمائی دی گئی ہے، ان کے جزئی احکام، باہمی مشاورت سے خود متعیّن کئے جائیں۔ ایسا کرنے میں، فقہ اور روایات سے فائدہ اٹھایا

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "سلیم کے نام خطوط" (جلد دوم) میں متعلّقہ خطوط۔

جائے گا. ان میں جو قوانین ایسے ہوں جو قرآن کے خلاف نہ جاتے ہوں اور ہمارے زمانے کے تقاضے پورے کرتے ہیں، انہیں علیٰ حالہٖ رکھ لیا جائے جو ان تقاضوں کو پورا نہ کرتے ہوں، ان میں مناسب ترمیم کر لی جائے یا ان کی جگہ نئے قوانین مرتّب کر لیے جائیں. اس قسم کے قوانین تدریجاً بنائے اور نافذ کئے جائیں۔

صدر ایوب کا نظریہ

اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ اس باب میں ہمارے حکمران طبقہ کا کیا نظریہ ہے. اس طبقہ کی سب سے زیادہ مستند نمائندگی بہر حال، صدر ایوب خان کرتے ہیں ۔ انہوں نے عسکری انقلاب کی دوسری سالگرہ کی تقریب پر اپنی نشری تقریر میں کہا تھا۔

> علامہ اقبالؒ نے جن کا شمار عصرِ حاضر میں روحِ اسلامی کے بہترین روشن دماغ ترجمانوں میں ہوتا ہے، کس قدر سچی بات کہی ہے کہ اسلام کا پیش کردہ تصوّر یہ ہے کہ حیاتِ کلّی کی روحانی اساس ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیّر و تنوّع کے پیکروں میں ہوتی ہے. ایک معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں. اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیّر و تبدّل کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے. لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیّر کا امکان نہیں ـــــ وہ تغیّر، جسے قرآن کریم نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ـــــ تو اس سے زندگی جو حتماً متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد بن کر رہ جائے گی. یورپ کو سیاسی اور روحانی دوائر میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ ابدی اقدار پر ان کی گرفت نہیں رہی تھی. اور گذشتہ کئی صدیوں میں اسلام کی قوت میں جو ضعف آیا ہے، تو اس کی وجہ یہ جمود و تعطّل تھا۔

اس کے بعد، انہوں نے پھر علامہ اقبالؒ کے یہ الفاظ پیش کیے۔

> قرآن کریم کی اہم تعلیمات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حیات ایک ترقی پذیر عملِ تخلیق ہے، اس لئے ہر نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل آپ تلاش کرے. وہ ایسا کرنے میں اپنے اسلاف (کے علمی سرمایہ) سے راہنمائی لے. لیکن اسلاف کے فیصلے ان کی راہ میں روک نہیں بن سکتے

انہوں نے دستورِ پاکستان کے سلسلہ میں دسمبر ۱۹۵۹ء میں کہا کہ

> جہاں تک اسلامی اصولوں کا تعلق ہے، پاکستان کا دستور یقیناً ان کا آئینہ دار ہوگا. لیکن یہ سمجھ لینا چاہیئے

کہ اسلام کے اصول غیر متبدل رہتے ہیں لیکن ان کی جزئیات، تفصیلات اور طور طریقے حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ان جزئیات کو ہمارے موجودہ حالات کے مطابق مرتب ہونا چاہیئے۔

(پاکستان ٹائمز، $\frac{12}{59}$ ۱۸)

پھر انہوں نے ۱۳؍جولائی ۱۹۶۰ء کو، ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے گورنروں کے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا:۔

اس امر کی وضاحت نہایت ضروری ہے کہ اسلام کے بنیادی اصول کون سے ہیں۔ اور جن طریقوں سے ان اصولوں کو عمل میں لایا گیا تھا وہ کیا ہیں۔ یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ اس باب میں کوئی الجھن باقی نہ رہے کہ اسلام میں کون سی باتیں غیر متبدل ہیں اور کونسی ایسی ہیں جن میں تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے۔

انہوں نے ۱۹۶۱ء میں عیدالاضحیٰ کے موقع پر قوم کے نام اپنی نشری تقریر میں فرمایا کہ:۔

جہاں تک اسلام کے اصولوں کا تعلق ہے، اسے خود اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ پاک میں وضاحت سے بیان فرما دیا ہے .... اسلام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے اصول ازلی و ابدی ہیں۔ اور ان پر ہر زمانہ اپنے تقاضوں کے مطابق چل سکتا ہے۔ سنت، حدیث، فقہ اس بات کا ثبوت ہیں یہ سب ہمارے لئے روشنی کے مینار ہیں جو ہمیں بتاتے ہیں کہ کس زمانے میں اور کن کن حالات میں خدا کے احکام پر کس کس طرح عمل کیا گیا ہے۔

اسی اصول کے تابع ہم نے مشورہ دیا تھا کہ آئینِ پاکستان میں یہ شق درج کر دی جائے کہ مملکت کا سارا کاروبار قرآن کریم کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے گا اور اس کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں ملک کے قوانین مرتب کئے جائیں گے۔ لیکن آئینِ پاکستان میں یہ شق درج نہ کی گئی۔ اس میں یہ کہا گیا کہ ملک کا کوئی قانون اسلام کے خلاف نہیں ہوگا اور اس کے بعد، مذہبی پیشوائیت کے تقاضوں کے ماتحت اس شق کو یوں بدل دیا گیا کہ ملک کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔

دشوار مرحلہ

اب اتنا واضح ہے کہ (کم از کم) صدرِ مملکت اس حقیقت سے باخبر ہی نہیں بلکہ متفق ہیں کہ غیر متبدل، قرآنی احکام و اصول ہی ہیں۔ ان اصولوں کی روشنی میں تفصیلی احکامات، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہمیں خود مرتب کرنے چاہئیں۔ جو قوانین صدیوں پہلے کے حالات کی روشنی میں مرتب کئے گئے تھے، وہ آج چل نہیں سکتے لیکن معلوم نہیں ان کی وہ کیا دشواریاں تھیں جن کے پیشِ نظر وہ اپنے

اس نظریہ کو آئینی شکل نہ دے سکے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ ملک کو اس انتشار سے بچانا چاہتے ہیں جو مذہبی پیشوائیت ملک کی جاہل آبادی کے جذبات کو برانگیختہ کر کے، پیدا کرنا چاہتی ہے۔ وہ جاہل آبادی جس کی یہاں اس قدر اکثریت ہے اور جسے مذہب کے نام پر بڑی آسانی سے مشتعل کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں اس سے اتفاق ہے کہ ملک میں امن قائم رکھنا ضروری ہے لیکن اس سے پھر یہ سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ ان حالات میں تو ملک میں اسلامی قوانین کی تدوین و تنفیذ کا کوئی امکان نہیں رہتا۔ اس کے لئے امکانی صورت یہی ہو سکتی تھی کہ ملک میں اس نظریہ کی نشر و اشاعت عام کی جائے اور دوسری طرف مذہبی پیشوائیت کے اثر کو کم کیا جائے۔ لیکن یہاں ہوا یہ کہ اس نظریہ کی نشر و اشاعت کا تو کوئی اہتمام نہ کیا گیا اور ملک میں مذہبی پیشوائیت کا زور بڑھتا چلا گیا ـــــ اور شومئ قسمت کہ ایسا ہونے میں، خود حکومت بھی بالواسطہ اور بلاواسطہ اس کی مؤید رہی۔

دُور رس نتائج

اس کا نتیجہ اتنا ہی نہیں کہ پاکستان کے اسلامی مملکت بننے کے امکانات دن بدن دور ہٹتے چلے جا رہے ہیں، اس کا اثر بڑا دور رس ہے۔ اسلام کے متعلق دنیا میں یہ خیال عام ہو رہا تھا کہ یہ نظام آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے حالات میں تو چل سکتا تھا، اب یہ محض ایک چلا ہوا کارتوس ہے یا ایک مقدس مقبرہ جس کے مجاور مسلمانانِ عالم ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اس خطرناک تاثر کو دُور کرنے کے لئے، پاکستان کا تصور پیش کیا اور کہا کہ یہ مملکت ہمارے اس دعویٰ کی صداقت کا بیّن ثبوت ہو گی کہ اسلام اب بھی ایک زندہ نظامِ حیات ہے جو دنیا کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے۔ چنانچہ پاکستان کی تشکیل کے بعد، دنیا کی نگاہیں اس طرف لگ گئیں کہ دیکھیں اب اسلام کس طرح ایک زندہ نظام کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ پاکستان، اس وقت تک، ہمارے اس دعوے کی شہادت پیش کرنے میں ناکام رہا ہے اور صورتِ حالات اگر یہی رہی، تو یہ اس دعویٰ کی شہادت کبھی بھی نہیں بن سکے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ دنیا نے جو تصورِ اسلام کے متعلق قائم کیا تھا کہ اس کی حیثیت اب محض آثارِ قدیمہ کی سی ہے، وہ اسے مبنی بر حقیقت سمجھ لے گی ـــــ اور ایسا سمجھنے میں وہ حق بجانب بھی ہو گی ـــــ دنیا، ایسا کب سمجھے گی، اسے تو چھوڑیئے، خود پاکستان کی نئی نسل، (جو اندھی عقیدت کی بنا پر اسلام کے متعلق کسی دعوے کو ماننے کے لئے تیار نہیں، اور نہ ہی اسے یا کسی اور کو ایسا کرنا چاہیئے) اس تاثر کو لئے ہوئے اُبھر رہی ہے کہ اسلام کی کہانیاں محض "اساطیر الاوّلین" ہیں۔ اب اس زمانے میں اس کا چلن ممکن نہیں۔ دنیا بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ صدر ایوب نے، (۳۱ جولائی ۱۹۶۰ء کو) ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے گورنروں کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

بیس تیس برس کے بعد کوئی شخص تمہاری آواز سننے کے لئے تیار نہیں ہوگا جب تک تم ایسی بات نہ کہو گے جو عقلِ عامہ کو اپیل کرے اور زمانے کے تقاضوں کو پورا کرے۔

زمانہ کی برق رفتاری اب کسی قوم کو بیس تیس برس کی مہلت دینے کے لئے تیار نہیں۔ اب صدیوں کے مرحلے دنوں میں طے ہو جاتے ہیں اس لئے پاکستان کی نئی پود، اِن فرسودہ باتوں کو سننے کے لئے تیار نہیں جو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے پیش کی جائیں اور "اسلامیات" کے نام سے انہیں اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی ہیں اور چونکہ اسلام اس شکل میں ان کے سامنے آنہیں رہا جو "عقلِ عامہ" کو اپیل کرے اور زمانے کے تقاضوں کو پورا کرے، اس لئے وہ خود دین ہی سے برگشتہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

یہ نتیجہ ہے ہماری موجودہ روش کا — یعنی باہر کی دنیا اسلام کے متعلق یقینی طور پر اسی نتیجہ پر پہنچ رہی ہے کہ اس میں اب زمانے کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں اور خود، پاکستان کی نژادِ نو اسلام سے برگشتہ ہوتی جا رہی ہے۔

اب بھی وقت ہے کہ اس مسئلہ کو سنجیدگی سے ہاتھ میں لے لیا جائے اور اس سلسلہ میں کرنے کا کام وہی ہے جس کی ہم نے گزشتہ صفحات میں نشاندہی کی ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو پھر پاکستان ہی میں نہیں، پورے عالمِ اسلام میں، اسلام کے ایک زندہ نظامِ زندگی بننے کے امکانات باقی نہیں رہیں گے اور اسلام کا گہوارہ کوئی ایسا ملک ہی بن سکے گا جہاں پہلے سے اسلام موجود نہ ہو — اسلئے کہ زندہ قوموں نے تو پھر پھرا کر آخر الامر اسی طرف آنا ہے، اس کے سوا کوئی اور نظام، زندگی کے تقاضے پورے کر نہیں سکتا — علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است　　سازِ قرآں را نواہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر اُفتد اگر　　آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
حق اگر از پیشِ ما بر داردش !　　پیشِ قومے دیگرے بگذاردش!
ترسم از روزے کہ محرومش کنند　　آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند!

قرآن، ذکرٌ للعالمین (تمام نوعِ انسانی کے لئے ضابطۂ ہدایت) ہے۔ یہ نہ کسی خاص خطۂ زمین میں مقید رہ سکتا ہے، نہ کسی خاص قوم میں محصور — یہ وہ ساغر ہے کہ جو بھی ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا لے، بادۂ زندگی اس کے لئے مقدر ہو جاتا ہے — لہٰذا، ہمارے لئے وجۂ تاسف خود اپنی محرومی کا احساس ہے، قرآن کے مستقبل کا غم نہیں۔ قرآن تو نوعِ انسان کی (DESTINY) ہے۔ اس لئے اس کے مستقبل کا غم کیسے ہو سکتا ہے؟

اسلامی مملکت کے فرماں روا

عیدِ میلاد النبیؐ کی تقریبِ سعید (۱۹۶۵ء) پر، وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں جلسۂ عام سے خطاب

کوثر چکد از لبم باین تشنہ لبی خاور دمد از شبم باین تیرہ شبی

اے دوست ادب کہ در حریمِ دلِ ماست شاہنشۂ انبیاء، رسولِ عربیؐ

براداران گرامی قدر! اسلام و رحمت!

جلسے اور اجتماعات اکثر منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ رسومات اور تقاریب ہمیشہ منائی جاتی ہیں لیکن آج کا اجتماع اپنی نوعیت کا منفرد اجتماع اور آج کی تقریب اپنے انداز کی بے مثل تقریب ہے۔ یہ اجتماع وقف ہے نوعِ انسانی کے اُس محسنِ اعظمؐ کے تذکارِ جلیلہ کے لئے جس نے انسان کو دنیا میں انسان کی حیثیت سے رہنا سکھایا اور یہ تقریب مختص ہے اُس زبدۂ شرفِ انسانیت کے ذکرِ جمیل کے لئے جس کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک نقش، دلیلِ راہ اور نشانِ منزل ہے اُس کاروانِ شوق و مستی کے لئے جو زندگی کی ارتقائی منازل طے کرنے کے لئے آمادۂ سفر ہو۔

وہ رازِ خلقتِ ہستی، وہ معنیٔ کونین وہ جانِ حسنِ ازل، وہ بہارِ صبحِ وجود!

وہ آفتابِ حرم، وہ نازنینِ کُنجِ حرا وہ دل کا نور، وہ اربابِ درد کا مقصود

وہ سرورِ دو جہاں، وہ محمّدِ عربی!

بروحِ اعظم و پاکش، درودِ لاتحدود

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۳۳/۵۶)

(۰)

عزیزانِ من! انسان مدنی الطبع (SOCIAL ANIMAL) واقع ہُوا ہے۔ اس لئے اُسے لامحالہ مِل جُل کر رہنا ہے۔ مِل جُل کر رہنے کے لئے ضروری ہے کہ معاشرہ کے کچھ آئین و قوانین ہوں، زندگی کے لئے کچھ قواعد و ضوابط ہوں۔ باہمی معاملات کے لئے کچھ حدود و قیود ہوں۔ اسی کا نام عام اصطلاح میں نظمِ معاشرہ یا نظامِ حکومت ہے۔

نظامِ حکومت

نظامِ حکومت، انسان کی اجتماعی زندگی کی بنیادی ضرورت اور اوّلین تقاضا ہے۔ لیکن انسانی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ یہ آج تک کوئی ایسا نظامِ حکومت وضع نہیں کر سکا جسے کامیاب کہا جا سکے۔ یہ اپنی تمدنی زندگی کی صبحِ اوّل سے اس نظام کی تلاش میں سرگرداں ہے لیکن آج تک اسے پا نہیں سکا۔ یہ ایک نظام وضع کرتا ہے اور اسے یہ کہہ کر اختیار کرتا ہے کہ وہ اس کی مشکلات کا حل پیش کر دے گا۔ لیکن تھوڑی دور چلنے کے بعد، دیکھتا ہے کہ اس سے وہ مقصد حاصل نہیں ہو رہا جس کے لئے اسے وضع اور اختیار کیا گیا تھا۔ یہ اسے چھوڑ کر دوسرا نظام وضع اور اختیار کرتا ہے۔ لیکن اس کا انجام بھی وہی ہوتا ہے اور وہ ایک بار پھر باصد حسرت پکار اٹھتا ہے کہ ــــ تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی ــــ انسان کی ساری تاریخ اسی ساخت و شکست اور شکست و ساخت کی تاسّف ناک اور کرب انگیز داستان ہے اور اس کا سلسلہ اِس وقت تک جاری ہے۔

میں، آج کی نشست میں آپ کے سامنے اس حقیقت کو پیش کرنا چاہتا ہوں کہ عالمِ انسانیت کے اس مشکل ترین مسئلہ کا حل وحیٔ خداوندی نے پیش کیا اور حضور نبیٔ اکرم (صلّی اللہ علیہ وسلّم) اور دست پروردگانِ رسالت (رضی اللہ تعالےٰ عنہم) نے اسے کس طرح عملاً متشکل کر کے دکھایا۔

قرآنی تصورِ حکومت

نظامِ حکومت کے دو شعبے ہیں۔ ایک، انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے قوانین وضع کرنا ــــ اسے عصرِ حاضر کی اصطلاح میں عملِ تقنین یا LEGISLATION کہا جاتا ہے۔ اور دوسرا، ان قوانین کو معاشرہ میں عملاً نافذ کرنا اسے اجرائیہ یا (EXECUTIVE) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ حکومت کی اصل و بنیاد قانون سازی کا شعبہ ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے اس عظیم حقیقت کا اعلان کر دیا کہ حقِ حکومت، (یعنی انسانوں کے لئے قوانین وضع

کرنے کا حق) خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں — اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۔ (۶/۵۷)۔ اس کے اس حقِ حکومت و اختیار میں اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۲۶) ان اصول و حدود کو اس نے اپنی کتاب (قرآنِ کریم) میں بیان کر دیا اور اس کا اعلان کر دیا کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔ (۵/۴۴) جو لوگ اس کتاب کے مطابق نظامِ حکومت قائم کریں گے وہ مومن ہیں جو اس کے خلاف نظام متشکل کریں گے وہ کافر۔ جماعتِ مومنین وہ ہے جو دنیا میں قوانینِ خداوندی کو عملاً نافذ کرنے کی ذمہ دار ہے، یعنی جسے اسلامی حکومت کہا جاتا ہے۔ اس کا حقیقی منصب اجرائیہ کا ہے۔ قانون سازی میں اس کا حصہ صرف اس قدر ہے کہ وہ قرآنِ کریم میں بیان کردہ اصول و اقدار کی روشنی میں اپنے حالات کے مطابق جزئیات مرتب کرے۔

جو لوگ دین اور مذہب میں فرق کرنا نہیں جانتے ان کا خیال (بلکہ عقیدہ) ہے کہ وحیِ خداوندی کا منشاء انسانوں کی "اخلاقی اصلاح" ہے جو پند و نصائح اور وعظ و تلقین کے ذریعے کی جاتی ہے۔ سیاست اور حکومت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ "مذہب" کی بیشک یہی تعلیم ہے۔ وہ وعظ اور اپدیش سکھاتا اور انسان کو گیان دھیان (یعنی خود ساختہ تصورِ روحانیت) میں مگن رکھتا ہے۔ لیکن اسلام دین ہے اور دین سے مراد نظامِ حکومت اور ضابطۂ قوانین ہے۔ وہ نظامِ حکومت کو، ایمان و اعمالِ صالح کا فطری نتیجہ قرار دیتا ہے۔ دیکھئے! اس نے ایک ہی آیت میں، حکومت کے قیام اور اس کی غرض و غایت کو کیسے واضح اور دل نشین انداز میں بیان کر دیا ہے۔ سورۂ نور میں ہے:۔

(۱) وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ

یہ خدا کا وعدہ ہے۔ یہ اس کا غیر متبدل قانون ہے کہ جو لوگ وحی کی ابدی صداقتوں کو اپنا نصب العین قرار دے کر اس کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق کام کریں، انہیں دنیا میں حکومت (خلافت) عطا ہوگی۔

(۲) كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۔ یہ محض نظری اور اعتقادی "حکومت" نہیں جو عالمِ تصورات کی روحانی دنیا میں قائم ہوتی ہے۔ یہ اسی قسم کی حکومت ہے جس قسم کی حکومت دیگر اقوامِ عالم کو حاصل ہوتی ہے۔

(۳) اس حکومت کا مقصد یہ ہے کہ:۔

(i) وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ تاکہ اس کے ذریعے، اس دین کو تمکن حاصل

ہو جائے جسے خدا نے ان کے لئے پسند کیا ہے۔

(ب) وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ط اور انہیں کسی قسم کا خوف وخطر نہ رہے اور امن و سکون نصیب ہو جائے۔

(ج) يَعْبُدُوْنَنِيْ تاکہ یہ اس قابل ہو جائیں کہ صرف میری محکومیت اختیار کریں، میرے قوانین کی اطاعت کریں۔ اور

(د) لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ط (۲۴/۵۵) اور اس میں کسی اور کی حکومت و اقتدار کو شریک نہ کریں۔

دوسری جگہ فرمایا کہ:۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں دنیا میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ:۔

(الف) اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ــــ ایسا نظام قائم کریں گے جس میں ہر شخص قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتا چلا جائے۔

(ب) وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ ــــ جس میں تمام افرادِ انسانیہ کو سامانِ نشوونما بہم پہنچتا چلا جائے۔

(ج) وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ ــــ یہ ان باتوں کے کرنے کا حکم دیں گے جنہیں قرآن صحیح قرار دے۔

(د) وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ط اور ان باتوں سے روکیں گے جنہیں قرآن معیوب قرار دے۔ مختصراً یہ کہ

(س) وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔ (۲۲/۴۱)۔ اس نظام میں ہر معاملہ، آخر الامر، قانونِ خداوندی کی طرف (REFER) کیا جائے گا کہ وہاں سے اس کے متعلق کیا فیصلہ ملتا ہے۔

جو لوگ اسلام کو دین نہیں بلکہ ایک مذہب سمجھتے ہیں وہ یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ کی تیرہ سالہ مکی زندگی کے دوران، حکومت و مملکت کا کوئی تصور سامنے نہیں تھا۔ یہ خیال ان حالات کا پیدا کردہ تھا جو بعد میں مدنی زندگی میں پیدا ہوئے، یعنی حضورؐ کا مقصد کسی مملکت کا حصول یا حکومت کا قیام نہیں تھا۔ مدنی زندگی میں، اتفاقی طور پر، ایسے حالات نمودار ہو گئے جن سے ایک مملکت وجود میں آگئی ــــ یہ حدیث بے خبراں ہے۔

مکی زندگی میں تصورِ حکومت

حقیقت یہ ہے کہ اپنی دعوتِ انقلاب کے روزِ اوّل سے یہ مقصد حضورؐ کے پیشِ نظر تھا۔ آپؐ نے مکہ میں، دعوائے نبوت کے آغاز ہی میں جو فرامین نافذ کئے ان میں وہ فرمان بھی ہے جس میں اپنے خاندان کو مخاطب کر کے حضورؐ نے فرمایا:۔

آج تک کوئی جوان ایسا پیدا نہیں ہوا جو تم کو مجھ سے بہتر مطمحِ نگاہ سے باخبر کرتا۔ میں تمہارے پاس

دنیا اور آخرت دونوں کی بہتری کے لئے آیا ہوں۔ خدا کی بالادست حکومت کی طرف سے مجھے یہ ہدایت ہے کہ میں تمہیں اس کی طرف دعوت دوں۔ مجھے اس حکومت کے کام میں وزراء کی ضرورت ہے۔ کون ہے جو میرے ساتھ وزیر کی حیثیت سے کام کرے گا؟[1]

یہ مؤرخ اس فرمان کو درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ نبوت کے تین ہی سال بعد حضورؐ نے لوگوں کو "خدا کے حکم" پر جمع ہونے کی دعوت دی۔ یہ بڑی انقلاب آفریں دعوت اور انتہائی صبر آزما مرحلہ تھا لیکن حضورؐ کا اعلان یہ تھا کہ "یا تو خدا کا حکم غالب ہوگا اور یا میں اپنی جان سے گذر جاؤں گا"۔

بنی عامر کا سردار

اسی زمانے کا ذکر ہے کہ بنی عامر کا ایک سردار حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ ان لکل قول حقیقۃ۔ وما حقیقۃ قولک۔ ہر دعوے کا نتیجہ ایک محسوس شکل میں سامنے آتا ہے۔ آپ کے دعویٰ کا ماحصل اور نتیجہ کیا ہے؟ آپ نے اپنی دعوت کی وضاحت کے بعد فرمایا کہ اگر تم اسے قبول کر دگے تو اس کے نتیجہ میں آخرت کی ہمیشہ رہنے والی خوشگوار زندگی نصیب ہوگی۔ عامری نے کہا کہ یہ تو بعد کی بات ہے، میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے اس دنیا میں کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ نعم النصر و تمکین فی البلاد۔ نہایت محمدہ فتوحات اور ملکوں پر حکومت۔ (تاریخ الکامل

لہٰذا، مکی زندگی اس حکومت کے قیام کی تیاری کا زمانہ تھا۔ وہ اس متشکل ہونے والی مملکت کے کتاب آئین کا دیباچہ تھا۔ اگر حکومت کو تلوار کے زور پر حاصل کرنا مقصود ہو تو اس کے لئے تیاری کا انداز اور ہوتا ہے۔ لیکن جب حکومت کو ایمان اور ایمان صالح کے فطری نتیجہ کے طور پر سامنے آنا ہو تو اس کی تیاری، اپنی جماعت کو ان صبر آزما اور جاں گسل کٹھنائیوں سے گزار کر ہی ہو سکتی تھی جو مکی زندگی کے طول طویل زمانہ میں قدم قدم پر سامنے آتی تھیں۔ اس کے بعد مدنی زندگی میں اگرچہ یہ حکومت اپنی محسوس شکل میں سامنے آچکی تھی لیکن یہ مرحلہ بھی درحقیقت، تربیت گاہ تھا ان فیروز بخت اور سعادت مند رفقائے جماعت کا جنہوں نے حضورؐ کے بعد اس مقصدِ عظیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا۔

اجرائیہ کی اہمیت

میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ اسلامی حکومت کا فریضہ قانون سازی نہیں بلکہ قوانینِ خداوندی کا عملی نفاذ ہے اور اس جہت سے اس کی حیثیت اجرائیہ (یا ایگزیکٹو) کی

---

[1] تاریخ الکامل ابنِ اثیر۔ (بہ حوالہ اسلام کا نظامِ حکومت)

رہ جاتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ معاشرہ کی اصل و بنیاد کا تعلق قانون سازی ہی سے ہے۔ جس قسم کے قوانین ویسی قسم کا معاشرہ۔ لیکن اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ معاشرہ میں حکومت کے نظامِ اجرائیہ کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں۔ بلکہ اصل یہ ہے کہ لوگوں کا براہِ راست واسطہ تو اجرائیہ ہی سے پڑتا ہے۔ قانون کیسا ہی انسانیت ساز اور نفع بخش کیوں نہ ہو، اگر اس کے نافذ کرنے اور چلانے والوں کا کردار بلند اور نگاہ وسیع نہیں تو وہ لوگوں کے لئے قیامت برپا کر دیتے اور ان کی زندگی کو جہنم بنا دیتے ہیں۔ نبی اکرمؐ نے تربیت گاہ مدنی میں، اس حقیقت کو واشگاف کر دیا کہ خدا کی بادشاہت میں، حاکم اور محکوم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس میں ہر فیصلہ خدا کے عطا کردہ قوانین کی روشنی میں ہوتا ہے اور ان قوانین کا اطلاق، قانون نافذ کرنے والوں اور دوسرے لوگوں پر یکساں ہوتا ہے۔ بلکہ قانون نافذ کرنے والوں کو سب سے پہلے اعلان کرنا پڑتا ہے کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (۶/۱۶۴)

محکوم فرمانروا

میں ان قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والوں میں سب سے پہلے نمبر پر ہوں یعنی وہ بھی، دوسرے لوگوں کی طرح، سب سے پہلے خدا کا محکوم بنتا ہے اور اس محکومیت (اطاعتِ قوانینِ خداوندی) ہی سے اسے شرف و تکریم کا وہ مقام حاصل ہوتا ہے کہ قوانینِ خداوندی کے نفاذ کا اہم فریضہ اس کے سپرد کیا جاتا ہے۔ وہ انتہائی فخر و مسرت سے اپنے آپ کو خدا کا عبد کہتا ہے اور اس کا خدا بھی جو سب سے بڑا اعزاز اسے عطا کرتا ہے، وہ عبدیت ہی کا مقام ہوتا ہے (فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی۔ (۵۳/۱۰) اس اعتبار سے وہ خدا کا محکوم اور دنیا کا حاکم بنتا ہے اور چونکہ خدا کی اس محکومیت میں دوسرے لوگ بھی برابر کے شریک ہوتے ہیں اس لئے وہ ان کا حاکم اور فرمانروا بن کر بھی اپنے آپ کو ان سے اونچا اور برتر نہیں سمجھتا۔ دیکھئے کہ حضورؐ نے اپنے عدیم النظیر عمل سے اس حقیقت کو کس طرح نمایاں کر کے دکھا دیا۔ آپؐ کم از کم دس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی مملکت کے واحد حکمران تھے۔ لیکن اس وسیع و عریض مملکت کے واحد حکمران کی کیفیت یہ تھی کہ

(۱) ایک مرتبہ کسی نے آپ سے خطاب کرتے ہوئے کہہ دیا، یا سیّدنا! (اے ہمارے آقا!) اس پر آپ نے ڈانٹ کر کہا کہ دیکھو! تمہیں شیطان بہکا رہا ہے۔ آقا صرف خدا کی ذات ہے۔ میں تو عبداللہ کا بیٹا محمدؐ اور خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ آقائیت (سروری اور سرداری) صرف ذاتِ خداوندی کے لئے ہے، کسی اور کے لئے نہیں۔

(۲) اور سنیئے۔ دوسرے قبائل کے نمائندے اور سلطنتوں کے وفود آتے تو انہیں یہ چلنے میں دقت ہوتی

کہ مسلمانوں کی سلطنت کا فرماں رواکون ہے۔اس وقت کے پیشِ نظر حضورؐ کے رفقا نے مٹی کا ایک چبوترہ بنادیا کہ آپؐ اس پر بیٹھا کریں۔آپ نے دیکھا تو غصہ سے چہرہ تمتما اٹھا۔اپنے پاؤں سے اس نشست کو گرادیا اور فرمایا کہ تم بھی لگے ہو وہی امتیازات پیدا کرنے جنہیں مٹانے کے لئے میں آیا ہوں۔تم نے آج مٹی کا چبوترہ بنایا ہے، آنے والے اسے تختِ حکومت میں تبدیل کر دیں گے۔

(۳) کسی کے ہاں دعوت میں جا رہے تھے۔چار آدمیوں کی دعوت تھی۔راستے میں ایک آدمی یونہی ساتھ ہوگیا۔آپ نے میزبان کے ہاں پہنچ کر اس سے کہا کہ یہ صاحب اس طرح میرے ساتھ آگئے ہیں۔اگر تم اجازت دو تو اسے کھانے پر ساتھ بٹھا لیا جائے، ورنہ رخصت کر دیا جائے۔

(۴) وہ دیکھو اد یوار کے سایہ تلے بیٹھا کون اپنے جوتے کی مرمت کر رہا ہے؟ یہ وہی دس لاکھ مربع میل مملکت کا حکمران ہے۔ایک رفیق نے کہا کہ لائیے، آپ کا جوتا میں گانٹھ دوں۔تو ایک تبسم جنت فروش سے فرمایا کہ نہ بھائی! ہر شخص کو اپنا کام خود کرنا چاہیئے۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (۶/۱۶۵)

(۵) اس وسیع و عریض سلطنت کے فرمانروا کے گھر کا سامان کیا تھا؟ دروازے پر ایک کمبل کا پردہ، (کوئی حاجب و دربان نہیں) اندر فرش پر ایک چٹائی جس پر لیٹنے سے بدن مبارک پر نشان پڑ جاتے تھے۔ سرہانے ایک تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری تھی۔ایک طرف کھونٹی پر دو ایک مشکیزے پانی کے لئے اور دوسری طرف، ایک تلوار اور زرہ۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ غذا میں کھجوریں اور ان کی گٹھلیوں کے ستو۔لباس میں ایک ہی جوڑا جس میں کئی پیوند لگے ہوئے۔آخری وقت گھر میں سات دینار تھے جنہیں وفات سے پہلے بیت المال بھیج دیا کہ محتاجوں کے کام آئیں۔یہ تھی اس عظیم مملکت کے فرمانروا کی زندگی اور اس کا ساز و سامان۔

رسالت کی حیثیت

میں نے، عزیزانِ من! کہا ہے کہ یہ کیفیت تھی اس بطلِ جلیل کی جو اتنی وسیع سلطنت کا واحد حکمران تھا۔لیکن آپ کی ایک حیثیت اس سے بھی بلند تھی، ایسی بلند جو کسی اور انسان کے حصے میں نہیں آسکتی تھی، اور وہ یہ کہ آپ خدا کے رسول تھے جن پر ایمان لانے کے بعد ایک شخص مسلمان کہلا سکتا تھا۔صرف ایمان لانے ہی سے نہیں بلکہ خدا کا ارشاد یہ تھا کہ

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (۴/۶۵)

تیرا نشوونما دینے والا اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے تمام متنازعہ فیہ معاملات میں تجھے اپنا فیصلہ کرنے والا تسلیم نہ کریں۔ اور پھر ان کی کیفیت یہ ہو کہ تیرے فیصلے کے خلاف اپنے دل میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں، بلکہ اس کے پورے جھکاؤ کے ساتھ اسے تسلیم کریں۔

اور اس کے ساتھ ہی آپ کی ایک حیثیت ذاتی بھی تھی۔ جب ایک ہی ذات میں اس قسم کی مختلف حیثیتیں سموئی ہوئی ہوں تو ان میں فرق کرنا، اور ایسا فرق کرنا کہ ایک حیثیت کا شائبہ بھی دوسری حیثیت میں نہ جانے پائے کارِ ہر فرزانہ نیست۔ اس باب میں حضورؐ نے مختلف مقامات پر ایسی محیر العقول مثالیں پیش کیں کہ جب نگہِ بصیرت ان پر غور کرتی ہے تو بے ساختہ تحسین و آفرین کے نغمات زبان پر آجاتے ہیں۔ ان میں بلند ترین، عمیق ترین اور نازک ترین مثال وہ ہے جسے خود قرآن کریم نے اپنے دامن میں محفوظ کر لیا ہے کہ قیامت تک کے اربابِ اقتدار کو معلوم ہو جائے کہ قانون کی فرمانروائی اور اپنے ذاتی جذبات کو کس طرح الگ الگ رکھا جاتا ہے۔

حضرت زیدؓ کا قصہ

حضرت خدیجہؓ کے پاس ایک غلام تھا زید۔ انہوں نے اسے رسول اللہؐ کو دے دیا۔ حضورؐ نے اسے آزاد کر کے، وہ بلند مقام عطا کر دیا جس پر، ہر بلند سے بلند تر مقام کی بلندیاں نچھاور کی جا سکتی ہیں، یعنی حضورؐ نے اسے منہ بولا بیٹا بنا لیا۔

حضرت زیدؓ کی بلندیٔ مرتبت کی یہ آخری حد نہیں تھی۔ اور آگے بڑھے تو حضورؐ نے ان کی شادی، اپنی پھوپھی زاد بہن، حضرت زینبؓ سے کر دی۔ لیکن سوئے اتفاق کہ میاں بیوی میں ناچاقی ہو گئی اور معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ حضرت زیدؓ نے بیوی کو طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا۔ حضورؐ نہیں چاہتے تھے کہ ایسا ہو۔ اس کی وجوہات ظاہر ہیں۔ آپؐ (حضرت) زیدؓ کے پاس گئے اور کہا کہ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ (۳۳/۳۷) اپنی بیوی کو طلاق مت دو۔

سوچئے برادرانِ عزیز! کہ یہ کہنے والا کون ہے؟

وہ رسولؐ، جس پر ایمان لانے سے زیدؓ کو شرفِ اسلام حاصل ہوا۔

وہ امیرؐ جس کی مملکت میں زیدؓ رعایا کے ایک فرد کی حیثیت سے رہتے ہیں۔

وہ محسنِ اعظم جس نے زیدؓ کو غلامی سے آزاد کیا۔

وہ، جو زیدؓ کے لئے بمنزلہ باپ کے ہیں اور جنہوں نے خود زیدؓ کی شادی اس ممتاز خاتون سے کرائی تھی۔

یہ ہیں کہنے والے۔ اور کہا یہ جا رہا ہے کہ زیدؓ (میری بہن کو) طلاق نہ دو۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ اس کے بعد کیا ہوا؟ قرآن بتاتا ہے کہ زیدؓ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔

پھر کیا ہوا؟ پہلے آپ یہ سوچئے کہ اگر آج کسی محسن کا احسان مند، کسی باپ کا بیٹا، کسی پیر کا مرید، کسی افسر کا ماتحت، کسی حاکم کی رعایا کا ایک فرد، ایسی حرکت کرتا تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟ لیکن وہاں کیا ہوا؟ وہی (حضرت) زیدؓ وہی ان کے ساتھ خوشگوار تعلقات حتیٰ کہ حضورؐ نے اپنی حیاتِ ارضی کے آخری ایام میں جو عظیم لشکر مرتب فرمایا تھا، اس میں دیگر جلیل القدر صحابہؓ بہ حیثیت سپاہی کام کر رہے تھے اور ان کا سپہ سالار اسی (حضرت) زیدؓ کا بیٹا اسامہ بن زیدؓ تھا۔

آپ نے غور فرمایا کہ اپنی حیثیتِ حاکمیہ اور ذاتی حیثیت میں کس طرح فرق کر کے بتا دیا؟ اور اس سے بھی دلگداز اور رقت انگیز وہ واقعہ ہے جس کا ذکر علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک مقالہ میں بڑے ہی سوز و گداز کے ساتھ کیا ہے۔

یہودی کی لڑکی

ایک یہودی قتل کے جرم کا مرتکب تھا۔ اسے حضورؐ نے بہ حیثیت جج، سزائے موت کا حکم سنا دیا۔ اس حکم کی تعمیل ہونے والی تھی کہ اُس مجرم کی خورد سالہ بچی، روتی چیختی چلاتی، دوڑی ہوئی آئی اور حضورؐ کی ٹانگوں سے لپٹ کر ایسے دردانگیز انداز سے آہ و فغاں کی کہ حضورؐ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے لیکن اس کے باوجود، آپؐ نے سزا کا حکم نافذ کر دیا۔ صحابہؓ کے دریافت کرنے پر جو جملہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا، وہ ان دونوں حیثیتوں کے درمیان قیامت تک حدِ فاصل کا کام دے گا۔ آپؐ نے فرمایا۔ "محمد بن عبداللہ کی آنکھ روتی ہے اور محمد رسول اللہ خدا کا حکم نافذ کر رہا ہے"! اور خدا کا حکم نافذ کرنے میں یہی وہ غیر جانبداری تھی جس کی بنا پر حضورؐ نے فرمایا تھا کہ

> تم سے پہلی امتیں اس لئے تباہ ہو گئیں کہ وہ لوگ کمتر درجے کے مجرموں کو قانون کے مطابق سزا دیتے تھے اور اونچے درجے والوں کو چھوڑ دیتے تھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے۔ اگر محمدؐ کی اپنی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں ضرور اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔ اپنی بیٹی ہی نہیں، بلکہ خود اپنی ذات کے متعلق (قرآن کریم) نے حضورؐ سے) کہلوا دیا کہ:۔

اِنِّیٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ (۶/۱۵)

اگر میں بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو مجھے ڈر ہے کہ میں بھی خدا کے مواخذہ سے نہیں بچ سکتا۔

اسلامی حکومت کا مقصد

قرآن کریم کی رُو سے، حکومت مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس مقصد کی تفصیل تو طول طویل ہے لیکن اگر ہم اسے دو فقروں میں سمٹانا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اس کا مقصد ملک کے اندر امن قائم کرنا ہے (تاکہ اس فضا میں لوگوں کی پوری پوری نشو ونما ہوتی جائے) اور دنیا میں کہیں بھی ظلم ہو رہا ہو، مظلوم کی مدد کرنا ہے جہاں تک اندرونِ ملک قیامِ امن کا تعلق ہے نبیٔ اکرمؐ نے اس کا ایسا حسین اور نازک معیار قائم کیا ہے کہ آج، جبکہ بظاہر دنیا میں بڑا امن ہے، جب اس معیار کو بہ نگاہِ تفکر دیکھا جائے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ امن کا اس سے بلند معیار کوئی اور نہیں ہوسکتا عرب میں حالت یہ تھی کہ اور تو اور خود حریم کعبہ کے اندر بھی کوئی اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ حکومتِ خداوندی کے قیام کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یمن سے ایک عورت سونے کے زیور سے لدی ہوئی تنہا شام تک کا سفر، صحراؤں اور بیابانوں میں کرے گی، اور اس کے دل میں وہم تک بھی نہیں گزرے گا کہ اسے کسی قسم کا خطرہ ہے ــــ اور تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ حضورؐ کی وفات کے وقت، عرب میں امن کی واقعی یہ حالت ہوچکی تھی ذرا اندازہ لگائیے امن کی اس حالت کا آج کی حالت سے، جب کہ بچیوں کا گھر سے اسکول تک جانا ایک جانکاہ مسئلہ بن جاتا ہے۔

مظلوموں کی امداد

جہاں تک مظالم کی روک تھام کا تعلق ہے، اس باب میں حضورؐ نے کیا اقدامات کیے، اس کا اندازہ آپؐ کے ان خطوط سے لگایا جاسکتا ہے جو آپؐ نے ایران کے کسریٰ اور روم کے قیصر کو لکھے تھے۔ سطح بین، ایران اور روم کے خلاف اسلامی جنگوں کے اسباب و توجیہات کے سلسلہ میں عجیب و غریب چیستانیں پیش کرتے اور افسانے تراشتے رہتے ہیں لیکن ان کی نگاہ اس علت العلل تک نہیں جاتی جو حضورؐ کے ان خطوط میں ایسی واضح طور پر بیان کی گئی ہے۔ آپؐ نے اپنے نامہ جاتِ گرامی قدر میں انہیں لکھا تھا۔

> میں تم کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر اسے مان لوگے تو دنیا میں بھی بچ جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا دگنا اجر دے گا۔ اگر تم نے اس دعوت کو قبول نہ کیا تو تمہارے کسانوں پر جو ظلم ہو رہے ہیں اور وہ اپنی جہالت کے باعث جو غلطیاں کر رہے ہیں، ان کے تم ذمّہ دار ہوگے۔
>
> (بخاری، باب بدء وحی)

آپ نے غور فرمایا کہ حکومتِ خداوندی کی دنیا میں غایت کیا ہے۔ اس کے نزدیک یہ سوال ہی نہیں کہ ظالم کون ہے اور ظلم کس پر ہو رہا ہے۔ دنیا کے کسی خطے میں، کسی مظلوم پر بھی ظلم ہو رہا ہو، اس کی مدد کو پہنچنا، اس حکومت کا فریضہ

قرار پاتا ہے حضورؐ کے ان فرامین میں اسی حقیقتِ کبریٰ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ جو حکومت دوسری مملکتوں کے مظلوموں کی حامی اور مددگار بنے گی، وہ اپنے ہاں کس طرح ظلم روا رکھے گی؟ خود ظلم کرنا تو ایک طرف، ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص کسی ظالم کی مدد کے لئے نکلا، درآنحالیکہ وہ جانتا ہے کہ وہ شخص ظالم ہے تو وہ شخص اسلام سے خارج ہو گیا۔ ظالم کی مدد کرنا تو ایک طرف، آپؐ نے یہاں تک بھی فرما دیا کہ اگر کسی شخص نے حاکم کو راضی کرنے کے لئے ایسی بات کہہ دی جس سے اس کا خدا ناراض ہو جائے (یعنی جو قانونِ خداوندی کے خلاف ہو) وہ بھی اللہ کے دین سے نکل جائے گا (کنز العمّال) بات ظلم کی ہو رہی تھی۔ ظلم بڑا جامع لفظ ہے اور اس کے احاطہ میں چھوٹی سے چھوٹی بے انصافی سے لے کر بڑے سے بڑے مظالم تک سب آجاتے ہیں۔ اس باب میں حضورؐ کی جزرسی اور دقیقہ شناسی کا یہ عالم تھا کہ اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، ہر وقت اور ہر جگہ نگاہ رکھتے تھے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو دھوکا نہ دے۔ اس سے فریب نہ کرے کہ یہ بھی ظلم ہے۔ ایک دفعہ آپؐ بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک غلّہ فروش کی دکان نظر آئی۔ آپؐ نے غلّہ کے انبار کے اندر ہاتھ ڈالا تو وہ بھیگا ہوا تھا۔ آپؐ نے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ اُس نے کہا کہ بارش سے بھیگ گیا تھا آپؐ نے فرمایا کہ پھر بھیگا ہوا غلّہ اندر کیوں رکھا ہے، اسے اوپر کیوں نہیں رکھا تاکہ ہر شخص کو نظر آجائے۔ پھر فرمایا کہ یاد رکھو! جو فریب دیتا ہے وہ ہم میں سے نہیں۔ (صحیح مسلم۔ کتاب الایمان)

فریب کے خلاف

عمّال کا محاسبہ

جہاں تک محاسبہ کا تعلق ہے حضورؐ اپنے عمّالِ حکومت (ملازمین) پر بڑی کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ جب عمّال زکوٰۃ وغیرہ وصول کر کے لاتے تو آپؐ بڑی سختی سے اس امر کا جائزہ لیتے کہ انہوں نے کوئی ناجائز طریقہ تو نہیں اختیار کیا۔ چنانچہ ایک بار ایک عامل زکوٰۃ (حضرت ابنؓ اللبیۃ) کا آپؐ نے جائزہ لیا تو انہوں نے کہا کہ یہ مال بیت المال کا ہے اور یہ چیزیں ان لوگوں نے مجھے بطور تحفہ دی ہیں۔ آپؐ نے وہ چیزیں اُن سے لے لیں اور کہا کہ یہ تمہیں گھر بیٹھے کیوں نہیں مل گئیں؟ — اس کے بعد آپؐ نے عام خطبہ میں اس کی سخت مذمت فرمائی اور اس طرح تحائف دینے والوں اور لینے والوں کو اسی طرح تنبیہہ کی جس طرح رشوت لینے والوں اور دینے والوں کو عذابِ الیم کی وعید سنائی جاتی ہے۔

آپؐ نے اس طرح عملی مثالوں سے اپنی جماعت کی تربیت فرمائی اور دُنیا کو بتا دیا کہ دوسروں پر قوانین

نافذ کرنے والوں کی اپنی زندگی کیسی ہونی چاہیئے۔ اور انہیں ہر معاملہ کا جائزہ کس حزم و احتیاط اور دقتِ نظر سے لینا چاہیئے۔ ذمہ داریوں کا یہی احساس تھا جس سے حضورؐ کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ:-

(حضرت) عبداللہ بن شفیق کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ کیا آنحضرتؐ کبھی بیٹھ کر بھی نماز پڑھتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں! جب لوگوں (کے معاملات) نے انہیں چُور چُور کر دیا تھا۔

(ابوداؤد)

میں نے، برادرانِ عزیز! حضورؐ کی حیاتِ طیّبہ کے ایسے واقعات آپ کے سامنے پیش کئے ہیں جو بظاہر بڑے چھوٹے نظر آتے ہیں لیکن میرے بھائیو! کسی کے کیریکٹر کا صحیح اندازہ تو روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات ہی سے لگ سکتا ہے۔ بڑے بڑے کارنامے، انسان کی سوچی سمجھی اسکیموں کا نتیجہ ہوتے ہیں لیکن روزمرہ کی زندگی کے معمولی واقعات، جو بے ساختہ سرزد ہوتے ہیں، انسانی سیرت کے صحیح آئینے اور اس کی عظمت کے قابلِ اعتماد پیمانے ہوتے ہیں۔ "لوگوں کے معاملات"، کا احاطہ، عدالت یا بابِ حکومت تک ہی محدود نہ تھا، ان کا دائرہ زندگی کے ہر گوشے کو محیط تھا۔ مثلاً حضرت خباب ایک صحابی تھے، جنہیں آپ نے ایک غزوہ پر بھیجا۔ ان کے ہاں کوئی اور مرد نہ تھا اور عورتوں کو دودھ دوہنا نہیں آتا تھا— آپؐ بہ نفسِ نفیس، ہر روز ان کے ہاں جاتے اور جانوروں کا دودھ دوہ کر دے آتے (طبقاتِ ابنِ سعد) مدینہ کی لونڈیاں آپؐ کی خدمت میں آتیں اور کہتیں کہ یا رسول اللہ! میرا یہ کام ہے۔ آپ فوراً اُٹھ کھڑے ہوتے اور ان کا کام کر دیتے۔

آپ ان چھوٹے چھوٹے واقعات کو دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ آپ کو ان میں کہیں بھی حکومت کی ذرا سی بُو، اقتدار کا ہلکا سا رنگ اور جاہ و منزلت کا خفیف سا شائبہ بھی محسوس ہوتا ہے؟ کیا آپ کو کسی مقام پر بھی پتا چلتا ہے کہ یہ واقعاتِ زندگی ایک ایسے انسان کے ہیں جو دس لاکھ مربع میل پر مشتمل حکومت کا واحد فرمانروا ہے؟ یہ ہے وہ صحیح معیار جس پر آسمانی حکومت کے نمائندہ کو پورا اترنا چاہیئے، یعنی کسی مقام پر بھی یہ محسوس نہ ہو کہ یہ حاکم ہے اور دوسرے لوگ محکوم، یہ فرماں روا ہے اور دوسرے فرماں پذیر، یہ مطاع ہے اور وہ مطیع، یہ بلند ہے اور وہ پست۔ اُسے دیکھا جائے تو یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجائے کہ ہاں یہی ہے وہ بارگاہ، جہاں یہ کیفیت ہے کہ

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز — نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے — تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

آخری وصیّت اور یہ سب اس لئے تھا کہ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک قدم قرآن کریم کی روشنی میں اٹھتا تھا۔ اس کی تاکید آپؐ نے، اپنی زندگی کے آخری لمحات میں فرمائی چنانچہ حضورؐ نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں ایک لاکھ کے مجمع میں ارشاد فرمایا کہ

قد ترکت فیکو مالو تضلوا بعدہ ان اعتصمتم بہ۔ کتاب اللہ (بخاری حجۃ الوداع)

میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر تم نے اسے قوت سے تھامے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہوگے اور وہ ہے اللہ کی کتاب، قرآن کریم۔

اور اس کی عملی تعبیر کے متعلق آپؐ نے فرمایا کہ:-

اگر ایک ہینی بریدہ سیاہ فام حبشی تمہارا امیر ہو، اور وہ کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے تو تم اس کے حکم کو سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ (صحیح مسلم)

حضورؐ کے بعد حکومتِ خداوندی کے اس سلسلۂ زرّیں کو حضور نبئ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تک محدود نہیں رہنا تھا۔ قرآنِ کریم شاہد ہے کہ اسے حضورؐ کے بعد آگے چلنا تھا۔ اس لئے کہ یہ دین تھا جو نہ زمان و مکان کی حدود میں مقید ہوتا ہے اور نہ اشخاص کی موت و حیات سے وابستہ یہ وہ حقیقت تھی جس کا اعلان نبئ اکرمؐ نے مدینہ کی زندگی کے ابتدا ہی میں فرما دیا تھا، جب ہنوز وہاں محسوس شکل میں حکومت وجود میں بھی نہیں آئی تھی۔ مدینہ پہنچنے کے بعد، پہلا کام مسجدِ نبویؐ کی تعمیر تھا کہ وہی اس مملکت کا ایوانِ حکومت اور اس حکومت کا دارالمشاورت تھا۔ مسجد تعمیر ہو رہی تھی اور صحابۂ کبارؓ مزدوروں کی طرح مٹی اور پتھر لا رہے تھے۔ حضورؐ ان معماروں کو دیکھ دیکھ خوش ہو رہے تھے اور فرما رہے تھے ھٰؤلاءِ ولاۃ الامر بعدی یہ وہ افراد ہیں جو میرے بعد حکومت کے افسرانِ اعلےٰ ہوں گے[1]۔ اور خود صحابۂ کبارؓ کو بھی اس کا علم اور یقین تھا۔ چنانچہ حضورؐ کی وفات کے بعد مکہ میں حضرت سہیل بن عمروؓ، کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہوئے اور اعلان فرمایا کہ

خدا کی قسم، اسلام کا کام پورا ہوگا۔ میں نے حضورؐ کی زبانِ مبارک سے یہ سنا ہے (کہ آپؐ نے فرمایا تھا)

---

[1] البدایہ والنہایہ (جلد دوم)

لوگو! میرے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کہو۔ عرب تمہارے تابع فرمان ہوں گے عجم باجگذار۔ خدا کی قسم تم قیصر و کسریٰ کے خزانوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے۔" (تاریخ الکامل)

اس اسکیم کو حضورؐ کے جانشینان گرامی قدرؓ کے ہاتھوں پورا ہونا تھا جن کی تعلیم و تربیت حضورؐ نے اس انداز سے فرمائی تھی۔ آیئے ہم ایک جھلک اُس دور کی بھی دیکھتے چلیں

صدیقِ اکبرؓ

رسول اللہؐ کی وفات کے بعد، یہ اہم ذمہ داری حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سپرد کی گئی تو آپ نے اپنے پہلے خطبہ میں واضح کردیا کہ اُن کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

مجھے یہ ذمہ داری تفویض تو کر دی گئی ہے لیکن میں اپنے آپ کو اس بارِ گراں کے اٹھانے کے قابل نہیں پاتا......... میں بھی تمہاری طرح اللہ کا بندہ ہوں مگر تم میں سے کسی سے بھی بہتر نہیں۔ تم میرے کاموں کی نگہداشت کرو......... تم میری اطاعت اس وقت تک کرو جب تک میں اللہ کے احکام کی اطاعت کروں لیکن میں اگر اس کی نافرمانی کروں تو تم پہ میری اطاعت فرض نہیں۔

اس کے بعد انہوں نے حکومتِ خداوندی کی غرض و غایت ان بصیرت افروز الفاظ میں بیان فرمائی جو اس قابل ہیں کہ دنیا میں ہر عادل حکومت کا منشور قرار پائیں۔ آپ نے فرمایا:۔

یاد رکھو! تم میں سے ہر کمزور طاقت ور ہے جب تک میں اس کا حق نہ دلاؤں اور ہر طاقتور کمزور ہے جب تک اس سے کمزور کا حق نہ لیا جائے۔

آپؓ نے اپنے ذاتی اخراجات کے لئے جو وظیفہ مقرر کیا وہ ایک مزدور کی اُجرت کے برابر تھا۔ لیکن اس کے باوجود، اس کا احساس اس قدر شدید تھا کہ آپ نے اپنے مرض الموت میں اپنے متعلقین سے فرمایا کہ میں نے جس قدر رقم بیت المال سے اپنے اخراجات کے لئے لی ہے، معلوم نہیں کہ اس کے مطابق امّت کا کام بھی کیا ہے یا نہیں۔ اس لئے آپ لوگ میرا مکان فروخت کردیں اور یہ رقم بیت المال میں داخل کردیں۔ چنانچہ ایسا کیا گیا اور حضرت صدیق اکبرؓ نے یہ کہہ کر اطمینان کا سانس لیا کہ خدا کا شکر ہے کہ میں کم از کم اس رقم کے محاسبۂ خداوندی سے تو سُرخرو ہوگیا۔

حضرت عمرؓ حضرت عمرؓ نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں فرمایا تھا کہ
لوگو! یاد رکھو، کوئی صاحبِ اختیار، دنیا میں اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا کہ وہ اگر خدا کے قوانین کی خلاف ورزی کرے تو اس کی اطاعت کی جائے۔

اس کے بعد آپؓ نے فرمایا کہ

لوگو! میرے اوپر تمہارے جو حقوق ہیں، میں ان کی وضاحت کرتا ہوں۔ تمہارا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ تمہیں جو مال خدا عطا کرے میں اس میں سے کوئی چیز وصول نہ کروں مگر قانونِ خداوندی کے مطابق۔ اور جو مال میرے پاس آئے اس میں سے کچھ نہ نکلے مگر حق کے مطابق۔
(کتاب الخراج)

ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا۔

یاد رکھو! اگر کوئی شخص کسی پر ظلم اور زیادتی کرے گا تو میں اس وقت تک اسے نہیں چھوڑوں گا جب تک اس کا ایک رخسار زمین پر ٹکا کر دوسرے رخسار پر اپنا پاؤں ٹکا دوں تاآنکہ وہ حق کے سامنے سر انداز ہو جائے لیکن تم میں سے حقدار کے لئے میں خود اپنا رخسار زمین پر رکھ دوں گا۔
(بحوالہ ہیکل)

ان حقوق و واجبات کے سلسلہ میں آپ نے یہ بھی صراحت کر دی کہ

لوگ اپنے امیر کے حقوق اس وقت تک ادا کریں گے جب تک امیر اللہ کے حقوق ادا کرے گا۔ جب امیر خدا کی اطاعت سے بے قید ہو جائے گا تو لوگ اس کی اطاعت سے بے قید ہو جائیں گے۔

خلافت اور ملوکیّت وہی بات کہ حقِ حکومت اسے حاصل ہو گا جو خدا کا محکوم ہو گا۔ جس نے خدا کی اطاعت کرنی چھوڑ دی اسے دوسروں سے اطاعت کرانے کا حق نہ رہا وہ اکثر لوگوں سے دریافت کرتے رہتے تھے کہ بتاؤ کہ میں صحیح طریقے پر چل رہا ہوں یا کہیں لغزش کھا گیا ہوں ایک موقع پر آپ نے ان سے کہا کہ "میں یہ نہیں جانتا کہ میں خلافت سے روگردانی کر کے، شاہی تو نہیں کر رہا۔ مجھے بتلایئے"۔ مجمع میں سے ایک شخص برجستہ بولا "امیر المومنین! خلافت اور شاہنشاہیت کا فرق بڑا واضح ہے۔ خلیفہ تمام افرادِ معاشرہ کے حقوق کا محافظ ہوتا ہے اور بادشاہ ان کے حقوق میں ظلم اور

جبر کرتا ہے. وہ ایک طرف سے لوٹتا ہے، دوسری طرف خرچ کرتا ہے. خدا کا شکر ہے کہ آپ خلیفہ ہیں، بادشاہ نہیں۔" (طبقاتِ ابنِ سعد)

خلیفہ کا حق

یہ جو آپ نے فرمایا تھا کہ مسلمانوں کے مال میں سے میں صرف اتنا لے سکتا ہوں جتنا قانون کی رُو سے مجھے حق پہنچتا ہے، تو اس حق کی تفصیل بھی آپ نے خود ہی بتا دی. ایک دن اُن سے کسی نے پوچھا کہ مسلمانوں کے مال میں سے آپ کے لئے کیا جائز ہے، تو آپ نے کہا کہ:-

> کپڑوں کے دو جوڑے، ایک گرمی کا اور دوسرا سردی کا. حج اور عمرہ کے لئے احرام. اور میرے اور میرے اہل وعیال کے لئے فی کس اتنا کھانا جو قریش کے ایک آدمی کی خوراک ہے. نہ اس سے کم نہ زیادہ. اس کے بعد میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں. جو ان کا حال، سو میرا حال۔

احتیاط کی شدّت

اس باب میں وہ اتنی احتیاط برتتے تھے کہ بعض اوقات یہ احتیاط تکلیف دہ ہو جاتی تھی. ایک دفعہ انہیں کوئی شکایت ہو گئی جس کے لئے شہد تجویز کیا گیا۔ بیت المال میں شہد موجود تھا لیکن آپ نے اسے از خود نہیں لیا. آپ نے "کونسل" کا اجلاس طلب کیا اور کہا کہ اجازت دیں تو میں بیت المال میں سے تھوڑا سا شہد لے لوں. انہوں نے اجازت دے دی تو شہد لیا. جب لوگوں نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ اپنی جان پر اتنی سختی کر رہے ہیں تو وہ ایک دفعہ حضرت حفصہؓ کے پاس آئے اور کہا کہ آپ ہی اپنے والد کو سمجھائیں اور ان سے کہیں کہ انہیں جس چیز کی ضرورت ہو، اطمینان سے لے لیا کریں. حضرت حفصہؓ نے آپ سے کہا تو آپ نے فرمایا۔

> اے عمر کی بیٹی! تو نے اپنی قوم کے ساتھ تو بھلائی کی اور اپنے باپ کو دھوکا دیا. یاد رکھو! میرے اہل وعیال کا حق میری ذات میں ہے، میری دیانت اور امانت میں نہیں۔ (بحوالہ ہیکل)

بیوی بچوں کا معاملہ

جب "اہل وعیال" کا ذکر آ گیا تو دو ایک واقعات اس ضمن میں بھی سُن لیجئے. "بیوی بچے" انسان کی بڑی دُکھتی ہوئی رگ ہوتے ہیں. قرآن کریم نے بھی انہیں فتنہ (آزمائش کی کٹھالی) کہا ہے. انسان اپنے آپ پر تو ضبط کر لیتا ہے لیکن جب بیوی یا اولاد کا سوال سامنے آتا ہے تو بڑے بڑوں کے پاؤں پھسل جاتے ہیں. اس باب میں حضرت عمرؓ کی احتیاط کا کیا عالم تھا اس کا اندازہ ان دو ایک واقعات سے لگائیے۔

(۱) ایک دفعہ قیصر کی بیوی نے عطر کی کچھ شیشیاں "شاہِ عرب" (حضرت عمرؓ) کی بیوی کو بطور تحفہ بھیجیں۔ آپ نے وہ شیشیاں بیوی سے لے لیں اور فرمایا کہ "وہ بیت المال میں داخل ہوں گی اس لئے کہ قیصر کی بیوی نے یہ تحفہ تمہاری ذاتی حیثیت سے نہیں بھیجا، امیر المومنین کی بیوی کی حیثیت سے بھیجا ہے اس لئے تمہارا ان پر کوئی حق نہیں۔"

(۲) ایک مرتبہ بیت المال میں کچھ مشک آئی جسے تقسیم کرنا تھا۔ بیوی نے کہا کہ لائیے! میں تول کر حصے کر دوں۔ فرمایا کہ ہاں! تم اسے تولو گی تو جو مشک ترازو کے پلڑے میں لگی رہے گی تم اسے اپنے کپڑوں میں ملو گی۔ میں اس "خیانت" کو گوارا نہیں کر سکتا۔

(۳) ایک دفعہ آپ کا بیٹا مصر سے واپس آرہا تھا۔ گورنر مصر نے کچھ روپے دیئے کہ انہیں بیت المال میں جمع کر دینا۔ اس نے کہا کہ اگر میں اس روپے سے راستے میں کچھ سامانِ تجارت خرید لوں اور مدینہ جا کر اصل رقم بیت المال میں داخل کر دوں تو اس میں حرج تو نہیں؟ گورنر نے اس کی اجازت دے دی لیکن جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو آپ نے کہا کہ زرِ منافع بھی بیت المال میں داخل کر دو۔ گورنر نے تمہیں اس کی اجازت محض اس لئے دے دی کہ تم امیر المومنین کے بیٹے ہو۔ وہ ہر ایک کو اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے جو رعایت تمہیں عمرؓ کا بیٹا ہونے کی وجہ سے ملی ہے اسے کبھی جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اسی طرح حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں، ایک دفعہ ان کے بھائی حضرت عقیلؓ نے کہا کہ مجھے کچھ روپے بطور قرض بیت المال سے دلوا دیجئے تو آپ نے فرمایا کہ میں خدا کے سامنے چور نہیں بننا چاہتا۔ اس معاملہ میں تم حسن اور عام لوگ میرے نزدیک ایک جیسے ہو۔

(۴) ایک دفعہ حضرت عمرؓ کا بیٹا اپنا اونٹ، مملکت کی چراگاہ میں چراتا رہا جب وہ موٹا تازہ ہو گیا تو اسے نفع سے بیچ دیا۔ آپ کو معلوم ہوا تو بیٹے کو ڈانٹا اور کہا کہ زرِ منافع بیت المال میں داخل کر دو۔ تم نے ملت کی چراگاہ میں اپنا اونٹ کس طرح چرا لیا۔

(۵) اور ان تمام واقعات سے زیادہ دردانگیز وہ واقعہ ہے جو ان کے صاحبزادہ عبدالرحمٰن کے ساتھ پیش آیا۔ وہ مصر میں تھے۔ ایک دن انہوں نے نبیذ پی لی جس سے نشہ آگیا تو خود ہی والئی مصر، حضرت عمرو بن عاصؓ کے پاس پہنچے کہ ان پر حد جاری کر دی جائے۔ انہوں نے پبلک میں سزا دینے کی بجائے انہیں اپنے گھر کے صحن میں سزا دے دی۔ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو آپ نے سخت ناراضگی سے حضرت عمرو بن عاصؓ

کو لکھا کہ:۔

تم نے عبدالرحمٰن کو اپنے گھر کے صحن میں سزا دی حالانکہ عبدالرحمٰن تمہاری رعایا کا ایک فرد ہے تمہیں اس کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیئے تھا جو تم دوسرے مسلمانوں کے ساتھ کرتے ہو۔ لیکن تم نے سوچا کہ وہ امیر المومنین کا بیٹا ہے حالانکہ تم جانتے ہو کہ میرے نزدیک کسی شخص سے حق وصول کرنے میں نرمی اور رعایت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس وقت تمہیں یہ خط ملے اسے اون کا لباس پہناؤ اور کاٹھی پر بٹھا کر فوراً میرے پاس بھیج دو تاکہ وہ اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جائے۔

عبدالرحمٰن بیمار تھے۔ جب اس طرح کے تکلیف دہ سفر کے بعد باپ کے سامنے پہنچے تو آپ نے کہا کہ۔ عبدالرحمٰن! تم نے یہ حرکت کی ہے؟ ایک اور صحابی، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ان کی سفارش کی اور کہا کہ امیرالمومنین! اس پر حد لگ چکی ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ان کی اس بات پر کوئی دھیان نہ دیا اور بیٹے پر دوبارہ حد لگوائی۔ وہ پہلے ہی بیمار تھا۔ اس تکلیف کو برداشت نہ کر سکا اور باپ کی آنکھوں کے سامنے دم توڑ دیا۔

اور جب اپنے بیٹوں کے ساتھ ان کے سلوک کا یہ عالم تھا تو دیگر عمالِ حکومت کو وہ اس قسم کی اجازت کب دے سکتے تھے۔ انہی حضرت عمرو بن عاصؓ، والیٔ مصر کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ان کے بیٹے نے ایک مصری کو کوڑوں سے پیٹا۔ وہ اسے کوڑے مارتا جاتا تھا، اور کہتا جاتا تھا کہ تم نے دیکھا کہ بڑوں کی اولاد کیسی ہوتی ہے! حضرت عمرؓ تک بات پہنچی تو انہوں نے اس مصری اور ان باپ بیٹے، دونوں کو بلا بھیجا۔ وہی کوڑا مصری کے ہاتھ میں دیا اور کہا کہ اسے اسی طرح سے مارو جس طرح اس نے تمہیں مارا تھا۔ وہ کوڑے مارتا جاتا تھا اور حضرت عمرؓ کہتے جاتے تھے کہ "بڑوں کی اولاد کو مارو"۔ جب وہ بدلہ لے چکا تو آپ نے فرمایا کہ ایک آدھ تازیانہ، (حضرت) عمرو بن عاصؓ کے بھی لگاؤ کہ اگر اسے باپ کے اقتدار کا گھمنڈ نہ ہوتا تو وہ ایسی حرکت کبھی نہ کرتا۔ اس کے ساتھ ہی حضرت ابنِ عاصؓ سے کہا کہ "عمرو! تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنایا۔ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا"۔ کتنا بلیغ ہے یہ مختصر سا فقرہ اور کیسی عظیم حقیقت ہے اس کے اندر پوشیدہ!

مار بڑوں کی اولاد کو

اولاد اور خویش و اقارب کی طرف جھکنے کا یہی وہ رجحان تھا جس کی روک تھام کے لئے حضرت عمرؓ اپنے عمال کو تاکید کرتے رہتے تھے کہ

جو کوئی مسلمانوں کے کسی کام کا مالک ہوا اور پھر اس نے قابلیت کی بجائے اپنی محبت اور قرابت کی

بنا پر کسی کو مسلمانوں کا حاکم بنا دیا، تو اس نے اللہ اور اس کے رسولؐ سے، اور مسلمانوں سے غدّاری کی۔

(سیاستِ الٰہیہ، امام ابن تیمیہؒ)

قرابت اور محبّت کی بنا پر کسی کی طرف جھکنے کا رُجحان ہی نہیں، کسی کے منصب و جاہ کے پیشِ نظر، اس سے کسی قسم کی رعایت برتنے کے رُجحان پر بھی بڑی کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ کا ایک معاملہ میں اختلاف ہو گیا اور دونوں نے حضرت زید بن ثابتؓ کو اپنا ثالث مقرر کیا۔ فریقین حضرت زیدؓ کے پاس حاضر ہوتے۔ حضرت زیدؓ نے

عدالت میں مساوات

اٹھ کر، حضرت عمرؓ کو اپنی جگہ بٹھانا چاہا مگر حضرت عمرؓ حضرت ابی کے ساتھ بیٹھے رہے۔ حضرت اُبی نے اپنا دعویٰ پیش کیا اور حضرت عمرؓ نے اس سے انکار کیا۔ قاعدہ کے مطابق حضرت زیدؓ کو حضرت عمرؓ سے قسم لینی چاہیئے تھی مگر انہوں نے قسم لینے میں تامّل کیا۔ حضرت عمرؓ نے خود قسم اٹھائی اور مجلس کے خاتمہ پر کہا کہ "زید! تم قاضی بننے کے قابل نہیں ہو سکتے جب تک تم امیر المومنین اور ایک مسلمان کو یکساں نہ سمجھو۔" (بیہقی) اسی طرح کا ایک واقعہ ہے جب ایک یہودی نے حضرت علیؓ کے خلاف حضرت عمرؓ کی عدالت میں دعویٰ دائر کیا۔ حضرت علیؓ کا جو مقام ہے، وہ ظاہر ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ان سے کہا،

ابوالحسنؓ! اٹھو اور اپنے مدّعی کے ساتھ جا کر بیٹھو۔

حضرت علیؓ مدّعی کے پاس بیٹھ گئے لیکن چہرے پر کچھ ناگواری کا اثر تھا۔ جب مقدمہ ختم ہوا تو حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ کیا اپنے مدّعی کے برابر بیٹھنا آپ کو ناگوار گذرا؟ آپ نے کہا کہ نہیں! مجھے یہ بات ناگوار نہیں گذری، بلکہ آپ کا اندازِ تخاطب ناگوار گزرا۔ آپ نے مدّعی کا نام لے کر پکارا، اور مجھے (ابوالحسنؓ) کنیت سے پکارا جو تعظیم کا پہلو لئے ہے[1]۔ اس طرح آپ نے مدّعی میں اور مجھ میں فرق کر دیا۔ مجھے اس عدمِ مساوات پر ناراضگی ہوئی۔ قانون کی بارگاہ میں شخصیتوں کا کوئی لحاظ نہیں ہونا چاہیئے۔ آپ نے عذر فرمایا کہ اس باب میں ان حضرات کی نگہ، دور رس کہاں تک جاتی تھی!

خود حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا۔ انہوں نے ایک عیسائی کو کوفہ کے

---

[1] عربوں کے ہاں قاعدہ تھا کہ جس شخص کا احترام مقصود ہوتا، اسے نام کے بجائے اس کی کنیت (ابنِ فلاں یا ابِ فلاں) سے پکارتے تھے۔ حضرت علیؓ نے اسی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

بازار میں اپنی گم گشتہ زرہ فروخت کرتے دیکھا۔ آپ نے امیرالمومنین ہونے کی حیثیت سے اس سے زرہ چھین نہیں لی بلکہ قاضی کی عدالت میں استغاثہ دائر کیا لیکن اپنے دعویٰ کے ثبوت میں شہادت پیش نہ کر سکے۔ اس لئے قاضی نے ان کے خلاف فیصلہ دے دیا اور آپ خندہ پیشانی سے واپس آ گئے۔

یہ تھا ـــــ قانون کی نگاہ میں مساوات کا وہ عظیم اصول جس پر یہ حضرات اس شدّت سے کاربند تھے۔ اور جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، یہ مساوات محض قانون کے احاطے تک محدود نہیں تھی۔ وہ زندگی کے کسی گوشے میں بھی اپنے آپ کو دوسرے انسانوں سے افضل نہیں سمجھتے تھے۔ افضل سمجھنا تو ایک طرف وہ اپنے آپ کو عام لوگوں سے بھی فروتر مقام پر رکھتے تھے۔ ان کا اصول یہ تھا کہ امیرالمومنین کو ضروریاتِ زندگی کی کوئی چیز اپنے لئے اُس وقت لینی چاہیئے جب اُسے اطمینان ہو جائے کہ ملت کے ہر فرد کو وہ چیز میسّر ہے۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ "اگر میں پیٹ بھر کر کھڑا ہو جاؤں اور دوسرے انسان بھوکے ہوں تو اس کے ایک ہی معنی ہیں کہ میں عوام کا والی بننے کے قابل نہیں ہوں۔"

بیت المقدس کا سفر

اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ آپ نے اپنا معیارِ زندگی انتہائی حد تک سادہ رکھا تھا۔ اس سادگی کی ایک جھلک آپ کے اس سفر میں نظر آتی ہے جو آپ نے مدینہ سے بیت المقدس تک کیا تھا۔ وہ ملک ابھی تازہ تازہ فتح ہوا تھا۔ وہاں کے لوگ بالخصوص عیسائیوں کے مذہبی پیشوا، اپنے نئے حکمرانوں کا "جاہ و جلال" دیکھنا چاہتے تھے۔ تاریخ کے اوراق میں اس "جاہ و جلال" کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔

> آپ ایک اونٹ پر سوار تھے، جس پر ایک کمبل پڑا ہوا تھا۔ اترتے تو اسی سے بستر کا کام لیتے۔ دھوپ ان کی پیشانی پر پڑتی تھی۔ سر پر نہ ٹوپی تھی نہ عمامہ۔ کجاوہ کے دونوں طرف پاؤں بغیر رکاب کے لٹک رہے تھے۔ ساتھ دو تھیلے تھے۔ ایک میں ستّو تھا اور دوسرے میں کھجوریں۔ سامنے پانی کی مشک اور پیچھے توشہ دان۔ جب کھانے کا وقت آتا آپ اپنا توشہ دان پیش کرتے۔ اور سب لوگ آپ کے ساتھ کھانا کھاتے۔ راستہ میں ایک جگہ پانی عبور کرنا پڑا۔ بے تکلف اُونٹ سے اُترے، موزے اُتار کر ہاتھ میں لئے۔ اونٹ کی نکیل پکڑی اور پانی میں گھس گئے۔ سپہ سالارِ فوج، حضرت ابوعبیدہؓ ساتھ تھے۔ یہ ماجرا دیکھ کر بولے۔ امیرالمومنین یہاں کے لوگ آپ کی اس حالت کو دیکھ کر بڑا تعجب کریں گے۔ حضرت عمرؓ نے یہ سُن کر فرمایا، ابوعبیدہؓ! کاش یہ بات تمہارے سوا کوئی اور کہتا۔ کیا

تمہیں معلوم نہیں کہ ہم سے زیادہ ذلیل ہم سے زیادہ حقیر اور ہم سے زیادہ کم تعداد دنیا میں کوئی قوم نہ تھی۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے ہمیں اسلام کے صدقے یہ عزّت دی تو یاد رکھو! اگر تم اسلام کی بخشی ہوئی عزت کے سوا کوئی اور عزت حاصل کرنا چاہو گے تو اللہ تمہیں ذلیل کر دے گا۔

بیت المقدس کے قریب پہنچے تو لوگوں کے اصرار پر آپ نے نئے کپڑے بدل لئے۔ سواری کے لئے ایک اسپِ تازی منتخب کیا گیا۔ آپ اُس پر سوار ہوئے۔ وہ جب اٹھلاتا ہوا چلا تو فوراً اُتر پڑے اور ساتھیوں سے فرمایا کہ بھائیو! تم میری لغزش سے درگذر کرو۔ قیامت میں اللہ تمہاری لغزش سے درگذر کریگا۔ جس نخوت اور تکبّر نے اس وقت میرے دل میں راہ پائی، وہ تمہارے امیر کو ضرور ہلاک کر دیتا۔

جب بیت المقدس پہنچے تو آپ کا کھدّر کا کرتہ دونوں پہلوؤں سے پھٹ چکا تھا۔ آپ نے لوگوں سے کہا کہ اپنی قوم کے سردار کو بلاؤ۔ جب پادری آیا تو آپ نے اس سے کہا کہ براہِ مہربانی میرا ایک ذاتی کام کر دیجیئے۔ مجھے ایک کپڑا عاریتہً دے دو۔ اور میری قمیص دھو کر سی دو۔ وہ قمیص دھلوا کر اور پیوند لگوا کر لایا تو آپ نے اپنی قمیص پہن لی اور اس کی قمیص شکریے کے ساتھ واپس کر دی۔

اور یہ واقعہ بھی اسی جگہ کا ہے کہ آپ وہاں کے سب سے بڑے گرجے میں تھے کہ نماز کا وقت آگیا۔ بطریق نے کہا کہ آپ اسی جگہ نماز ادا کر لیجیئے۔ آپ نے معذرت چاہی اور کہا کہ اگر میں نے آج یہاں نماز پڑھ لی تو مسلمان اسے حجّت بنالیں گے اور ہمیشہ یہیں نماز پڑھیں گے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو وہ عیسائیوں کو گرجے سے نکال باہر کریں گے۔ اس لئے مجھے ایسی طرح نہیں ڈالنی چاہیئے۔ چنانچہ آپ نے گرجے سے باہر، کھنڈرات پر ایک جگہ نماز ادا کی۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں بعد میں مسلمانوں نے مسجدِ اقصیٰ تعمیر کی تھی۔

بہر حال، یہ ضمنی واقعہ ہے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ امیر المومنین، اپنا معیارِ زندگی، عام مسلمانوں سے بھی کم تر درجہ کا رکھتا تھا اور ان کے ادنےٰ ادنےٰ کام خود جا کر کر آتا تھا۔ میں نے پہلے کہا ہے کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو بتایا تھا کہ اُن کے امیر المومنین پر کیا حقوق ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ تمہارا مجھ پر یہ بھی حق ہے کہ

جب تم مہمات کے سلسلہ میں اپنے بچّوں سے دور ہو تو میں ان بچّوں کا باپ بنوں۔

لوگوں کے کام

اور وہ ان کے بچّوں کے باپ ہی نہیں بنتے تھے، اُن کے گھروں میں جاکر خدمتگاروں کے سے کام بھی کرتے تھے۔ مدینہ میں ایک اندھی بڑھیا رہتی تھی جو بے آسرا تھی۔ حضرت عمرؓ کا معمول تھا کہ وہ صبح سویرے جاتے اور اس کا ضروری کام کاج کر آتے۔ جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ کوئی شخص ان سے بھی پہلے آکر اُس بڑھیا کا کام کر جاتا ہے۔ آپ نے معلوم کرنا چاہا کہ ایسا شخص کون ہے جو ان پر سبقت لے جاتا ہے۔ ایک دن وہ تاک میں بیٹھے رہے۔ دیکھا کہ حضرت ابوبکر صدّیقؓ تاروں کی چھاؤں آتے ہیں اور اس بڑھیا کے ضروری کام نپٹا گئے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ یہ کام تو میں کیا کرتا تھا۔ اب آپ نے اسے کیوں شروع کر دیا۔ آپ نے کہا کہ اب یہ کام میری خلافت کی ذمہ داریوں کا حصّہ بن گیا ہے لہٰذا یہ مجھے ہی کرنا چاہیئے۔ آپ نے غور فرمایا کہ ان حضرات کے نزدیک، خلافت (یعنی حکومت) کی ذمہ داریاں کیا تھیں۔ یہی وہ ذمہ داریاں تھیں جن کی طرف حضرت عمرؓ کی توجہ اس بڑھیا نے دلائی تھی جس سے شام کے سفر سے واپسی پر ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس سفر میں آپ نے ایک جگہ پڑاؤ کیا

بڑھیا کی توبیخ

اور حسبِ معمول گشت لگانی شروع کی۔ دیکھا کہ ایک بوسیدہ سے خیمہ میں ایک بڑھیا ہے۔ اس سے جاکر پوچھا کہ اس کا کیا حال ہے اور کسی قسم کی کوئی شکایت تو نہیں۔ اس نے کہا کہ میں تمہیں اپنی شکایت کیا بتاؤں جب کہ اس شخص نے جس کی یہ ذمہ داری ہے آج تک کبھی پوچھا تک نہیں۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے جس کی یہ ذمہ داری ہے۔ اس نے کہا کہ وہ جو امیر المومنین بننے کا مدّعی ہے! آپ نے کہا کہ تم نے اپنی تکلیف کی خبر اس تک پہنچائی تھی۔ اس نے کہا کہ یہ میرا کام نہیں کہ میں اس تک خبر پہنچاؤں۔ یہ اُس کا کام ہے کہ رعایا کے ہر فرد کی خبر گیری کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو اسے اس ذمہ داری کو کسی ایسے شخص کے سپرد کر دینا چاہیئے جو اس کا اہل ہو۔

حضرت عمرؓ نے اس واقعہ کو عمر بھر یاد رکھا۔ وہ اکثر اسے دہرایا کرتے تھے اور نم آلود آنکھوں سے کہا کرتے تھے کہ عمرؓ کو اس بڑھیا نے بتایا کہ خلافت کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

میں نے، برادرانِ عزیز! شروع میں کہا تھا کہ خدا کی حکومت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ لوگوں سے اطاعت لینے کا حق اُسے ہی حاصل ہے جو پہلے خود قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرے۔ حاکم بننے کا اہل وہ ہے جو اپنے آپ کو خدا کا محکوم بنا لے۔ جو خدا کا محکوم نہیں اُسے قطعاً حقِ حکومت حاصل نہیں ـــ اور اصل یہ ہے

کہ یہاں سوال حق کا نہیں۔ لوگ قوانین کی اطاعت کرتے ہی اس وقت ہیں جب ان کے اربابِ حل وعقد خود قانون کی اطاعت کریں۔ یہ وہ بنیادی اصول ہے جسے حضرت عمرؓ نے ان جامع الفاظ میں بیان فرمایا کہ

> عوام میں اس وقت تک ٹیڑھ نہیں پیدا ہوتی جب تک ان کے پیشوا اور لیڈر سیدھے رہتے ہیں۔
> .... جب تک راعی اللہ کی راہ میں چلتا ہے، رعایا اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ جہاں اس نے پاؤں پھیلائے، رعایا اس سے پہلے پاؤں پھیلا دیتی ہے۔

ان حضرات نے، جو خود اس شدت سے قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کی تو اس کا عوام پر غیر شعوری طور پر کیا اثر پڑا، اس کا اندازہ ایک معمولی سے واقعہ سے لگائیے۔ ایک رات حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) حسبِ معمول گشت کر رہے تھے کہ ان کا گذر ایک خیمے کے پاس سے ہوا۔ انہوں نے سنا کہ ماں اپنی

خدا شناس لڑکی

بچی سے کہہ رہی ہے کہ بیٹی! دودھ میں تھوڑا سا پانی ملا کر اسے چولھے پر رکھ دو۔ بچی نے یہ سن کر کہا کہ امی جان! میں دودھ میں پانی نہیں ڈالوں گی، کیونکہ خلیفہ نے پچھلے خطبہ میں اس کی ممانعت کی تھی۔ ماں نے کہا کہ اس جگہ کون سا خلیفہ دیکھ رہا ہے؟ بچی نے کہا کہ امی! خلیفہ تو نہیں دیکھ رہا لیکن وہ خدا تو دیکھ رہا ہے جس کا حکم خلیفہ نے پہنچایا تھا؟

حضرت عمرؓ گھر آئے اور بیوی سے کہا کہ صبح فلاں خیمہ میں جا کر، اس بچی کا رشتہ اپنے بیٹے کیلئے مانگ لاؤ۔ جس گھر میں وہ بیٹی آجائے گی وہ گھر خدا کے نور سے بھر جائے گا۔

یہ کردار پیدا کر دیا تھا اُس معاشرہ کے بچے اور بچیوں تک میں ان حضرات کی اطاعتِ خداوندی نے۔

برادرانِ عزیز! اگرچہ وقت زیادہ ہو رہا ہے لیکن اسی سلسلہ میں ایک واقعہ ایسا سامنے آتا ہے جس کا ذکر کیے بغیر اس داستانِ روح پرور و حیرت انگیز کو ختم کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ ان حضرات کو ہمیشہ اس بات کا خیال رہتا تھا کہ ان کے صاحبِ اقتدار ہونے کی وجہ سے نہ کوئی شخص ان سے خوف کھائے اور نہ ہی ان کی بے جا رعایت کرے۔ اس سلسلہ میں ان کی احتیاط کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے جب حضرت عمرؓ کو آخری زخم لگا اور انہیں یقین ہو گیا، کہ ان کی وفات کا وقت قریب آگیا ہے۔ تو

قبر کے لئے جگہ

انہوں نے اپنے بیٹے کو حضرت عائشہ کے پاس بھیجا اس درخواست کے ساتھ کہ انہیں حجرۂ عائشہؓ میں، نبیٔ اکرمؐ اور حضرت صدیقِ اکبرؓ کی معیت میں

دفن ہونے کی اجازت دیجائے۔ حضرت عائشہؓ نے اس کی اجازت دے دی۔ حضرت عمرؓ نے تھوڑا توقف فرمایا اور بیٹے سے کہا کہ میرے مرنے کے بعد، حضرت عائشہ سے ایک مرتبہ پھر دریافت کرنا۔ اگر وہ اجازت دیں تو مجھے وہاں دفن کرنا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس احتیاط میں کس قدر لطیف و نازک احساس کارفرما ہے! آپ نے خیال کیا ہوگا کہ ہو سکتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے امیرالمومنین کی پوزیشن کے مدِّنظر یہ اجازت دے دی ہو۔ میرے مرنے کے بعد میری یہ پوزیشن باقی نہ رہے گی۔ اس لئے اس وقت پھر اجازت لے لینا۔ وہ اجازت ایسی ہوگی جس پر میری یہ موجودہ پوزیشن کسی طرح اثر انداز نہیں ہوگی۔

یہ ہے، برادرانِ عزیز! اجمالی سا نقشہ، اسلامی مملکت کے فرماں رواؤں کی زندگی اور سیرت کا۔ دنیا

مساواتِ انسانیہ

کے کسی نظامِ حکومت کو لیجیئے، اس میں سب سے اونچے درجہ کا حاکم اقتدارِ مطلق (SOVEREIGNTY) کا مالک ہوتا ہے۔ اس کے بغیر کوئی نظامِ حکومت چل ہی نہیں سکتا۔ لیکن اسلامی مملکت کا سب سے بڑا فرماں روا بھی اقتدارِ مطلق کا مالک نہیں ہوتا وہ بھی خدا کے احکام و قوانین کا اسی طرح محکوم ہوتا ہے جس طرح اُس مملکت کے دوسرے افراد۔ یہی وہ بنیادی خصوصیّت ہے جس سے، اس نظامِ حکومت میں، حاکم اور محکوم کا تصوّر مٹ جاتا ہے۔ اس میں کوئی حاکم ہوتا ہی نہیں۔ سب خدا کے محکوم اور اس کے احکام کو نافذ کرنے کی ایجنسی ہوتے ہیں۔ یہ ہے وہ تصور جس سے حقیقی مساواتِ انسانیہ پیدا ہوتی ہے۔

صلوٰۃ وسلام

لاکھ لاکھ صلوٰۃ وسلام ہو، نوعِ انسان کے اس رہبرِ اعظمؐ پر جس نے اپنی عدیم النظیر تعلیم اور فقید المثال عملی تربیت سے، دنیا کو بتا دیا کہ ایسا نظامِ حکومت کس طرح قائم کیا جا سکتا ہے جس میں حاکم اور محکوم میں کوئی امتیاز نہ ہو، جس میں فی الحقیقت محمودؔ اور ایازؔ میں کوئی تفریق نہ ہو۔ مساواتِ انسانیہ کا یہی وہ بنیادی تصوّر تھا جس کے پیشِ نظر حضورؐ نبی اکرم نے فرمایا تھا کہ دنیا جس قدر جی چاہے اپنے غلط نظام بنا لے، ان کے پیدا کردہ طوفانوں، زلزلوں اور جھگڑوں کے بعد، ایسا نظام پھر سے قائم ہو کر رہے گا جس میں انسانی مساوات کی حسین جنت، وجہِ احترامِ آدمیت ہوگی۔ اس نظام کی خصوصیّت یہ ہوگی کہ یقسم المال صحاحًا[1] اس میں مال و دولت کی تقسیم صحیح پیمانوں کے مطابق ہوگی جب پوچھا گیا کہ "صحیح تقسیم" کا معیار کیا ہوگا؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ بالسویۃ بین الناس۔ تمام انسانوں میں مساوی تقسیم۔

[1] مجمع الزوائد، نیز ترمذی

اس میں فرماں روا کا حصہ فرماں پذیر سے زیادہ نہیں ہوگا اور یہی ہے نبیؐ اکرمؐ کا وہ اسوۂ حسنہ جو ساری دنیا کے لئے دعوتِ انقلاب اور نشیدِ حیات ہے۔ دنیا کی جس سعادت مند قوم نے بھی اپنے آپ کو اس پیکر میں ڈھال لیا وہ نوعِ انسانی کی امامتِ کبریٰ کی مستحق قرار پا جائے گی اور اس کا ایک ایک فرد، بارگاہِ رسالتمآبؐ میں پکار پکار کر کہے گا کہ ؎

منزل ملی، مقام ملا، مدعا ملا
سب کچھ مجھے ملا جو ترا نقشِ پا ملا

پاکستان
اور
دین اور سیاست

(جنوری ۱۹۶۶ء)

ماہنامہ نصرت (لاہور) کے مدیرِ محترم حنیف رامے صاحب کے، پرویز صاحب سے
ایک خصوصی انٹرویو کی روئیداد ——— مرتبہ: حنیف رامے صاحب

حنیف: اگر کسی کو یہ یادگار نعرہ بھول نہیں گیا کہ پاکستان کا مطلب کیا "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" تو وہ شاید اس سے انکار نہ کر سکے کہ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا تھا۔ لیکن پچھلے سترہ سال سے کئی بار یہ کوشش ہوئی ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس حقیقت پر پردہ ڈال دیا جائے۔ کبھی کسی بڑے مصنّف نے حکم لگایا کہ تحریکِ پاکستان میں اسلام کا نام محض عوام کو ساتھ ملانے کے لئے لیا گیا تھا، ورنہ اصل مقصود تو مسلمانوں کا معاشرتی، معاشی اور ثقافتی تحفظ تھا جو ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے خطرے میں پڑ گیا تھا۔ کبھی کسی بڑے وکیل نے ثبوت مہیا کیا کہ اسلام پر عمل کرنا ممکن ہی نہیں کیونکہ مسلمانوں کے متعدد فرقوں میں اسلامی قوانین کے تعین پر شدید اختلاف پایا جاتا ہے، جو ایک کے نزدیک معروف ہے وہ دوسرے کے لئے منکر ہے۔ اس طرح ہم میں اندر ہی اندر ایک منافقت پرورش پاتی رہی جس کے تحت ہم نہ تو اسلام کا نام لینا چھوڑ سکے اور نہ ہم نے اس کی روشنی میں اپنی سیاسی، معاشرتی اور معاشی راہیں تراشنے کی سبیل کی۔ پھر ایک دن آیا کہ ملک کے نام سے اسلامیہ کا لفظ اڑ گیا۔ منافقانہ اسلامیت سے یہ اعلانیہ غیر اسلامیت بہتر تھی لیکن جن عوام

کو ساتھ ملانے کے لئے خواص نے ایک مرتبہ اسلام کا نام لیا تھا وہ ابھی اس واقعہ کو نہ بھولے تھے بلکہ برسوں کی سیاسی بیوستہ معاشرتی ہلچل اور معاشی استحصال کو وہ اسی امید پر برداشت کرتے آئے تھے کہ کبھی تو اس مملکتِ خدا داد پر اس قانون کی حکومت کے دن آئیں گے جس کا اسوہ نبی کریمؐ نے قائم کیا تھا۔ انہوں نے ضد کی اور اسلامیہ کا لفظ اس ملک کے نام میں دوبارہ شامل ہو گیا۔

اب پچھلے دنوں ہم نے ایک انقلاب آتے دیکھا۔ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ ایک طرف تو آفاق پر دشمن کی یلغار تھی اور دوسری جانب انفس میں خدا جاگ رہا تھا۔ وہ خدا جو نیٹشے کے الفاظ میں مر چکا تھا، ہمارے دل و دماغ کے گرد بادوں سے ابھر کر اس طرح ہماری آنکھوں کے سامنے آیا کہ ہم نے اور ہمارے لشکروں نے باقاعدہ خدا لئے ذوالجلال کے زیرِ کمان اپنے غنیم سے ٹکر لی اور جرأت و جواں مردی کے تازہ و تابندہ باب لکھے۔

آج یہ حالت ہے کہ ہمارے اندھوں کو بھی انسانی معاملات میں خدا کی کارفرمائی کا یقین آ چکا ہے آج یہ حالت ہے کہ قیامِ پاکستان کے وقت ایک لمحے کو خوابِ خرگوش سے بیدار ہونے والی قوم ایک مرتبہ پھر چونک کر کروٹ بدل چکی ہے۔ اگر ہم نے اس لمحۂ بصیرت کو پہلے کی طرح ضائع کر دیا تو یہ اپنے ساتھ ظلم ہو گا۔

قرآنِ عظیم کے ایک ورق گرداں کے طور پر میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اسلام کی تعلیم سیاست معاشرت اور معیشت کے نئے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے سے ایسی ہی قاصر ہے کہ اس پر ہمارا ایمان جمتا ہی نہیں اور ہم کبھی اس در پر اور کبھی اُس در پر اور کبھی اس چیز کی اور کبھی اُس چیز کی بھیک مانگتے پائے جاتے ہیں؟ اور کیا قرآن کے بے بدل الفاظ، بہمہ وسعت معانی، اس کے محکمات و متشابہات اس امر کی کفایت نہیں کرتے کہ ہمیں بنیادی باتوں پر متفق کر کے ہمارے لئے خدا کی وحدت آفرین رسّی اور عروۃ الوثقیٰ بن جائیں، وہ علامات بن جائیں جو زمین پر خدا کے بندوں کو امید سے ہمکنار رکھتی ہیں۔

پرویز: حنیف صاحب! آپ نے جو سوال اٹھایا ہے وہ بڑا اہم ہے اور تفصیلی جواب کا متقاضی۔ اس کا تعلق کسی ہنگامی تحریک یا دورِ حاضر کے تقاضوں سے نہیں۔ اس کا تعلق ہماری ہزار سالہ تاریخ سے ہے۔ ہمارے قرنِ اوّل میں جب اسلام کا لفظ بولا جاتا تھا تو ہر ایک کے ذہن میں اس کا ایک ہی تصور ہوتا تھا اور عملی زندگی میں اس کا ایک ہی مفہوم لیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام مسلمان ایک امت تھے۔ ان کا ایک

نظام تھا سب کے لئے ایک قانون تھا. اس کے بعد جب (بدقسمتی سے) ہماری گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی تو امت کی وحدت ختم ہو گئی. اس میں مختلف فرقے پیدا ہو گئے (حالانکہ فرقہ بندی کو قرآن کریم نے، بالفاظِ صریح شرک قرار دیا ہے)، ہر فرقے نے اپنی فقہ الگ مرتب کر لی. ان حالات میں ظاہر ہے کہ تمام مسلمانوں کے لئے ایک قانون مرتب ہونا ناممکن تھا یعنی ایک ایسا ضابطۂ قوانین جس کا اطلاق تمام فرقوں کے مسلمانوں پر یکساں ہو. اس مشکل کے حل کے لئے سوچا یہ گیا کہ سیاست کو مذہب سے الگ کر لیا جائے (یعنی فرقہ بندی کے شرک کی پیدا کردہ خرابی کے حل کے لئے ایسا علاج سوچا گیا جو اسلام کے نقطۂ نگاہ سے صریح کفر ہے) سیاست کے متعلق قوانین اربابِ حکومت کے سپرد کر دیئے گئے اور پرسنل لاز (شخصی قوانین) اربابِ مذہب کی تفویض میں دے دیئے گئے اور ہر فرقے کو اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق اپنے شخصی معاملات (نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ سے متعلق معاملات) کے فیصلے کر لیا کریں اس سے اربابِ حکومت بھی خوش ہو گئے کہ ان پر کسی قسم کا کنٹرول نہ رہا اور اربابِ مذہب بھی راضی کہ ایک دائرے کے اندر ان کا اقتدار قائم رہا. نقصان صرف اتنا ہوا کہ اس سے وہ اسلام باقی نہ رہا جو نبی اکرمؐ کے زمانے میں تھا. ہر ایک کا "اسلام" الگ الگ ہو گیا. ذرا سے غور کرنے پر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی یہ وہی شکل ہے جسے آجکل کی اصطلاح میں سیکولر فارم (SECULAR FROM) کہا جاتا ہے. ظاہر ہے کہ اگر اسلام کی اس شکل کو صحیح تسلیم کر لیا جائے اور اسے بعینہٖ قائم رکھنے کے مطالبے کو اقامتِ دین قرار دے دیا جائے تو پھر ان اعتراضات کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا جن کی طرف آپ نے اپنے سوال میں اشارہ کیا ہے. اس صورت میں پاکستان کے لئے فی الواقع کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو سکے.

لیکن ان اعتراضات کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ ان میں مروجہ اسلام کو حقیقی اسلام تصوّر کر لیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو اعتراضات موجودہ (غیر اسلامی) اسلام کے خلاف ہونے چاہئیں وہ (حقیقی) اسلام پر عاید کر دیئے گئے ہیں. ایک عامی کی طرف سے اس قسم کی غلط نگہی کا مظاہرہ قابلِ فہم ہو سکتا ہے لیکن جب اس قسم کی باتیں قوم کے دانشمند طبقے کی طرف سے سامنے آئیں تو اس سے افسوس ہی نہیں صدمہ ہوتا ہے. جب علامہ اقبالؒ نے (۱۹۳۰ء میں) پاکستان کا تصوّر پیش کیا تھا تو انہوں نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا تھا.

مسلم مملکت کا میرا یہ مطالبہ ہندوستان اور اسلام دونوں کے لئے منفعت بخش ہوگا. ہندوستان کو

اس سے اس حقیقی امن اور سلامتی کی ضمانت مل جائے گی جو قوتوں کے توازن کا فطری نتیجہ ہو گی اور اسلام کو اس سے ایسا موقع میسّر آجائے گا جس سے یہ اس ٹھپے کو مٹا سکے جو عرب ملوکیت نے اس پر زبردستی لگا رکھا ہے اور یہ اس قابل ہو سکے گا کہ یہ اپنے قوانین، تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے اور انہیں عصرِ حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے۔

ہمارا مروجہ اسلام وہی ہے جس پر عرب ملوکیت کا ٹھپہ لگا ہوا ہے۔ لہٰذا پاکستان کی تشکیل سے مقصود یہ تھا کہ اس میں مروجہ اسلام کی جگہ نبی اکرمؐ کے عطا فرمودہ اور عملاً قائم کردہ اسلام کو ازسرِ نو زندگی اور حرکت عطا کی جا سکے۔ سطح بین نگاہوں اور تقلیدی جمود میں جکڑے ہوئے قلوب واذہان کے لئے یہ سمجھنا واقعی مشکل ہے کہ مروجہ اسلام کی خارزار وادیوں سے نکل کر صحیح اسلام کی طرف آنا کیسے ممکن ہے، لیکن جو حضرات اس سطح سے بلند ہو کر دیکھتے ہیں ان کے سامنے کوئی دقت نہیں رہتی۔ سابقہ اقوام کے زمانے میں ایسے وقت میں ایک نیا نبی آجایا کرتا تھا جو خدا کی طرف سے عطا کردہ دینِ خالص میں ملے ہوئے انسانی نظریات و تصورات کو الگ کر کے، دینِ خالص کو پھر سے قوم کے سامنے لے آتا تھا، لیکن ختمِ نبوت کے بعد خدا کی طرف سے اس کا انتظام یہ ہوا کہ اس نے اپنی کتاب (قرآن کریم) کو، جس میں دینِ خالص اپنی حقیقی، منزہ اور مکمل شکل میں دیا گیا ہے، محفوظ کر دیا گیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا۔ چنانچہ یہ کتاب اپنی اصلی اور غیر محرّف شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ خالص اسلام کو پھر سے نظامِ حیات بنانے سے مقصود ہے کہ ہم اپنی حیاتِ اجتماعیہ کو قرآن کریم میں عطا کردہ خطوط پر متشکل کر لیں۔ قرآن کریم پر تمام مسلمانوں کا ایمان ہے۔ یہی ان سب میں قدرِ مشترک ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں، اس لئے اگر خدا کی اس کتابِ عظیم کو اساس تسلیم کر لیا جائے تو امت میں پھر سے وہی وحدت پیدا ہو سکتی ہے جو عہدِ نبی اکرمؐ میں وجہ سرفرازیٔ انسانیت تھی۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں کہا تھا کہ مسلمانوں کو موجود الجھاؤ سے نکالنے کے لئے ایک ایسے جرأت مند قلب کی ضرورت ہے جو عمرؓ کی روح کو لئے ہوئے اٹھے اور اس کا اعلان کر دے کہ

حسبنا کتاب اللّٰہ۔ ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

یہی تھا وہ اجمال جس کی تفصیل قائدِ اعظمؒ نے ۱۹۴۱ء میں عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد دکن کے طلباء کے ایک سوال کے جواب میں، ان الفاظ میں بیان کی تھی کہ

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارے کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کر سکتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے . . . . اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب سے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطے سے باہر ہو۔

قرآنِ کریم کی تعلیم کا انداز یہ ہے کہ اس میں (بجز چند احکام کے جن کا تعلق بیشتر انسان کی عائلی زندگی سے ہے) زندگی کے مختلف تقاضوں کے متعلق اصول دیئے گئے ہیں اور امتِ مسلمہ سے کہا گیا ہے کہ وہ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے پیش آمدہ امور کے لئے اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کی روشنی میں، باہمی مشاورت سے، جزئی قوانین خود مرتب کریں۔ یہ اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن انکی روشنی میں مرتب کردہ قوانین بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ بدلتے رہیں گے۔ اس طرح اس اُمت کا نظام خدا کی طرف سے عطا کردہ مستقل اقدار کا دامن پکڑے ہوئے نہ صرف زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دیتا ہوا، بلکہ ان کی امامت کرتا ہوا آگے بڑھتا جائے گا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے اپنے مخصوص بلیغ انداز میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلّی کی روحانی اساس ازلی و ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیّر و تنوّع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور سے متشکل ہوگا اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیّر پذیر عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اقدار اور ابدی اصول ہوں . . . . . لیکن اگر ان ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے کے اندر تغیّر کا امکان ہی نہیں . . . . تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے یکسر جامد بن کر رہ جائے گی۔

قرآنِ کریم کا یہ انداز اس طریق کے عین مطابق ہے جسے آجکل سائنٹیفک طریق کہا جاتا ہے۔ عام طور پر سمجھا

یہ جاتا ہے کہ سائنٹسٹ تجرباتی طریق سے قوانین مرتب کرتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ نہیں۔ سائنٹسٹ قوانین فطرت مرتب نہیں کرتے، فطرت کے قوانین کو دریافت کرتے ہیں۔ ان قوانین کے متعلق، جنہیں اساسی قوانین (AXIOM) کہا جاتا ہے، سائنٹسٹ یہ بتا ہی نہیں سکتے کہ وہ کس طرح وضع اور دریافت ہوئے تھے۔ سائنس ان قوانین کو بطورِ حقیقتِ ثابتہ تسلیم کر کے انہیں اپنی تحقیق کی بنیاد قرار دیتی ہے اور اس تحقیق کے نتائج کو پیش آمدہ حالات پر منطبق کرتی ہے۔ سائنس کا تعلق خارجی کائنات سے ہے اور دین کا تعلق انسان کی ہیئتِ اجتماعیہ سے۔ جن قوانین کو سائنس کی دنیا میں (AXIOM) کہا جاتا ہے دین کے نظام میں وہ مستقل اقدار یا وحی کے عطا کردہ اساسی اصول کہلاتے ہیں۔ یہ اصول غیر متبدل رہتے ہیں اور ان کی روشنی میں مرتب کردہ جزئیات زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی جاتی ہیں۔ یہ تھا اسلام کا وہ بنیادی تصور جس کو عملی پیکر عطا کرنے کے لئے پاکستان وجود میں لایا گیا تھا۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد سے میری یہی کوشش رہی کہ مملکت کے دستور میں یہ شق رکھی جائے کہ مملکت کے قوانین کی بنیاد قرآن کریم ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس اصول کو تسلیم کر لینے سے ایک طرف حکومت کا سیکولر انداز بھی ختم ہو جاتا تھا اور دوسری طرف مذہبی پیشوائیت کا وہ اقتدار بھی باقی نہ رہتا تھا جو اسے شخصی قوانین کے دائرے میں اس وقت حاصل ہے۔ اس لئے میری دعوت کی مخالفت دونوں طرف سے ہوئی۔ سیکولر نظام کے حامی تو کھل کر سامنے نہیں آسکتے تھے لیکن مذہبی پیشوائیت کے لئے میدان وسیع تھا۔ مذہبی پیشواؤں نے یہ تو نہیں کہا (نہ ہی وہ ایسا کہنے کی جرأت اپنے اندر پاتے تھے) کہ قرآن کی آمد سے ان کی تھیاکریسی ختم ہو جاتی ہے، اس لئے وہ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ انہوں نے عوام کے نازک جذبات کا سہارا لے کر یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ یہ انکارِ سنت ہے، یہ (معاذ اللہ) انکارِ رسالت ہے۔ میں اس مقام پر اقرار و انکارِ سنت کی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ وہ ہمارے پیشِ نظر موضوع سے متعلق نہیں لیکن اتنی بات تو صنیف صاحب! بادنیٰ تدبر واضح ہو جائے گی کہ ان حضرات کے نزدیک اسلام کا یہی نقشہ تھا کہ مملکت میں پبلک لاز الگ ہوں اور پرسنل لاز الگ، پبلک لاز حکومت کے زیرِ اقتدار ہوں اور پرسنل لاز مذہب کے دائرے میں ــــــ اور پھر پرسنل لاز میں ہر فرقے کا مسلک الگ الگ ہو اور اس طرح امت کے تفرقے کو مستقل سند حاصل رہے۔ اسلام کا یہ نقشہ ان حضرات کے نزدیک عین مطابقِ سنت ہے اور یہ نقشہ کہ قوانین میں کسی قسم کی تفریق نہ ہو، سب کا سرچشمہ خدا کی کتاب ہو اور یہ قوانین تمام مسلمانوں پر یکساں منطبق ہوں تاکہ امت کا

تفرقہ اور انتشار ختم ہو کر اس میں پھر سے وحدت پیدا ہو جائے، ان کے نزدیک خلافِ سنّت ہے اور اس کا نام انکارِ رسالت ہے۔ فرمایئے کہ اس کا کیا جواب دیا جائے۔

بہر حال، ان مخالفتوں کے علی الرغم میں نے اپنی یہ کوشش جاری رکھی کہ ہمارے ہاں یہ اصول آئینی طور پر تسلیم کر لیا جائے کہ ہمارے قوانین کی بنیاد قرآن کریم پر ہوگی جو تمام فرقوں کے مسلمانوں میں مشترک قدر ہے۔ جب ۱۹۶۲ء کے آئین کی ترتیب کا سوال زیرِ غور تھا تو حکومت کی طرف سے ایک سوال نامہ جاری کیا گیا تھا۔ میں نے اس سوال نامے کے جواب میں اس بنیادی نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے اس اصول پر خاص زور دیا تھا۔ لیکن جب آئین مرتّب ہو کر سامنے آیا، تو اس میں "قرآن" کی بجائے "اسلام" کا لفظ لکھا تھا جسے سیکولرزم کے حامیوں نے اسے بعد میں "کتاب و سنّت" کے الفاظ سے بدلوالیا۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہے۔

جس منافقت کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے وہ اسی کا لازمی نتیجہ ہے۔ سیکولر نظامِ حکومت کے حامی دل میں اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ "اسلام" ہو یا "کتاب و سنّت"، اس سے قیامت تک کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتّب نہیں ہو سکتا جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے (اس لئے کہ "اسلام" کی طرح "سُنّت" کا مفہوم بھی ہر فرقے میں الگ الگ ہے۔ اسی اختلاف کا نتیجہ ہے کہ اتباعِ سنّت کے مدعی حضرات آج تک یہ طے نہیں کر سکے کہ نماز میں اونچی آواز سے آمین کہنا مطابقِ سنت ہے یا خفی آواز سے۔ اس سے آپ اندازہ فرما لیجئے کہ اس مسلک کی رُو سے کبھی یہ ممکن ہے کہ ایک ایسا ضابطۂ قوانین مرتّب کیا جا سکے جو ان تمام حضرات کے نزدیک یکساں طور پر قابلِ تسلیم ہو؟) لہٰذا یہ طبقہ مطمئن ہے کہ نہ اسلامی قوانین مرتب ہوں گے نہ مملکت اسلامی بنے گی۔ دوسری طرف مذہبی پیشوائیت بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ اس طرح ایسا ضابطۂ قوانین تا حشر مرتّب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک "اسلامی" کہلا سکے۔ اس لئے ان کی فرقہ بندی اور پرسنل لاز کے دائرے میں ان کا اقتدار بدستور قائم رہے گا۔ اس سے دونوں گروہ بخوبی واقف ہیں لیکن سیکولرازم کا حامی گروہ یہ کہہ چھوڑتا ہے کہ فرقوں کا اختلاف قانون سازی کی راہ میں حائل ہے اور مذہبی پیشوائیت یہ طعنہ دے چھوڑتی ہے کہ اربابِ حکومت چاہتے ہی نہیں کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ ہوں اور "اسلامی قوانین" سے ان کی مراد ہوتی ہے شراب، جوئے، ریس اور زنا کی ممانعت یا عورتوں کی بے حجابی، یا مردوں کے جسم خانے اور کلب وغیرہ پر بندش، یعنی وہ اخلاقی برائیاں جن کے بارے میں ان کے تمام فرقے متفق ہیں۔ لیکن جن امور میں ان حضرات میں باہمی اختلاف ہے، ان کا ذکر کبھی نہیں آتے

کا ان سے پوچھیئے کہ یہ اخلاقی برائیاں قرآنِ کریم کی رُو سے جرائم ہیں لیکن فرقہ بندی اس کی نصِ صریح کے مطابق شرک ہے۔ آپ جرائم کی روک تھام کے لئے قانون سازی پر تو اس قدر زور دیتے ہیں لیکن اس شرک کو ختم کرنے کے لئے آپ کی طرف سے کبھی اشارہ تک نہیں ہوتا بلکہ اگر حکومت کی طرف سے اس کے لئے کوئی کوشش ہوتی ہے تو آپ حضرات اس کے خلاف متحدہ محاذ بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کوشش کو ناکام بنائے بغیر چین نہیں لیتے۔ مثلاً ۱۹۶۲ء کے آئین میں پرسنل لاز کے متعلق مختلف فرقوں کے الگ الگ قوانین کے تصوّر کو ختم کر دیا گیا تھا لیکن ان حضرات کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی اور انہوں نے آئین کی اس شِق کو بدلوا کر، اس کی جگہ فرقہ وارانہ تعبیر کی شِق داخل کرا لی۔

گزشتہ ستمبر کے قیامت خیز ہنگامے میں ہماری قوم کے دل میں جو بے پناہ جذبہ بیدار ہوا ہے، اور اس نے جو محیّر العقول کارنامے کر دکھائے ہیں، وہ نتیجہ ہیں اسلام کے ساتھ اس گہرے لگاؤ کا جو ہمارے عوام کے تحت الشعور میں خوابیدہ چلا آرہا ہے اور جو اس قسم کے تصادمات کے وقت یک دم بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ متاعِ بیش بہا ہے اور اسے عمدہ تعمیری مقاصد کے لئے کام میں لایا جا سکتا ہے لیکن ہمارے پیشِ نظر جو سوال ہے اس کا تعلق جذبات سے نہیں، علم و بصیرت اور تفقّہ و تدبّر سے ہے سوال زیرِ غور یہ ہے کہ پاکستان میں وہ نظامِ زندگی کس طرح متشکل کیا جائے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا؟ اور ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب غور و فکر کا متقاضی ہے۔ ہمارے عوام کے یہ جذبات بھی اس سے پہلے ضائع جاتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قوم کے سامنے کوئی متعیّن مقصد نہیں۔ بالفاظِ دیگر، یوں کہیئے کہ عوام بیچارے نہایت خلوصِ نیّت سے یہ قربانیاں "اسلام" کی خاطر دیتے ہیں اور ہمارے ہاں ابھی تک یہ متعیّن نہیں کہ اسلام ہے کیا۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، ہمارے ہاں ہر ذہن میں اسلام کا الگ مفہوم ہے۔ عوام کی اسلام کے ساتھ یہ محبّت ایک نادیدہ محبوب کے ساتھ عشق کے مترادف ہے، یعنی اقبالؒ کے الفاظ میں ہماری قوم کی کیفیت یہ ہے ـــــ

دِلے دارند و محبوبے ندارند

یہی وجہ ہے کہ جب تک یہ جذبہ لاشعوری طور پر کام کرتا ہے، قوم بے پناہ قربانیاں دیتی چلی جاتی ہے اور جب وہ شعوری طور پر اس پر نگہ بازگشت ڈالتی ہے اور اپنے گرد و پیش دیکھتی ہے تو اُسے کچھ اور ہی نظر آتا ہے اور یوں ان کا وہ جذبہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات اس کا ردِّعمل بڑا شدید ہوتا ہے۔ عوام کے

اس قیمتی جذبے کو مستقل شعار بنانے کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ اسلام کا صحیح مفہوم متعین کر کے اسے عملی نظام کی شکل میں متشکل کیا جائے جس کے حسین و خوشگوار نتائج اسے ان کی نگاہوں میں دنیا کی ہر متاع سے زیادہ عزیز بنا دیں اور یوں وہ اس کے تحفظ و بقاء کی خاطر ہر قربانی کے لئے نہ صرف جذباتی طور پر بلکہ علیٰ وجہ البصیرت ہر وقت تیار ہوں۔

باقی رہے وہ حضرات جو یہ حکم لگاتے ہیں کہ تحریکِ پاکستان میں اسلام کا نام محض عوام کو ساتھ ملانے کے لیے لیا گیا تھا، ورنہ اصل مقصد تو مسلمانوں کا معاشرتی، معاشی اور ثقافتی تحفظ تھا جو ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے خطرے میں پڑ گیا تھا، تو ان کے متعلق میں اس سے زیادہ اور کیا عرض کر دوں کہ اس سے تحریکِ پاکستان کے قائد (محمد علی جناح) کے متعلق جس کردار کا تصور یہ حضرات پیش کرتے ہیں وہ تصور قائدِ اعظمؒ کے دشمنوں تک نے بھی پیش نہیں کیا تھا۔ ان کے دشمنوں نے ان کے خلاف بہت کچھ کہا لیکن اتنا کہنے کی جرأت کسی کو بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ "منافق" تھا ـــ اور منافق بھی ایسا جو حصولِ مقصد کی خاطر اسلام جیسے مقدس جذبے کی آڑ لے رہا تھا، اسے (EXPLOIT) کر رہا تھا، جدّ و جہدِ آزادی کے دس سالہ دور میں قائدِ اعظم کی تقاریر، تحریرات، بیانات، خطوط وغیرہ کو دیکھئے۔ وہ مسلسل اور متواتر پکارتے چلے جاتے ہیں کہ اس مطالبے کی بنیاد، ہمارے دین کا تقاضا ہے۔ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں تو بربنائے مذہب۔ ہم اپنی جداگانہ مملکت چاہتے ہیں تو اس لئے کہ

ہم اس میں اپنے ضابطۂ حیات، ثقافتی نشو و نما، روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

وہ واضح طور پر بتاتے رہے کہ:۔

پاکستان سے یہ مطلب نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف اپنی آزادی ہی حاصل نہیں کرنی، ہم نے اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

جب پوچھا جاتا کہ تشکیلِ پاکستان سے ہو گا کیا تو وہ جواب میں کہتے:۔

اس سے یہ آواز فضائے عالم میں گونجے گی کہ دنیا میں ایک ایسی مملکت بھی ہے جو اسلام کی عظمتِ گزشتہ کو از سرِ نو زندہ کرے گی۔

آپ کو غالباً یاد ہوگا کہ ایک دفعہ ۱۹۴۰ء میں مسٹر گاندھی نے قائدِاعظمؒ سے یہ کہہ دیا تھا کہ آپ سیاست میں مذہب کو کیوں گھسیٹ لائے ہیں، تو اس کے جواب میں انہوں نے برملا کہا تھا کہ

میرے نزدیک زندگی کا کوئی شعبہ ہو، مذہب انسان کے ہر عمل کو اخلاقی بنیاد عطا کرتا ہے۔ اگر مذہب کو بیچ میں نہ لایا جائے تو انسان کی زندگی میں شور و شغب کے سوا رہ کیا جاتا ہے۔

قائدِاعظمؒ نے اسلامی مملکت کے بنیادی امتیاز کے متعلق جو کچھ عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کے سوال کے جواب میں بتایا تھا اس کا ذکر میں ابھی ابھی کر چکا ہوں۔

ہمارے یہ پاکستانی کرم فرما کہتے ہیں کہ جناح نے اسلام کا نام محض عوام کو ساتھ ملانے کے لئے چپکا رکھا تھا اور نہ اس کا مقصد کسی اسلامی مملکت کا قیام نہیں تھا لیکن سنیئے کہ اس زمانے کے ہندو کیا سمجھتے تھے۔ ۱۹۴۱ء میں لدھیانہ میں اکھنڈ ہندوستان کانفرس منعقد ہوئی جس کے صدر مسٹر منشی تھے۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا تھا۔

آپ کو کچھ معلوم ہے کہ پاکستان کیا ہے؟ نہیں معلوم تو سن لیں! نظریۂ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ گوشوں میں اپنے لئے ایسے مساکن بنالیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھو کہ پاکستان مسلمانوں کا ایسا خطہ ہوگا جس میں اسلامی حکومت قائم ہو۔

ہندو تو قائدِاعظمؒ کے اسلامی نعرے کو حقیقت پر مبنی سمجھتا تھا اور ہمارے یہ مسلمان بھائی اسے "دروغ مصلحت آمیز" سے تعبیر فرماتے ہیں!

پھر اس کا کیا جواب کہ جب پاکستان بن گیا اور (بقولِ معترضین) قائدِاعظمؒ کے پیشِ نظر وہ مصلحت یا ضرورت نہ رہی جس کے تابع وہ اپنی ہر بات کے ساتھ اسلام کا نام چپکائے رکھتے تھے تو انہوں نے اس وقت بھی اسلام کا نام نہ چھوڑا۔ انہوں نے جولائی ۱۹۴۸ء میں اسٹیٹ بنک کا افتتاح کرتے ہوئے جو تقریر کی تھی (اور جو غالباً ان کی زندگی کی آخری تقریر تھی) اس میں انہوں نے کہا تھا۔

ہمارے پیشِ نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوشحالی اور اطمینان کی زندگی بسر کریں۔ اس مقصد کا حصول مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے نہیں ہو سکے گا۔ ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہیئے اور دنیا کے سامنے ایسا نظام پیش کرنا چاہیئے جو اسلامی مساوات اور عدلِ عمرانی کے اسلامی

تصورات پر مبنی ہو۔ صرف یہی طریق ہے جس سے ہم اس فریضہ سے عہدہ برآ ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عاید ہوتا ہے اور ہم دنیا کو وہ پیغام دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچالے جائے اور نوعِ انسان کی بہبود مسرّت اور خوشحالی کا ضامن ہو سکے۔ یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔

یہ تھی جناؔح کی آخری پکار جب اسے کسی "مصلحت آمیزی" کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بے شک مسلمانوں کی معاشرتی اور معاشی بہبود چاہتا تھا لیکن صرف قرآنی نظام کی رُو سے، جس میں آج بھی یہ قوت موجود ہے کہ وہ ہر اس قوم کو جو اسے اپنا مسلکِ زندگی قرار دے لے، نہ صرف مادّی سرفرازیوں سے ہمکنار کر دے بلکہ شرفِ انسانیّت کی معراجِ کبریٰ تک پہنچا دے ـــ "یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا"۔

حنیف: پرویز صاحب! آپ نے "نصرت" کے گزشتہ شماروں میں جناب منظور قادر سے میرا ایک انٹرویو دیکھا ہوگا۔ منظور قادر صاحب نے جس نقطۂ نظر سے دین اور سیاست کے رشتے پر بات کی ہے، وہ بظاہر آپ کے نقطۂ نظر سے قریب قریب برعکس ہے۔ انہوں نے اسلام کے مروجہ تصورات کو دیکھ کر یہ کہا ہے کہ اسلامی تعلیمات کو سیاسی یا معاشی قالبوں میں ڈھالنے سے ہمارے ہاں کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ لیکن کیا ان کی یہ رائے آپ سے قریب نہیں کہ یہ فضا اسلام کے بارے میں مروجہ تصورات کی بنا پر ہے۔

پرویز: میں نے اس انٹرویو کی روئیداد "نصرت" میں دیکھی ہے۔ اسے پڑھ کر مجھے افسوس ہوا اور یہ اس لئے کہ میرے دل میں منظور قادر صاحب کی قانونی قابلیت کی بڑی قدر ہے۔ وہ ایک بلند پایۂ وکیل ہیں اور مملکتِ پاکستان میں وزیرِ خارجہ بھی رہ چکے ہیں۔ نیز مغربی پاکستان کی عدلیہ کے چیف جج بھی۔ ایک وکیل اور جج کی حیثیت سے مقدمات میں ان کے سامنے ہر قسم کا رطب و یابس پیش ہوتا ہے، جھوٹے دعوے دائر کئے جاتے ہیں، جھوٹی شہادتیں پیش کی جاتی ہیں، جعلی دستاویزات تیار کی جاتی ہیں اور انہیں اصل اور سچی کہہ کر پیش کیا جاتا ہے۔ منظور قادر صاحب کا منصب یہ ہے کہ وہ غلط کو صحیح اور جعلی کو اصلی سے الگ کریں اور پھر پیشِ نظر مقدّمے کے متعلق کسی نتیجے پر پہنچیں۔ مجھے افسوس اس بات سے ہوا کہ چھوٹے چھوٹے مقدّمات تک میں تو وہ اس طریق کار کو اختیار کرتے ہیں لیکن جب ان کے سامنے "اسلام کا مقدّمہ" پیش ہوا، تو انہوں نے اس کا ذرا بھی خیال نہ کیا اور جو باتیں اسلام کی طرف منسوب کر کے ان کے سامنے پیش کی گئیں، اسے انہوں نے عین اسلام قرار دے دیا اور پھر اس کے خلاف ڈگری صادر کر دی۔ انہوں نے خدا، رسول، وحی، عبادت، گناہ، ثواب، توبہ

صدقہ وغیرہ کے خلاف اپنے اعتراضات کی بنیاد ان باتوں پر رکھی جو، معاف فرمائیے، ہمارے ہاں داستان سرا واعظوں اور قصّہ گو خطیبوں کے یہاں یا پکی ردی جیسی کتابوں میں ملتی ہیں۔

حنیف: پرویز صاحب! کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہمارے معاشرے کے بیشتر افراد اسی اسلام سے واقف ہیں جو پکی ردی اور واعظوں کے خطبوں سے مرکب ہے۔ اس لحاظ سے اگر منظور قادر صاحب نے کہا ہے کہ اسلام کی مروجہ شکلیں اس لائق نہیں کہ ان سے وہ نتائج پیدا ہو سکیں جن کی ہمیں آرزو ہے تو کیا وہ حق بجانب نہیں؟ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ منظور قادر صاحب خود بھی اکثر مروجہ عقاید سے مطمئن نظر نہیں آتے۔

پرویز: اگر منظور قادر صاحب یہ فرما دیتے کہ ان کے اعتراضات ان عقائد، تصوّرات اور رسومات کے خلاف ہیں جنہیں آجکل اسلام کے نام سے موسوم کر کے پیش کیا جاتا ہے تو ان کی تنقید حق بجانب ہی نہیں بلکہ میرے خیال میں کچھ نرم سی تصوّر کی جاتی۔ لیکن نہ صرف یہ کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ ——— بالارادہ یا بلا ارادہ، وہ حقیقی اسلام کے بعض بنیادی تصوّرات تک کو بھی اپنی تنقید کی زد میں لے آئے ہیں اور اس تنقید کی بنیاد وہ عقاید و تصورات ہیں جو ہمارے ہاں بلا سند و تحقیق متوارث چلے آ رہے ہیں۔ مثلاً قرآن کریم کے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ نبی اکرمؐ کی تیئس سالہ زندگی میں جو جو واقعات سامنے آئے قرآن نے ان کے متعلق ہدایات دی ہے۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ یہ ظاہر ہے کہ اس تیئس سال کے عرصے میں محدود واقعات ہی سامنے آ سکتے تھے، سب کے سب نہیں۔ نیز نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد واقعات کا سلسلہ ختم نہیں ہو گیا بہر نئے دن نت نئے واقعات کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قرآن میں دی ہوئی راہنمائی اُس زمانے کے لئے تو کافی ہو سکتی تھی، لیکن یہ نہ تو ابدی ہو سکتی ہے اور نہ ہی ایسی مکمل کہ گزشتہ موجودہ اور آنے والے تمام واقعات و حوادث کو محیط ہو سکے۔ یہ تصور قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے اور (جیسا کہ انہوں نے بیان کیا ہے) مبنی ہے "شانِ نزول" کے نظریئے پر۔ لیکن اگر موصوف "مروجہ اسلام" سے قطع نظر کر کے خود قرآنِ کریم پر غور فرما لیتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ "شانِ نزول" کا نظریہ خود قرآنی تعلیم سے خلاف اور بعد کا وضع کردہ ہے۔ قرآن کریم اس کی بار بار تصریح کرتا ہے کہ یہ وہی دین ہے جسے خدا نے نوحؑ کو دیا، ابراہیمؑ کو دیا، موسیٰؑ کو دیا، عیسیٰؑ کو دیا، تمام سابقہ انبیاء (علیہم السلام) کو دیا۔ سو جو دین روزِ اوّل سے چلا آ رہا تھا اُس کے متعلق یہ کہنا دین کی حقیقت سے بے گانگی کی دلیل ہے کہ وہ مجموعہ ہے ان ہدایات کا جو ان واقعات کے پیشِ نظر دی گئیں جو رسول اللہؐ کی زندگی میں اور اس معاشرے میں پیش آئے اور بس۔ اور پھر جس دین کے

متعلق قرآن میں یہ کہہ دیا گیا ہو کہ وہ تمام نوعِ انسان کے لئے مکمل ضابطۂ حیات ہے اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد رونما ہونے والے واقعات کو محیط نہیں ہو سکتا، قرآن کے اس دعوے کے خلاف ہے۔

قرآن کریم میں دی ہوئی ہدایات کے متعلق منظور قادر صاحب کا یہ ارشاد کہ وہ (TRAIL AND ERROR) کے تجرباتی طریق کا نتیجہ نہیں، وحی کے تصور کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتا ہے (TRIAL AND ERROR) عقلِ انسانی کا طریق ہے جو مستقبل کا علم نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس وحی ہے جو عقلِ انسانی کی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ وہ اس خدا کی طرف سے ملتی ہے جس کا علم صدود فراموش ہے۔ لہٰذا اسے عقل کا تجرباتی طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ منظور قادر صاحب کے اس دعوےٰ کی بنیاد ناسخ و منسوخ کا عقیدہ ہے۔ لیکن یہ طریقہ خود قرآن کی تعلیم کے خلاف اور بعد کا وضع کردہ ہے۔ اس کے لئے بطورِ مثال انہوں نے شراب کی ممانعت سے متعلق قرآنی احکام پیش کر کے فرمایا کہ دیکھئے! یہ احکام کس طرح بتدریج آئے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ (TRIAL AND ERROR) کا نتیجہ ہیں اس وقت اتنی فرصت نہیں کہ میں شانِ نزول یا ناسخ و منسوخ جیسے نظریات پر تفصیلی بحث کروں، نہ ہی اس کا تعلق آپ کے سوال سے ہے۔ البتہ ممانعتِ خمر سے متعلق احکام والی مثال کے سلسلے میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ تدریجی احکام (TRIAL AND ERROR) کے استقرائی طریق کا نتیجہ نہیں تھے، اس سے دراصل یہ بتانا مقصود تھا کہ افراد میں جو برائیاں اس طرح زمین گیر ہو چکی ہوں کہ ان کا ایک دم استیصال طبعی طور پر ناممکن ہو، ان کی اصلاح بتدریج کرنا چاہیئے۔ شراب جس شخص کی گھٹی میں پڑ چکی ہو، اس کے لئے اس کا یک لخت چھوڑ دینا ناممکن نہیں تو بیحد مشکل ضرور ہے۔ اس کی یہ عادت بتدریج چھڑانی چاہیئے۔ یہ تھی مصلحت اس قسم کے احکام کو بتدریج نافذ کرنے کی۔ چنانچہ اگر ہمیں آج بھی اپنے معاشرے میں شراب کو بند کرنا ہو تو اس کے لئے قرآن کریم کا تجویز کردہ تدریجی طریق ہی اختیار کرنا ہوگا۔

حنیف۔ پرویز صاحب، مہربانی سے ذرا دو ایک مثالوں سے واضح کریں کہ قرآن حکیم اپنے اصولوں کو قائم رکھتے ہوئے بدلتے ہوئے زمانے اور اس کے ساتھ بدلتے ہوئے سیاسی، معاشرتی اور معاشی تقاضوں سے کیونکر عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔

پرویز۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے قرآن کریم کے ابدی اصول اس چار دیواری (BOUNDARY LINES) کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے ہم ہر زمانے میں عملی پروگرام خود وضع کر سکتے ہیں۔ مثلاً اس کا غیر متبدل اصول یہ ہے کہ (وامرھم شوریٰ بینھم) اُمتِ مسلمہ کے معاملات

باہمی مشاورت سے طے ہوں گے"۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ اصولی حکم بھی دے دیا کہ: ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الکافرون۔ ۵/۴۴ "جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، وہ مومن نہیں کافر ہیں"۔ ان اصولی ہدایات کے مطابق ہمارا طریق کار یہ ہوگا کہ جو معاملہ ہمارے سامنے آئے، ہم دیکھیں کہ قرآن کریم اس باب میں کیا رہنمائی دیتا ہے۔ اس رہنمائی کو سامنے رکھتے ہوئے باہمی مشورے سے یہ طے کیا جائے کہ اس معاملہ کے متعلق ہمیں کیا فیصلہ کرنا چاہیئے۔ اس باہمی مشورے کا طریق عمل کیا ہوگا، یہ حالات کے ساتھ بدلتا جائے گا۔۔۔ رسول اللہ اور صحابہؓ کے زمانے میں جب وسائل رسل و رسائل محدود تھے، اور طریق تھا۔ آج اس کا طریق اور ہوگا۔ مشاورتی نظام کا اصول غیر متبدل رہے گا۔ البتہ اس نظام کی عملی شکل حسبِ ضرورت بدلتی جائے گی۔ یا مثلاً قرآنِ کریم کی اصولی راہ نمائی یہ ہے کہ تمام افراد اور ان کی اولاد کی، بنیادی ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی نظامِ معاشرہ کے ذمے ہوگی۔ (نحن نرزقکم و ایاھم) ۶/۱۵۲ اب یہ کام نظامِ معاشرہ کا ہوگا کہ وہ فیصلہ کرے کہ معاشی نظام کی ہیئت کیا ہو جس کی رُو سے کوئی فردِ معاشرہ اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی اور سامانِ نشوونما سے محروم نہ رہے۔ اس نظام کی شکلیں حسبِ ضرورت بدلتی جائیں گی، لیکن یہ اصولی مقصد اپنی جگہ قائم رہے گا۔

حنیف: شراب کی حرمت پر بات کرتے ہوئے آپ نے بعض معاشرتی برائیوں کو ختم کرنے کے لئے قرآن کے تدریجی طریق کار کا ذکر کیا ہے۔ میں ایک ضمنی سوال کا موقع نہیں کھونا چاہتا، قرآن کریم میں معاشرتی جرائم کے سلئے سزائیں بھی بیان ہوئی ہیں۔ مثلاً چوری کے سلسلے میں ہاتھ کاٹنے کی سزا کا ذکر آیا ہے۔ میرے خیال میں یہ چوری کی انتہائی سزا ہے نہ کہ ابتدائی۔ کیا حرمتِ شراب کی طرح سزاؤں کے سلسلے میں بھی منزل بہ منزل چلنے کا حکم نہیں۔ اور کیا منزل بہ منزل چلنا اس لئے ضروری نہیں کہ جرائم کا معاشرتی نظام کے حالات سے اٹوٹ تعلق ہے۔ یہ تو دھاندلی ہوگی کہ معاشرتی حالات تو بے شک غیر اسلامی ہوں اور سزائیں اسلامی دینی شروع کر دی جائیں۔

پرویز: آپ نے صحیح سمجھا ہے کہ قرآنِ کریم نے جرائم کی جو سزائیں مقرر کی ہیں وہ انتہائی ہیں لیکن اس سے کم تر یا تدریجی سزائیں اس نے خود متعین نہیں کیں اسے اس نے حالات کے مطابق نظامِ معاشرہ کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ واضح ہے کہ سزا تجویز کرتے وقت متعدد حالات و کوائف کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً معاشرے کی عام اخلاقی سطح، معاشی حالات کے تقاضے، خود ملزم (یا مجرم) کی نفسیاتی کیفیت، اس کی تعلیم و تربیت اور ماحول و عواطف کے اثرات وغیرہ، ان تمام حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سزا کا فیصلہ کیا جائے

گا آپ نے غور فرمایا ہوگا کہ قرآن کریم نے لونڈیوں کے لئے زنا کی سزا آزاد عورتوں سے نصف مقرّر کی ہے اور اضطراری حالت میں ان چیزوں کے کھا لینے کی بھی اجازت ہے جو عام حالات میں حرام قرار دی گئی ہیں۔ یہ وہ اصول تھا جس کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ نے ان غلاموں کو کوئی سزا نہیں دی تھی جنہوں نے بھوک سے مجبور ہو کر خوراک کی چوری کی تھی، بلکہ سزا ان کے مالکوں کو دی تھی کہ ان کے جرم کے ذمہ دار تم ہو۔ اگر تم انہیں پیٹ بھر کر کھانے کو دیتے تو یہ کیوں چوری کرنے پر مجبور ہوتے! لہٰذا غیر اسلامی معاشرے میں اسلامی سزائیں اَنمل بے جوڑ سی بات ہے۔ اسلام کے اصول و احکام، موکدات و تنبیہات، اوامر و نواہی، فرائض و واجبات، حقوق اور ذمہ داریاں اسلامی نظامِ معاشرہ کے مختلف پُرزے ہیں۔ یہ اسلامی نظام کے اندر اپنی اپنی جگہ ٹھیک ٹھیک نتائج مرتب کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن اگر وہ نظام نہ ہو تو ان کی کیفیت ایک مشینری کے بکھرے ہوئے پرزوں کی سی ہوتی ہے۔ اسی لئے تو قرآن نے کہا ہے کہ (اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۲:۲۰۸) ”تم اس نظامِ خداوندی میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ“ اور اس کے برعکس سختی سے کہا ہے کہ ”کیا تم ایسی روش اختیار کرنا چاہتے ہو کہ کتاب کے ایک حصّے پر ایمان رکھو اور دوسرے حصّے سے انکار کر دو۔ اگر ایسا کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ نہیں کہ جتنے حصے پر ایمان رکھو اس کے خوشگوار نتائج تمہیں مل جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں اس دنیا میں ذلّت و خواری نصیب ہوگی اور آخرت میں عذابِ شدید“　　(البقرہ: ۸۵)

لیکن یہ ٹھیک ہے کہ جب ہم اپنی موجودہ سطح سے ابتدا کریں گے تو اس معاشرے کے انتہائی نقطے تک بتدریج پہنچیں گے۔ اسی نسبت سے ہمیں جرائم اور ان کی سزاؤں کا جائزہ بھی لینا ہوگا۔ سزا تو ایک طرف حضرت عمرؓ نے ایک ذمی کا ٹیکس یہ کہہ کر واپس کر دیا تھا کہ تم ابھی حال ہی میں اس حکومت کے زیرِ حفاظت آئے ہو اس نے تمہارے لئے کیا کیا ہے جو تم اس کا ٹیکس ادا کرنے کے لئے آ گئے ہو!

باقی رہا دین اور سیاست کا اٹوٹ رشتہ، سو اس کے متعلق بھی ہمارے یہ معترضین ایک غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اس تعلق کی وضاحت ایک مثال سے سمجھئے۔ قرآن کریم میں ایک اصولی حکم دیا گیا ہے کہ (لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓي اَلَّا تَعْدِلُوْا ۵:۸) ”کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو“۔ یہ ہمارا دین ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی حالت میں اور کسی قوم کے سلسلے میں بھی اس سے انحراف نہیں کر سکتے۔ ہم میں سے اگر کوئی کسی وقت اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ خدا کی بارگاہ میں مجرم قرار پاتا ہے۔ اور اگر (معاذ اللہ) یہ کہہ دیتا ہے کہ میں اس اصول کو نہیں مانتا تو وہ مسلمان ہی نہیں رہتا۔ یہ ہے وہ دین جسے سیاست

سے الگ کر دیا جائے" تو رہ جاتی ہے چنگیزی"۔ اس کے برعکس، وہ سیاست ہے جس میں ہر معاملے کا فیصلہ "مصلحت" پر مبنی ہوتا ہے۔ اس سیاست کے نہ کوئی غیر متبدل اصول ہوتے ہیں نہ اٹل ضوابط۔ مصلحت کے مطابق اصول و ضوابط مرتب ہوتے ہیں اور مصلحت ہی کے مطابق ان میں ردّ و بدل کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ سیاست ہے جس سے دنیا اس قدر مادّی ترقّی کے باوجود جہنّم بن رہی ہے۔

حنیف:۔ جب ہم عمل کے میدان میں دین اور سیاست کے رشتے کی کڑیاں تلاش کرتے ہیں تو اسلام اور جمہوریت کے باہمی تعلق کو زیر بحث لانا لازم ہو جاتا ہے۔ جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہر اچھائی کا حامل اسلام جمہوریت کی خوبیوں سے بھی متصف ہے ۔۔ اسلام کے دامن میں جمہوریت کی خوبی باہمی مشورے کے حکم کی صورت میں موجود ہے۔ لیکن جہاں تک جمہوریت کے مروجہ نظام کا تعلق ہے، سیاسی جماعتوں کے بغیر اس کا تصور بھی لوگوں کے لئے محال ہے اور ادھر اسلام ہے کہ وہ کسی قسم کے تفرقے یا پارٹی بازی کا متحمل نہیں۔ اس صورت میں آپ کے نزدیک، ہمارے دین اور ہماری سیاست کے درمیان کون سا مقامِ اتصال ہے جہاں جمہوریت سے وابستگی کا شوق بھی پورا ہو سکے اور وہ راہ بھی ہم سے نہ چھوٹے جو خدا نے سورۂ المائدہ میں اسلام کے نام سے ہمارے لئے چنی تھی۔

پرویز:۔ حنیف صاحب! جس طرح اسلام ایک اصطلاح ہے، اسی طرح موجودہ سیاست میں جمہوریت بھی ایک اصطلاح ہے۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ ان مباحث کے متعلق صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم یہ متعیّن طور پر معلوم کر لیں کہ قرآن کریم کی رُو سے "اسلام" کا مفہوم کیا ہے۔ جب یہ متعیّن ہو جائے تو اس کے بعد یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ "جمہوریت" کی اصطلاح کا مفہوم کیا ہے۔ اس کے بعد ہی ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ پیشِ نظر سوال پر غور کیا جا سکے۔

حنیف:۔ پرویز صاحب! آپ نے میرے پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ اسلام کی اصطلاح بہت مبہم ہو چکی ہے اور اس کا آپ کے نزدیک یہ حل ہے کہ ہم قرآنِ حکیم کو اپنے لئے حکم سمجھیں، اس سے ہمیں ایک نقطہ یا مرکز مل جائے گا جس پر حُسنِ اتفاق سے سب کا ایمان ہے اور جس پر تاریخ نے کوئی تحریفی اثر نہیں ڈالا لیکن باوجود اس خواہش کے کہ میں اس مقام پر آپ کو کسی اختلافی بحث میں نہیں الجھانا چاہتا، مجھے یہ کہنا ہے کہ کیا نبیؐ کریمؐ کی زندگی جسے خود قرآن کریم نے ہمارے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے اور ایک حد تک ہمارے لئے اپنے اوراق میں محفوظ بھی کر دیا ہے، قرآن حکیم کے ساتھ ساتھ اسلام کی اصطلاح پر روشنی نہیں

ڈالتی؟ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ نبیٔ اکرمؐ کی زندگی کے بارے میں بھی اگر ہمیں قرآن ہی سے روشنی مل جاتی ہے تو پھر حَکَم تو قرآن ہی ٹھہرا۔ لیکن کیا ایک جیتا جاگتا رسول، ایک عبد اور بشر، ایک سربراہِ مملکت، ایک سپہ سالار، وحی کا حامل، وحی کا مبلغ اور وحی کا نافذ کرنے والا ایک نبیٔ اسلام کا ایک بنیادی ستون نہیں؟ اور کیا قرآنِ حکیم اور نبیٔ اکرمؐ مل کر اسلام کے تصور کو واضح نہیں کر دیتے؟

پرویز:۔ قرآن کریم کی رُو سے رسول کا فریضہ محض ایک ایلچی یا ڈاکیہ کا نہیں ہوتا کہ خدا کا پیغام انسانوں تک پہنچا دیا اور بس۔ اس کے ساتھ اس کا فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ ان اصولوں پر عمل کر کے ان سے ایک معاشرہ متشکّل کرے اور یوں دنیا کو دکھا دے کہ یہ اصول ناممکن العمل نہیں۔ قرآن کریم نے اسی لئے نبیٔ کریم کی حیاتِ طیبہ کا اہم ترین حصہ اپنے دامن میں ابدی طور پر محفوظ کر دیا تاکہ آنے والے انسانوں کو یہ معلوم ہو کہ ان اصولوں پر عمل بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حضورؐ نے قرآن کریم کے الفاظ میں اپنے بشر ہونے کو نمایاں طور پر بیان کیا جس سے مقصد اس حقیقت کو واضح کرنا تھا کہ حضورؐ یہ کچھ ایک نبی کی حیثیت سے نہیں کر رہے تھے، اس لئے کہ یہ کچھ اگر ایک نبی ہی کر سکتا تھا تو پھر حضورؐ کی سیرت نوعِ انسان کے لئے اسوۂ حسنہ قرار نہیں پا سکتی تھی۔

پھر قرآن کریم نے خود نبیٔ اکرمؐ کو یہ حکم دیا تھا کہ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ [۳/۱۵۹] معاملات میں اپنی اُمت کے افراد کے ساتھ مشورہ کیا کرو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جماعتِ مومنین کے یہ افراد انسان ہی تھے، فوق البشر نہیں تھے لہٰذا، قرآن کریم کے پیش کردہ نقشے کے مطابق اسلام کا جو نظام مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِينَ مَعَهٗ نے قائم کر کے دکھایا وہ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے والے افراد کا کارنامہ تھا۔ اور یہی چیز ہمارے لئے نمونہ بنتی ہے؛ بنابریں اسلامی معاشرے کی تشکیل میں اس اسوۂ حسنہ کو نظر انداز کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ اس کا تو خود قرآن نے حکم دیا ہے کہ قرآن کریم میں اسلام کا تصوّر مکمل طور پر موجود ہے لیکن حروف کی شکل میں۔ اس تصوّر کو عملی شکل میں، سب سے پہلے نبیٔ اکرمؐ اور جماعتِ مومنین نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یہ تصوّر، اپنی جگہ مکمل، واضح اور غیر متبدل ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی یا اضافہ نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس پر عمل اپنے اپنے زمانے میں ہوتا چلا جائے گا۔ اسی کو خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کہتے ہیں جو آج بھی قائم ہو سکتی ہے۔

اب میں آپ کے اصلی سوال کی طرف آتا ہوں۔ ہم نے یہ دیکھ لیا کہ اسلام سے مفہوم ہے زندگی کا وہ عملی نظام جو قرآن کریم میں دیے ہوئے نقشے کے مطابق متشکّل ہو۔ اب لیجئے "جمہوریت" کو۔ میں نے اکثر دیکھا ہے

کہ جو لوگ اس اصطلاح کو اس شدّ ومدّ سے استعمال کرتے ہیں ان کے پیشِ نظر جمہوریّت نہیں، بلکہ جمہوریّت کی مشینری ہوتی ہے۔ جمہوریّت کی مغربی اصطلاح سے مفہوم یہ ہے کہ

قانون سازی کا مطلق حق قوم کو حاصل ہے

اور اس کی مشینری سے مراد ہے وہ طریقِ کار جس کے مطابق قوم اپنا یہ حق استعمال کرتی ہے۔ مثلاً طریقِ انتخاب پارلیمانی یا صدارتی نظام، حزبِ موافق ومخالف کا وجود، وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک مغربی جمہوریّت کے مندرجہ بالا اصول کا تعلق ہے یہ اسلام کے اصولِ حکمرانی کے یکسر خلاف ہے۔ اسلام میں قانون سازی کا مطلق حق کسی کو بھی حاصل نہیں۔ نہ سلطان کو، نہ کسی ڈکٹیٹر کو، نہ قوم کو، نہ اس کے نمایندگان کو، نہ پارلیمان کو، نہ صدر مملکت کو۔ یہ حق ان غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے استعمال کیا جاسکتا ہے جو قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں اور جن میں ردّ وبدل کا اختیار کسی کو بھی حاصل نہیں۔ جو قانون ان اصولوں سے ٹکرائے گا، وہ قوم کے نمایندگان کی کثرتِ آراء سے تو ایک طرف، اگر ساری قوم کے اتفاقِ رائے سے بھی مرتّب ہوگا، تو بھی اسلامی نظام میں مردود قرار پائے گا۔

اب رہا جمہوری مشینری کا سوال، سو اس کی جزئیات میں سے جو شق قرآنی تعلیم سے متصادم نہیں ہوگی اسے اختیار کیا جاسکے گا، جو اس کے خلاف ہوگی اسے مسترد کر دیا جائے۔ قرآنِ کریم کی واضح تعلیم کی رُو سے "مذہبی فرقوں کا وجود شرک (الروم، ۳۱) ہے، اور سیاسی پارٹیوں کا وجود سیاستِ فرعونی کی ایجاد (القصص، ۴)۔ لہٰذا امّت کی مجلسِ مشاورت میں حزبِ اقتدار اور حزبِ مخالف کا وجود قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ اُمّتِ مسلمہ غیر مسلموں کے مقابلے میں خود ایک پارٹی ہے جسے قرآن نے حزب اللہ کہہ کر پکارا ہے اور اس کے مخالف گروہ کو حزب الشیطان۔ قرآنِ کریم میں انہی دو گروہوں کا ذکر ہے۔

امّت اپنے منتخب افراد پر مشتمل مجلسِ مشاورت (پارلیمان) مرتّب کرے گی تاکہ وہ سوچیں اور فیصلہ کریں کہ قرآنِ کریم کے قوانین کو عملاً کس طرح نافذ کیا جائے۔ یہ ان تمام افراد کا مشترکہ مقصدِ زندگی ہوگا اس لئے اس میں پارٹیوں کا سوال کیا؟ پیش آمدہ معاملے کے متعلق ہر شخص اپنی اپنی رائے پیش کرے گا۔ ان آراء میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ اس اختلاف کے معنی ہیں معاملے کے مختلف گوشوں کا سامنے آنا تاکہ فیصلے تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ اس کے بعد جو فیصلہ ہوگا اس کی عملی تنفیذ اس پوری جماعت کا متّحدہ فریضہ ہوگا۔ اس نظام میں نہ کسی پارٹی کو اقتدار حاصل ہوتا ہے، نہ ان کے سامنے مختلف اصول ہو سکتے ہیں جن کی بناء پر جماعت مختلف پارٹیوں میں بٹ جائے۔

اقتدار قرآن کا اور اس کی عملی تشکیل کی ذمہ دار پوری کی پوری جماعتِ مومنین، یہ ہے" اسلامی نظامِ جمہوریّت"۔

حنیف:۔ پرویز صاحب! قرآن میں قومی مسائل کے ضمن میں باہمی مشورے کا حکم دیا گیا ہے جمہوریّت کا نظام بھی اس مشورے کی ایک کوشش ہے۔ جو لوگ مرّوجہ جمہوریّت کو اسلام کی رُو سے جائز قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں، وہ اس کے لئے اسی مشورے والے خدائی حکم سے تائید لاتے ہیں۔ آپ نے اس ملک میں رائج رہنے والی پارلیمانی جمہوریّت کی کارفرمائیاں بھی دیکھی ہیں اور جمہوریّت کے ایک نئے تجربے بنیادی جمہوریّت کا مطالعہ بھی کیا ہوگا۔ کیا اس نئے تجربے میں آپ کو یہ گنجائش نظر نہیں آتی کہ اس ذریعے سے ہم پارٹیوں سے ہٹ کر مشورے کے حکم پر عمل کرنے کے قابل ہو سکتے تھے۔ اس سوال کا دوسرا حصّہ یہ ہے کہ کیا سیاسی فضا کی موجودہ دھندلاہٹ اس بات کا نتیجہ نہیں کہ ایک طرف تو ہم بنیادی جمہوریت کے بلاپارٹی نظام سے کام لینا چاہتے ہیں اور دوسری طرف ہم نے سیاسی جماعتوں کو بھی کھُل کھیلنے کا موقع دے رکھا ہے جو موجودہ جمہوریّت کی بنیادی کل ہے۔

پرویز: جب میں نے ۱۹۶۲ء کے دستور میں دیکھا کہ امت میں سیاسی پارٹیوں، یا مذہبی فرقہ بندیوں کی گنجائش نہیں رکھی گئی تو میں نے قرآن کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اسے خدا کی رحمت سمجھا۔ اس لئے کہ میرے نزدیک قرونِ اولیٰ کے بعد مسلمانوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک قدم قرآن کی متعیّن کردہ منزل کی طرف اٹھا تھا پارٹیوں کو ختم کر کے بنیادی جمہوریت کا نظام، درحقیقت "مشاورت" کی ایک تنظیمی شکل تھی جس میں سب سے نیچے سے شروع ہو کر درجہ بدرجہ اوپر تک اُٹھتے چلے جاتے تھے۔ یہ طریق مفید ہو سکتا تھا، لیکن شاید ہمارے جرائم کی سزا کی مدت ابھی تک ختم نہ ہوئی تھی۔ اس لئے تھوڑے ہی عرصے کے بعد پھر سے دستور میں سیاسی پارٹیوں اور مذہبی فرقہ بندیوں کی گنجائش رکھ دی گئی۔ میں نے ابھی ابھی آپ کے سامنے قرآن کریم کی وہ آیۂ جلیلہ پیش کی ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ اگر تم اس کتاب کے ایک حصّے کو صحیح مانتے ہو اور دوسرے سے انکار کرتے ہو تو یاد رکھو کہ اس کا نتیجہ یہ نہیں ہوگا کہ جس حصّے کو تم نے صحیح مانا ہے اس کے خوشگوار نتائج حاصل ہو جائیں گے، بالکل نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلت و خواری نصیب ہوگی اور آخرت کی زندگی میں بھی عذاب ہی ملے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی جمہوریّت کی تنظیم کے جو اچھے نتائج متوقع ہو سکتے تھے وہ "پارٹی ساز جمہوریت" کی گرد میں گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ میں نے اس باب میں حنیف صاحب! کئی مرتبہ کہا ہے کہ ہمیں ایک مرتبہ بیٹھ کر فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ اگر ہم یہاں اسلامی نظام کا قیام چاہتے ہیں، یعنی وہ نظام جس کے لئے پاکستان مانگا گیا تھا اور حاصل کیا گیا

تھا ــــ تو ہمیں اسی نظام کو خالصتہً نافذ کرنا ہوگا لیکن اگر ہم اپنے میں اس کی ہمت نہیں پاتے تو پھر ہمیں کھلے بندوں مغرب کا سیکولر نظام قبول کر لینا چاہیئے تاکہ معاملہ یکسو تو ہو۔ یہ گومگو کی زندگی ــــ یہ منکرِ مے بودن و ہمرنگ مستاں زیستن کا انداز ــــ تو عذابِ الیم ہے۔ قرآن کریم نے جہاں یہ کہا ہے کہ اسلامی طرزِ زندگی بڑے حسین نتائج پیدا کرتی ہے، وہاں اس نے یہ بھی کہا ہے کہ خالص کفر بھی کچھ نہ کچھ اپنے نتائج پیدا کرتا ہے، اگرچہ وہ نتائج بڑے ناپائیدار ہوتے ہیں اور ان کا مستقبل بڑا تاریک ہوتا ہے لیکن منافقت کو جس میں نہ تو اسلام کو دل سے قبول کیا جائے اور نہ کفر کو علانیہ اختیار کرنے کی ہمت ہو، اس نے بدترین طرزِ زندگی قرار دیا ہے۔ اسی لئے اس نے کہا ہے کہ جہنم کے سب سے نچلے درجہ میں کافر نہیں بلکہ منافق ہوں گے۔

میں اتنا واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت جس غیر اسلامی معاشرے کے اندر ہم زندگی بسر کر رہے ہیں، وہاں سے اسلامی معاشرے کے نصب العین تک ہم تدریجاً ہی جا سکتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس نصب العین کو واضح طور پر معین کر کے اسے مملکتِ پاکستان کی بنیاد قرار دیں اور اس کے بعد ایسا طریق کار اختیار کریں جس سے ہم رفتہ رفتہ اس نصب العین تک جا پہنچیں۔ یہ ہے میرے نزدیک فلاح کی راہ۔

حنیف: نارتھروپ نے اپنی تازہ کتاب "فلسفیانہ انسانیت اور سیاستِ حاضرہ" میں کلکھون اور سارد کن کی تحقیقات کی روشنی میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ مختلف اقوام کے قوانین اور عمل کے قالب ان کے فلسفۂ حیات سے پھوٹتے ہیں، خواہ وہ شعوری طور پر اس فلسفے سے واقف ہوں یا نہ ہوں۔ ہر قوم زندگی کے تجربات کو تصورات میں ڈھالتی ہے اور یہی تصورات اس کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی اداروں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ہمارے لئے قرآنِ عظیم کی صورت میں کائنات، انسان اور ملتِ اسلامیہ کے بارے میں واضح تصورات موجود تھے۔ لیکن جب ہم اپنے سیاسی، معاشرتی اور معاشی قالبوں کو دیکھتے ہیں تو یا قرآن کی تعلیم پر شک گزرتا ہے یا یہ خیال آتا ہے کہ ہم قرآن کو سمجھتے ہی نہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بعض لوگ بڑے خلوص کے ساتھ یہ احساس رکھتے ہیں کہ اسلام کی مروجہ تعلیم اور اس کے تحت قائم ہونے والا تصور ذاتِ باری، تصورِ علم تصورِ انصاف ہمارے کسی کام نہیں آسکتا۔ اس سے جو حالتیں ابھر سکتی ہیں ، وہ ابھر چکی ہیں اور اگر ہمیں بہتر نتائج کی توقع ہے تو ہمیں اسلام کی تعلیم کے بارے میں اپنے تصورات پر نظر ڈالنی ہوگی کہ وہ کس حد تک صحیح بنیادوں پر استوار ہے؟

مجھے آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ اگر ہم نے قرآن کی تعلیم کو سمجھنے میں کوتاہی کی ہے تو کیا کوئی ایسا راستہ

نہیں جس پر چلتے ہوئے ہم اس منزل تک پہنچ جائیں جہاں ہمارے بنیادی تصورات کا سرچشمہ قرآن قرار پائے اور کیا یہ راستہ لازمی طور پر ان پتھروں سے پٹا ہوا نہیں جو ہم گالیوں اور کفر کے فتووں کی صورت میں ہر مصلح دین پر اٹھاتے رہے ہیں ـــــ یہاں تک کہ ہم نے یہاں سرسیدؒ اور اقبالؒ کو بھی اسی انعام سے نوازا۔

پرویز: یہ درست ہے کہ بنیادی تصورات ہی وہ سرچشمہ ہیں جس سے کسی قوم کا تمدن اور کلچر جنم لیتا ہے۔ دین ایسے تصورات عطا کرتا ہے جن سے ایک انسانیت ساز معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ قرآن کریم نے ایسے ہی تصورات دیئے تھے۔ لیکن دین کے تصورات مفاد پرست گروہوں کے لئے پیغام مرگ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ یہ تصورات مٹا دیئے جائیں۔ اس کے لئے ایک بڑی گہری سازش وجود میں آتی ہے اور مذہبی پیشوائیت آگے بڑھتی ہے۔ جب فرعون دیکھتا ہے کہ صاحب ضرب کلیم کا حریف نہیں ہوسکتا تو وہ ہامان کو مدد کے لئے بلاتا ہے۔ مذہبی پیشوائیت کرتی یہ ہے کہ بنیادی تصورات کے الفاظ کو اسی طرح رہنے دیتی ہے لیکن ان کا مفہوم یکسر بدل دیتی ہے۔ اس سے وہ تصورات اصل دین کی ممی شدہ لاشیں بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ان سے ملتے جلتے کچھ اور الفاظ تراشتی ہے اور ان پر تقدس کا غلاف چڑھا کر انہیں بھی خدائی تصورات کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ عوام سمجھتے ہیں کہ ہم ان تصورات کے حامل ہیں جو دین نے عطا کئے تھے لیکن "درحقیقت" وہ ان تصورات کی قبروں کے مجاور بن کر رہ جاتے ہیں، دیگر مذاہب کی طرح اسلام کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا ہماری پوزیشن اس لحاظ سے ان سے مختلف ہے کہ ہمارے پاس وہ کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود ہے جس نے ان تصورات کو پیش بھی کیا تھا اور ان کا مفہوم بھی خود ہی معین کر دیا تھا۔ ہمارے لئے کرنے کا کام اتنا ہے کہ ہم ان تصورات کا مفہوم قرآن کریم سے معین کر لیں اور ان کے غیر قرآنی مفہوم کو جھٹک کر الگ کر دیں۔ اس سے دین کے اصل تصورات ہمیں پھر سے وہ توانائی عطا کر دیں گے جو نہ صرف ہمیں خوشگواریوں اور سرفرازیوں سے ہمکنار کر دے گی بلکہ دنیا میں ایک عالمگیر انسانیت نواز انقلاب پیدا کر دے گی۔

لیکن اس میں دشواری یہ ہے کہ مفاد پرست گروہ چاہتے ہی نہیں کہ ایسا ہو۔ اس لئے وہ مذہب پرستی کے لبادے میں ہر ایسی کوشش سے ٹکرا جاتے ہیں اور جو شخص ایسا کرنے کا ارادہ کرتا ہے اسے اپنے کفر کے فتووں سے نوازتے ہیں۔

جو لوگ اسلامی تصورات کو ایک چلا ہوا کارتوس قرار دیتے ہیں ان کے سامنے اسلامی تصورات نہیں بلکہ

مفاد پرست گروہوں کے تراشیدہ تصوّرات ہوتے ہیں جن پر اسلامی ٹھپّا لگا دیا گیا ہے۔ اگر ان کے سامنے دین کے اصلی تصوّرات اور ان کا صحیح مفہوم آجائے تو وہ دیکھیں گے کہ یہ تصوّرات کس قسم کا حیات بخش نظام پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلام کے سب سے بنیادی تصوّر لآ اِلٰہ اِلاّ اللہ کو لیجئے۔ اس کا قرآنی مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں کوئی قانون ایسا نہیں جس کے سامنے انسان اپنا سر جھکائے، کوئی ایسی ہستی نہیں جس کی محکومی اختیار کی جائے۔ اسے صرف قانونِ خداوندی کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ یہ تصوّر جس قدر عظیم انقلاب کی بنیاد ہوسکتا ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جب ''الٰہ'' کے معنی پرستیدہ اور عبادت کے معنی پرستش کرلئے جائیں تو اس سے جذبات کی حد تک تو ہم تسکین پا سکتے ہیں، اس تصوّر کا عملی طور پر زندگی سے کوئی واضح تعلّق نہیں رہتا۔ قرآن کا کام درحقیقت مذہب کے تراشیدہ تصوّرات کو خدا کے عطا کردہ تصوّرات سے بدلنے کا ہے۔ اس کے لئے کوئی ایسا طریقہ نظر نہیں آتا جس سے ہم ان پتھروں سے بھی بچ جائیں جن سے ہر مصلح کا راستہ پٹا پڑا ہے اور انسانوں کے خود ساختہ تصوّرات کو قرآنی تصوّرات سے بھی بدل دیں۔

میرے عزیز بھائی! میرے نزدیک، یا یوں کہیئے کہ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، اس کے لئے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوسکتا۔ یہ دنیا کے ہر فرعون، ہر ہامان، اور ہر قارون سے جنگ مول لینا ہے اور یہ جنگ ایسی ہے جس میں مفاہمت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جب تک ہم لآ اِلٰہ نہیں کہتے۔ اِلاّ اللہ پر آ ہی نہیں سکتے یہی انبیائؑ کا راستہ تھا اور یہی راستہ ہر اس شخص کو اختیار کرنا ہوگا جو اس قسم کا ارادہ رکھتا ہے۔ لا اِلٰہ میں ہر غیر خداوندی بت کو پاش پاش کرنا ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ ان بتوں کے پجاری اپنے معبودوں کو نیست و نابود ہوتے کس طرح دیکھ سکتے ہیں۔

حنیف :۔ قرآنِ حکیم نے ایک جگہ کہا ہے۔

> کیا تمہیں یہ گمان ہے کہ تم جنّت میں داخل ہوجاؤ گے اور تمہیں وہ کچھ پیش نہ آئے گا جو تم سے پہلوں کو پیش آیا۔ انہیں مصائب و آلام نے گھیر لیا اور وہ طوفانِ حوادث میں یوں تھپیڑے کھاتے رہے کہ نبی اور اس کے رفقاء پکار اٹھے کہ اے اللہ! تیری نصرت کب آئے گی۔ (البقرہ ۲:۱۴)

خداوندِ کریم نے ایمان کے ساتھ ساتھ عملِ صالح کے ذکر کا جو التزام برتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ قرآن نے آزمائش و ابتلاء کو مومن کی زندگی کا لازمہ گردانا ہے۔ جن لوگوں کے دل میں یہ درد پیدا ہوا کہ ہم نے اسلام کی آسان تعلیم کو سمجھنے میں غلطی کی ہے انہوں نے میرے خیال میں یہ احتیاط نہیں برتی کہ کہیں اس شوقِ تسہیل

(OVER SIMPLIFICATION) کے فطری نتیجے کے باعث اپنے مقتدیوں کو اس راہ پر ڈال دیں کہ وہ راہِ حق ہی کو آسان سمجھ بیٹھیں. تعلیم کے بارے میں تو قرآن نے خود بہت تاکید سے اپنے یسر یا آسان ہونے کا ذکر کیا ہے لیکن اس سے عمل کی کھٹنائیاں تو کم نہیں ہو جاتیں۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ تعلیم کو مشکل بنانے کے لئے عمل کے ساتھ ساتھ تعلیم کے سلسلے میں (OVER SIMPLIFICATION) بھی اسلام کے ساتھ زیادتی ہے. چنانچہ میں نے ایسے گھرانوں کو اسلامی شعائر کی، بڑے اعتماد سے توہین کرتے دیکھا جس میں قرآن کے یسر ہونے کا غلط تصور پیدا ہو گیا ہے. انہیں صوم وصلوٰۃ جیسے احکامات میں وقت کا اور خیرات میں مال کا زیاں محسوس ہوتا ہے. ادھر عملی سطح پر دو تقریریں اور چار پمفلٹ پڑھ کر اسے تدبر اور تعقل کی معراج سمجھتے ہوئے دوسرے تمام مسلمانوں کو بے علم بلکہ گمراہ گردانے پر مائل ہو جاتے ہیں. ان کی حالت ایسی ہے جیسی ایک نسل پیشتر ان لوگوں کی تھی جو کمیونزم سے متاثر ہوئے تھے یہ لوگ بحث تو مارکس کا نام لے لیکر کرتے تھے حالانکہ داس کیپیٹال کے درشن بھی انہیں نصیب نہ ہوئے تھے ان کا نقد علم کمیونزم پر چند مفت بٹنے والے کتابچوں پر مبنی تھا۔

مِن و عَن، غلط روش پر چلنے والی قومیں ہمیشہ افراط و تفریط کے جھولے جھلاتی رہتی ہیں. یہی کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے. ہمارے یہاں پہلے قرآن کریم کو ایسا مشکل بتایا گیا کہ اس کا سمجھنا "گیت ودیا" سے کم مشکل نہ تھا. نتیجہ اس کا یہ کہ قرآن کے الفاظ کی تلاوت حصولِ ثواب کے لئے کافی سمجھ لی گئی اور حصولِ جنت کو اس قدر آسان بنا دیا کہ اس کے لئے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے. اس کے لئے اس قسم کی روایات وضع کر لی گئیں کہ "جب دو مسلمان مصافحہ کرتے ہیں تو ان دونوں کے جدا ہونے سے پہلے اللہ تعالےٰ انہیں بخش دیتا ہے" (ابوداؤد) اور طاعون یا اسہال سے یا ڈوب کر مرنے سے شہادت کا درجہ عطا ہو جاتا ہے (نسائی). اب جھولا نیچے آیا، تو قرآنِ کریم کے سمجھنے کے لئے اتنے سے غور و فکر کی ضرورت بھی نہ سمجھی گئی جتنی مثلاً شیکسپیئر کے سمجھنے کے لئے. باقی رہا عمل سو اس کے لئے یہ برہمو سماجی عقیدہ اپنا لیا گیا کہ اصل بات "نیک عملی" ہے جس عمل کو کوئی نیک سمجھے اُسے کر لیا کرے. اللہ اللہ خیر سلا۔

دین ایک عالمگیر انقلاب کا داعی ہے جس کے لئے بڑی بڑی قوتوں سے ٹکر لینی ناگزیر ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے بڑی ہی مجاہدانہ حرارت کی ضرورت ہے میرے نزدیک کرنے کا کام یہ ہے کہ دین کے صحیح انقلاب آفرین تصورات واضح اور معین شکل میں معاشرے کے سامنے رکھ دیئے جائیں اور اسے

بتا دیا جائے کہ اس راہ میں کتنے خطرناک مقامات آتے ہیں لیکن اس کی منزل کس قدر حسین اور تابندہ ہے۔ اس کے بعد افرادِ معاشرہ سے کہہ دیا جائے کہ سب کچھ سوچنے اور سمجھنے کے بعد اپنے لئے فیصلہ کیجئے کہ دین کی راہ اختیار کی جائے گی یا نہیں۔ یونہی سراب آسا تخیلات کے ماتحت زندگی بسر کر کے نہ اپنے آپ کو دھوکا دیجئے نہ دین کو، نہ خود ذلیل ہوجیئے نہ اسلام کو بدنام کیجئے۔

حنیف: پرویز صاحب! میں آپ سے ایک ذاتی سوال پوچھنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ آپ نے برسہا برس تصنیف و تالیف کے ذریعے سے اور اپنے درس کے سلسلے کی وساطت سے لوگوں کے سامنے، اپنے خیال کے مطابق دینی تصورات کی صحیح شکل میں رکھنے کی کوشش کی ہے۔ کیا آپ نے یہ محسوس نہیں کیا ہے کہ آپ کی اس کوشش نے، کہ دین کے ان بنیادی تصورات کو لوگوں کے سامنے پیش کر دیا جائے، بعض لوگوں میں یہ جھوٹا اعتماد پیدا کر دیا ہے گویا وہ اسلام کی کنہ تک پہنچ گئے ہوں۔ کیا آپ کے مشاہدے میں یہ بات نہیں آئی کہ آپ کے چند پمفلٹ پڑھ کر یا چند تقریریں سن کر اور ان سے متاثر ہو کر بعض لوگ اپنے ہمسایوں سے اس انداز میں بحث مباحثہ کرنے چل دیتے ہیں کہ انہوں نے تو دین کی رُوح کو پا لیا ہے اور باقی سب گمراہ ہیں۔

پرویز: حنیف صاحب! میں نے شروع ہی سے اس قسم کے خدشات کو بھانپ لیا تھا اور اسی لئے میں نے آج تک کوئی جماعت نہیں بنائی۔ میں اپنی قرآنی فکر کو فضا میں بکھیرتا چلا جاتا ہوں اور اس سے مختلف مقامات پر مختلف نتائج پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ اختلاف قارئین اور سامعین کے اختلافِ مقاصد کا نتیجہ ہے بعض لوگوں کا مقصد اپنے پندار کی تسکین سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ انہوں نے میری تعلیم سے ایسی باتیں لے لیں جن سے انہوں نے سمجھ لیا کہ وہ اپنے ہمعصروں پر اپنے علم و فضیلت کی دھاک بٹھا سکتے ہیں۔ یہی ان کا مقصد تھا، یہ انہوں نے پالیا۔ لیکن اس گروہ میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے اندر میری فکر نے طالب علمانہ جذبے کو ابھارا ہے۔ وہ حقائق کو از خود سمجھنے کے لئے انتہائی محنت کرتے ہیں لیکن ان کے طالب علمانہ عجز کا یہ عالم ہے کہ ان پر نیوٹن کے اس مقولے کا اطلاق ہوتا ہے۔

ہم علم کے سمندر کے کنارے بچوں کی طرح سیپیاں اور گھونگے چُن رہے ہیں۔

لیکن میری کوششوں کا حاصل اس سے بڑھ کر ایک اور ہے اور وہ یہ کہ اب فضا میں قرآن کی آواز عام ہو رہی ہے حتیٰ کہ اپنے تو ایک طرف، مجھے گالیاں دینے والے بھی مجبور ہو رہے ہیں کہ اپنے سامعین کے

سامنے کچھ خدا لگتی باتیں کیا کریں میں سمجھتا ہوں کہ یہ تبدیلی ایک اچھے انقلاب کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔

حنیف: پرویز صاحب! مجھے تسلیم ہے کہ قرآن حکیم میں بہت گہرے اور ہمہ گیر معانی پائے جاتے ہیں لیکن غور کرنے پر بعض تصورات کی حد تک روایتی توجیہات بھی درست معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً میرے خیال میں صلوٰۃ کا ہرگز اتنا مفہوم نہیں ہے کہ چند رکعت نماز ادا کر لی جائے لیکن جب صلوٰۃ کے وسیع تر معانی پیش کرنے پر زور دیا جاتا ہے تو بعض اوقات یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ دو رکعت والی نماز سے انسان بالکل غافل ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کیا آپ کی فکر نے بھی بعض اس طرح کے نتائج پیدا نہیں کئے؟

پرویز: حنیف صاحب! دین میرے نزدیک زندگی کے ایک عملی نظام کا نام ہے اور جہاں تک ان ارکانِ اسلام کا تعلق ہے جن کی سند قرآن کریم سے ملتی ہے، وہ اس نظام کے ستون ہیں، یا یوں کہیئے کہ اس کے پروگرام کے لاینفک اجزاء ہیں۔ اگر وہ دین کے نظام کے تحت ادا ہوں تو ان کے حسین نتائج سامنے آتے ہیں اور اس طرح ان کا صحیح مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے اور ان کی اہمیت بھی۔

لیکن جب دین کا نظام باقی نہ رہے تو پھر ارکان کی شکل وصورت تو باقی رہ جاتی ہے، ان کی روح باقی نہیں رہتی۔ میرا پیغام یہ ہے کہ ان ارکان کو پھر سے دین کا جُز بنایا جائے تاکہ ان سے وہی نتائج مرتب ہوں جن کے لئے انہیں تجویز کیا گیا ہے۔ جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے، میں موجودہ حالات میں بھی، جب کہ وہ نظام موجود نہیں، ان ارکان کو اسی شکل میں قائم رکھنے کے حق میں ہوں اور اس کی تاکید بھی کرتا رہتا ہوں۔ اس لئے کہ ہم میں جب بھی احساسِ زیاں بیدار ہوا، انہی ارکان کے "حشرِ اجساد" سے ہمیں حیاتِ نو عطا ہو گی۔ لیکن اگر کوئی شخص ان کی پابندی نہیں کرتا تو اس پر میرا کوئی جبر نہیں۔ حقیقت یہ ہے حنیف صاحب! میں نے اپنی پوزیشن صرف ایک مبلّغ کی رکھی ہے، داعی یا کسی جماعت کے امام کی نہیں رکھی۔ اس کے ساتھ ہی میں اس سے بھی متفق نہیں ہو سکتا کہ چونکہ دین کے صحیح تصورات پیش کرنے سے لوگوں کی نظروں میں ان بے روح رسومات کی اہمیت کم ہونے کا خدشہ ہے اس لئے دین کی صحیح شکل سامنے لانی ہی نہیں چاہیئے۔ میرے "حلقۂ سخن" میں ایسے اربابِ فکر وعمل بھی موجود ہیں جو ان ارکان کی پابندی علیٰ وجہ البصیرت کرتے ہیں اور اس حقیقت کو محسوس کرتے ہیں کہ جب یہ ارکان اسلام کے نظام کے اجزاء بنے تو ان سے کس قدر خوشگوار نتائج مرتب ہوں گے۔

حنیف: قرآنِ حکیم نے ایمان کو عمل پر اولیت دی ہے۔ عمل کی اہمیت کو اس نے بے شک بے حد اُجاگر کیا ہے، لیکن عملِ صالح کا سرچشمہ ایمان ہی کو قرار دیا ہے اور ایمان، انسان کا اجتماعی مسئلہ نہیں ذاتی مسئلہ ہے۔

ہمارا عمل، بے شک، اجتماعی قالبوں میں ڈھل سکتا ہے لیکن ایمان ہم اپنے اندر اتر کر ہی لا سکتے ہیں یہ، نہ تو خوف سے پیدا ہوتا ہے، نہ جبر سے، نہ معاشرے کی ملامت سے، نہ تقلید سے۔ اس نظر سے دیکھیں تو فرد کی اہمیت اداروں سے اوّلین ہے۔ لیکن آجکل ایک اندازِ فکر یہ ابھر رہا ہے کہ اداروں کی تشکیل پر زور دیا جاتا ہے اور معاشرے کی اہمیت کو اتنا بڑھایا چڑھایا جاتا ہے کہ خدا کے ساتھ اس کے شریک ٹھہرنے میں شاید ہی کوئی کسر رہ جاتی ہو۔

اس اندازِ فکر کا ایک مظہر یہ ہے کہ سارا زور اس بات پر دیا جاتا ہے کہ افراد کو معاشرتی قوانین میں جکڑنے کے لئے دھڑا دھڑ قانون سازی کی جائے چنانچہ ملک میں سیاست کا بازار اس بہانے گرم کیا جاتا ہے کہ قانون ساز اداروں کے لئے چناؤ ہوگا۔ پھر ملک بھر کے بے خبر، بے درد، اور غیر ذمّہ دار لوگوں کو قانون سازی کے اعزاز میں دھڑے بندیوں، مفاد پرستیوں اور دھاندلیوں کی کھلی چھٹی دے دی جاتی ہے بحثیں ہوتی ہیں کہ اسلامی قانون بن سکتا ہے یا نہیں۔ مناظرے ہوتے ہیں کہ فلاں قانون اسلامی ہے یا نہیں۔ قانون سازی کا یہ تماشا ہمیں یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں دیتا کہ افراد کو اندر سے بدلنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ قانون کا احترام تو خدا کے خوف سے، اس کے قولِ فیصل پر ایمان سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ ایمان ہی موجود نہیں تو قوانین کی زنجیریں ریت کے رستوں سے بھی کمزور ثابت ہوں گی۔

(BOLANYI) کا برسوں کا کام (PERSONAL KNOWLEDGE) اس امر پر دال ہے کہ فرد ہی تمام تر معاشرتی ترقی کا سرچشمہ ہے اور علم کا حصول افراد ہی کے ذریعے سے ممکن ہوتا ہے اور پھیلتا ہے۔

اسی طرح قرآن میں قوانین صرف افراد سے متعلق ہیں۔ لیکن اجتماعی مسائل کے لئے اصول دیئے گئے ہیں۔ فرد کے حقوق تو اتنے اہم سمجھے گئے کہ انہیں خدا نے خود متعین کر دیا لیکن معاشرتی معاملات کو اصول بتا کر ان کی تشکیل کو انسانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔

میں یہ باتیں آپ کے سامنے اس لئے رکھ رہا ہوں کیونکہ آپ کے بارے میں عام احساس یہ ہے کہ آپ معاشرے کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔

میں اس مقام پر آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ انسانی زندگی میں فرد اور معاشرے کے درمیان کیا رشتہ ہے؟ اور کیا فرد کو بدلے بغیر معاشرے کو بدلنا ممکن ہے؟ دوسرے لفظوں میں کیا افراد کو نظرانداز

کم کے اداروں کی تشکیل کا جتن گاڑی کو گھوڑے سے پہلے جوتنے کے مترادف نہیں؟

کیا۔ عَبَسَ وَ تَوَلّٰٓی ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی ۝ وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰٓی ۝ (۸۰: ۱-۳)

کی آیات معمولی سے معمولی فرد کو بھی پوری اہمیّت دینے کا واضح حکم نہیں؟

پرویز: جسے ہم معاشرہ کہتے ہیں وہ افراد ہی کے مجموعے کا نام ہوتا ہے۔ افراد نہ ہوں تو معاشرہ کہاں سے بنے گا! اس لئے بنیادی اہمیّت افراد ہی کو حاصل ہے صحیح ایمان سے افراد کے اندر جو تبدیلی واقع ہو گی اس کا مظاہرہ معاشرے میں ہوگا۔ افراد کی تعلیم و تربیت اس لئے نہایت ضروری ہے۔

لیکن ہمارے ہاں دین کا تصوّر ایک اجتماعی نظام کی حیثیت سے ذہنوں سے محو ہو چکا ہے اور ہم نے اسے "مذہب" کے مرادف المعنی سمجھ کر اسے انفرادی مسئلہ بنا لیا ہے، یعنی خدا اور بندے کا پرائیویٹ تعلق۔ میری بصیرت کے مطابق، یہ تصور قرآنی نہیں۔ دین اجتماعی نوعیت کا نظام ہے اس لئے وہ امّت کی تشکیل پر زور دیتا ہے۔ اس اہمیّت کے پیش نظر میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر زور دیتا ہوں تاکہ دین کا صحیح تصوّر ان کے سامنے آسکے۔ میری پیش کردہ فکر میں جو معاشرہ پر زور دیا جاتا ہے تو اس سے یہ مقصد ہے کہ ہم نے دنیا کے سامنے اس حقیقت کو پیش کرنا ہے کہ اگر انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی بنیاد خدا کی دی ہوئی مستقل اقدار پر ہو تو اس سے محیّر العقول انسانیّت ساز نتائج مرتّب ہوتے ہیں اور یہ بات کسی دوسرے اجتماعی نظام سے ممکن نہیں۔ یہی وہ ضرورت ہے جس کے لئے اسلام اپنے لئے ایک الگ مملکت چاہتا ہے، اپنی آزاد حکومت چاہتا ہے۔ میں دین کے اسی تصور کو اجاگر کرنے کے لئے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر زور دیتا ہوں۔ ورنہ اگر دین خدا اور بندے کے پرائیویٹ تعلق ہی کا نام ہو تو اس کے لئے نہ الگ مملکت کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ اپنی آزاد حکومت کی۔

جب دین کے تصوّرات اور ان کے انسانیّت ساز جنّت بداماں درخشندہ نتائج کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھ لیا جائے تو اس سے اس ایمان کی ندیاں رواں ہو جاتی ہیں جن کا سرچشمہ قلبِ انسانی کی گہرائی ہے ظاہر ہے کہ یہ چیز صحیح تعلیم و تربیت ہی سے ممکن ہے۔ لیکن صحیح تعلیم و تربیت تو آنے والی نسل کی ہو سکتی ہے (اس کے لئے میں اٹھارہ برس سے مسلسل کوشش کر رہا ہوں) جن افراد پر ہمارا موجودہ معاشرہ مشتمل ہے وہ موجودہ نہج پر پختہ ہو چکے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس معاشرے میں اسلامی اقدار کو کیسے رائج کیا جائے؟ ظاہر ہے کہ یہ کام قانون کے ذریعے ہی کیا جائے گا۔ اس کے لئے معاشرے میں قرآنی قوانین کا نفاذ کیا جانا ضروری ہے۔

جو لوگ تعلیم و تربیت سے قطع نظر کر کے محض حکومت کے ڈنڈے سے اسلامی معاشرے کی تشکیل چاہتے ہیں وہ میرے نزدیک یہودی شریعت کے تصور کو تو کچھ سمجھتے ہیں لیکن نبیٔ اکرمؐ کے معلم ہونے کی حیثیت کو بالکل نہیں سمجھتے۔

اس مقام پر شاید کہہ دیا جائے کہ نبیٔ اکرمؐ نے تعلیم و تربیت کے ذریعے سے جماعت کی تشکیل کی تھی، قانون کا اطلاق ان پر بعد میں کیا گیا تھا۔ لیکن تم موجودہ مسلمانوں پر قانون کا اطلاق ضروری سمجھتے ہو۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبیٔ اکرمؐ نے غیر مسلموں کو مسلمان کیا تھا اور انہیں مسلمان کرنے کا طریقہ تعلیم و تربیت تھا۔ اس لئے اُس وقت جو معاشرہ متشکل ہوا تھا، وہ تھا ہی ان مسلمانوں پر مشتمل جو تربیت یافتہ تھے لیکن ہمارے ہاں صورت اس کے برعکس ہے۔ یہاں پہلے سے ایک معاشرہ موجود ہے جو مسلمانوں پر مشتمل ہے لیکن یہ مسلمان وہ ہیں جو تعلیم و تربیت کے بعد مسلمان نہیں ہوتے، وہ بس مسلمان ہیں۔ ان کی آئندہ نسل کو تو اسی طرح مسلمان کرنا چاہیئے جس طرح نبیٔ اکرمؐ نے دوسروں کو مسلمان کیا تھا یعنی تعلیم و تربیت کے ذریعے ___ لیکن موجودہ مسلمانوں کو علیٰ حالہٖ نہیں چھوڑا جا سکتا، انہیں لامحالہ کسی نہ کسی قانون اور ضابطہ کے ماتحت رکھنا ضروری ہے۔ تو وہ قانون اور ضابطہ اسلامی کیوں نہ ہو۔ اس سے بھی بڑی حد تک معاشرتی اصلاح ہو جائیگی۔

میں اسے پھر واضح کر دوں کہ افراد اور معاشرے کا تعلق ایک مشین کے پرزوں اور خود مشین کا تعلق ہے۔ جب تک پُرزے صحیح حالت میں نہ ہوں گے مشین صحیح کام نہیں کرے گی۔ لیکن پُرزے بھی تو اسی وقت اپنا مقصد پورا کریں گے جب وہ مشین کے اندر فٹ ہوں گے۔ ایک پرزہ اپنی ذات میں کتنا ہی اصلح اور گراں بہا کیوں نہ ہو اگر وہ مشین سے باہر رکھا ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کا عدم وجود برابر ہے اور مشین کے اندر ایک معمولی سا پیچ بھی اپنا مقام رکھتا ہے اور اپنی زندگی کا مقصد پورا کرتا ہے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

دین کا نظام وہ مشینری ہے جس کے اندر ہر پرزہ (افرادِ معاشرہ) اپنے اپنے مقام پر اپنا اپنا فریضہ ادا کرتا اور یوں اپنی ہستی کا مقصد بروئے کار لاتا ہے۔ اس مثال میں اس فرق کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ مشین کے پُرزے بے جان ٹکڑے ہوتے ہیں جو میکانکی طور پر مصروفِ نقل و حرکت رہتے ہیں۔ اس کے برعکس افرادِ معاشرہ ذی حیات اور قابلِ نشو و نما نفوس ہوتے ہیں۔ اس نظام کے اندر ان کی نقل و حرکت بالارادہ ہوتی

ہے جس سے خود ان کی صلاحیتوں میں بھی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے، یعنی جہاں اسلامی نظام کا مجموعی نتیجہ عالمگیر انسانیت کے لئے سرفرازیوں اور خوشگواریوں کا ضامن ہوتا ہے، اس کے ساتھ ہی اس سے خود افرادِ معاشرہ کی صلاحیتوں میں بھی جِلا پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح اس نظامِ اجتماعی کے اندر ان افراد کی انفرادیت گم نہیں ہوجاتی بلکہ وہ نہ صرف قائم رہتی ہے بلکہ مستحکم ہوتی چلی جاتی ہے۔ یوں یہ نظام خود ان افراد کی ذات کے استحکام کا موجب بن جاتا ہے۔ یہ چیز دنیا کے کسی اور نظام میں ممکن نہیں۔ دنیا میں جہاں فرد ہوتا ہے، وہاں نظام کا تصوّر نہیں ہوتا۔ (مذاہبِ عالم میں یہی کیفیت ہوتی ہے) اور جہاں نظام ہوتا ہے وہاں فرد باقی نہیں رہتا (جیسے مغرب کے جماعتی نظاموں میں ہو رہا ہے)۔ یہ خصوصیت اسلامی نظام ہی کی ہے کہ اس میں نظام خود افراد کی ذات کے استحکام کا موجب بنتا ہے۔ فرد اور معاشرے کا یہی وہ تعلق ہے جسے اقبالؔ نے اس انداز میں بیان کیا ہے کہ

زندگی انجمن آرا و نگہدارِ خود است
اے کہ در قافلہ بے ہمہ شو با ہمہ رو

حنیف:- خداوندِ کریم نے قرآن میں انسان کو دعوت دی ہے کہ وہ اس کی آیات کو آفاق و انفس میں تلاش کرے۔ جہاں تک آفاق کا تعلق ہے، علوم و فنون کی راہ سے، سمع و بصارت اور ذہن کی راہ سے، انسان اس قائم بالحق کائنات میں اللہ کے واضح اور نت کھلتے چلے جانے والے نشانات دیکھتا ہے یا دیکھ سکتا ہے۔ جہاں تک انفس کا تعلق ہے، علمی سطح پر نفسیات نے عموماً اور تحلیل نفسی نے خصوصاً کچھ راہیں تراشی ہیں پھر فلسفیوں نے انسانی ذات پر جو کام کیا ہے، اس نے کچھ دریچے کھولے ہیں۔ سری آروبندو نے "حیاتِ ربانی" میں، اوسپنسکی نے "اعجاز کی تلاش" میں انسان کے اندر بسنے والے جہانوں کی نشاندھی کی ہے۔ ہمارے یہاں اقبالؔ نے مکانِ دروں کے نظریئے سے اس اقلیم کی جانب توجہ دلائی ہے جو عموماً سربستہ رہتی ہے۔

میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا تصوّف کی صحیح تعلیم یہی نہیں تھی کہ خدا کی آیات کو انفس میں تلاش کرنے کی راہ ڈھونڈی جائے اور کیا جب تک آفاق کے ساتھ ساتھ انفس میں خدا کی آیات کا وجود نہ نظر آئے، یہ ممکن ہے کہ انسانی عمل کو وہ سرچشمہ نصیب ہوجائے جو دل میں خدا پر ایمان لانے ہی سے پھوٹتا ہے۔

آج ہم اضطراب، نامرادی اور سنگدلی کے جو مظاہر اپنے چاروں طرف دیکھتے ہیں کیا ان کی بنا یہ نہیں کہ ہم نے ظاہری تعلیم کے ساتھ ساتھ باطنی تعلیم کو اس کا جائز حق نہیں دیا، خصوصاً جبکہ خدا کا حکم موجود ہے کہ گناہ

کے ظاہر سے بھی بچو اور اس کے باطن سے بھی بچو؟ بے شک اسلام رہبانیت نہیں سکھاتا اور تصوّف کی مروجہ شکلیں رہبانیت بلکہ ویدانت کی گھسی پٹی صورتوں سے ہم آہنگ ہیں لیکن کیا تصوّف کا جوہر ـــ یعنی انفس میں خدا کی آیات کی تلاش ـــ ہمارے لئے ان راہوں کو روشن نہیں کر سکتی جو انسان کو لپک کر خدا کا رفیق بن جانے کی رغبت دلاتی ہیں؟

پرویز:۔ تصوّف ایک اصطلاح ہے، اور جب تک اس کا صحیح مفہوم نہ سمجھ لیا جائے، اس کی تائید و تردید میں بات کرنا مفید نہیں ہوگا۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ تصوّف یا صوفی کا لفظ نہ قرآن میں ملتا ہے نہ حدیث میں حتیٰ کہ اُس زمانے کے دوسرے لٹریچر میں بھی اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

اب یہ دیکھئے کہ تصوّف ہے کیا؟ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ انسانی علم کے ذرائع تجربہ، مشاہدہ، اور تفکر ہیں۔ ان سے بلند ایک اور ذریعۂ علم ہے اور وہ ہے وحی ـــ جو انبیاءؑ کو ملتی تھی ـــ وحی میں نبی کے ذاتی فکر یا تجربے یا مشاہدے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ نبی حقیقت کا انکشاف نہیں کرتا، حقیقت خود اپنے آپ کو اس پر منکشف کرتی ہے۔ اس میں معروضیت (OBJECTIVITY) بنیادی چیز ہے۔ وحی کا سلسلہ نبی کریمؐ کی ذاتِ گرامی پر ختم ہو گیا۔ لہٰذا علم کا یہ ذریعہ اس کے بعد بند ہو گیا۔ اب ہمارے لئے علم کے دو ہی چشمے ہیں۔ ایک قرآن کریم میں بیان کردہ حقائق اور دوسرا ان کے سمجھنے کے لئے انسانی فکر۔ اگر کوئی شخص آج حقیقت کا علم خدا سے براہِ راست حاصل کرنے کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ دراصل نبوّت کا مدعی ہے۔

تصوّف کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ صوفی حقیقت کا براہِ راست علم خدا سے حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ سرخیلِ صوفیا شیخ محی الدین ابن عربی کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم حقیقت کا علم اس مقام سے حاصل کرتے ہیں جہاں سے نبی کو علم ملتا تھا۔ یہ تصوّف کی وہ بنیاد ہے جو ختمِ نبوت کی ساری عمارت کو منہدم کر دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس کا پتا نشان قرنِ اولیٰ میں کہیں نہیں ملتا۔ یہ تصوّر جو ایک بہت بڑی سازش کا پیش خیمہ تھا، مسلمانوں میں بہت بعد میں لایا گیا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں "تصوّف اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے"۔

اب آیئے انفس و آفاق والی آیت کی طرف۔ اس کے ایک معانی تو یہ ہیں کہ قرآن جس انقلاب کی نشاندہی کرتا ہے، اسلام کی اوّلین مخاطب قوم اس کو خود اپنے اندر بھی دیکھے گی اور دیگر اقوامِ عالم کے اندر بھی۔ لیکن انسان کی مضمر قوتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور ان پر غور و فکر کرنے کے لئے قرآن کریم نے کئی مقامات

پرتاکید کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان کی یہ داخلی مضمر قوتیں کیا ہیں۔ اس کے متعلق کسی مضمر پیچیدگی میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ انفرادی اور جماعتی طور پر ہم ہر روز ان کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ تسخیر کائنات کے لئے علم کی قوت، بے پناہ ہمتوں اور قربانیوں کے لئے یقین محکم (ایمان) کی قوت، نظم وضبط کے تابع کام کرنے والے افراد کی مجموعی قوت، زاویۂ نگاہ کی تبدیلی سے صحیح عمل کی قوت، وغیرہ وغیرہ۔ یہ قوتیں قوانینِ خداوندی پر عمل کرنے سے ابھرتی ہیں جو قرآن کریم میں دیئے گئے ہیں اور جن کا محسوس مظاہرہ سب سے پہلے محمدؐ رسول اللہ والّذین معہ کے اسوہ حسنہ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس کا نام کردار کی بلندی اور سیرت کی پاکیزگی ہے۔ لیکن انسان کی بعض داخلی قوتوں کا ایک فنّی پہلو بھی ہے۔ جس طرح ایک پہلوان خاص قسم کی کسرت اور ریاضت سے اپنی جسمانی قوت اتنی بڑھا لیتا ہے کہ وہ عام انسان ہی دکھائی نہیں دیتا، اسی طرح خاص مشقوں کے ذریعے سے انسانی قوتِ ارادی کو اس طرح بڑھایا جا سکتا ہے کہ اس سے بعض ایسی باتیں سرزد ہوتی ہیں جو عام آدمیوں کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ یہ ہندوؤں کی سمادھیوں، سنیچوں کے آتشکدوں اور عیسائیوں کی خانقاہوں (وغیرہ) میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس کی ایک منجھی ہوئی شکل آج ہمیں ہپناٹزم کی صورت میں ملتی ہے۔ انسان کی یہ قوت خالص فنّی چیز ہے جس کا دین سے کوئی تعلّق نہیں۔ یہ بلاتفریق مذہب وملّت، ہر اس شخص کو حاصل ہو سکتی ہے جو اس قسم کی ریاضتیں اور مشقّتیں کرے۔ مگر توہم پرستی کی تاریکیوں میں اسے "روحانیت کی کرامات" قرار دے دیا جاتا ہے۔ اسی کو تصوّف کا کمال قرار دیا جاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے، یہ ایک فنّی چیز ہے جس کا دین سے کوئی تعلّق نہیں۔ دین قوانینِ خداوندی کی اطاعت کا نام ہے جس سے ایک فرد کے اندر حسین وجمیل کردار کی روشنی چمکتی ہے اور ان افراد کے مجموعے سے جو معاشرہ مرتّب ہوتا ہے، وہ کاروانِ انسانیت کو اس منزلِ مقصود کی طرف لے جاتا ہے جو شرف وتکریمِ انسانیّت کی معراجِ کبریٰ ہے۔

قرآن کریم نے نبیؐ اکرمؐ کو سیرت وکردار کے بلند ترین مقام پر فائز بتایا ہے (اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ [۶۸/۴]) اس پر شاہد ہے) صحابۂ کبارؓ کے بھی حسنِ سیرت وبلندیٔ کردار ہی کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کی کسی روحانی قوت کا ذکر نہیں کیا۔ اس نے جہاں قوموں کے عروج وزوال کے سلسلے میں یہ ابدی قانون بیان کیا ہے کہ

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ [۱۳/۱۱]

خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ اپنے انفس میں تبدیلی نہیں کرتی تو اس سے قوموں

کی نفسیاتی تبدیلی مراد ہے تصوّف کی رُو سے کوئی روحانی تبدیلی مقصود نہیں۔ تصوّف تو قوم یا اجتماعی زندگی سے بحث ہی نہیں کرتا۔ قرآن کے لُغت میں تصوّف کے لئے رہبانیت کا لفظ آیا ہے جسے وہ ذہنِ انسانی کا خود تراشیدہ مسلک قرار دیتا ہے۔ تصوّف کو اسلامی اور غیر اسلامی شقوں میں تقسیم کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اسلامی کمیونزم اور غیر اسلامی کمیونزم کا تصوّر پیش کرے۔

حنیف: ہمارے یہاں یہ تصور ہے کہ اس سرزمین میں اسلامی تعلیم صوفیا کرام کی مرہونِ منت ہے آپ نے فرمایا ہے کہ تصوّف بنیادی طور پر انفرادیت پسند ہے اور اجتماعی معاملات سے اس کا تعلق کم ہوتا ہے لیکن اس اعتبار سے دیکھیں تو تصوف کا اثر ہماری ہیئتِ اجتماعی پر بہت گہرا ہے، بلکہ اہلِ تصوّف نے آگے بڑھ کر معاشرے کو گلے سے لگانے کی کوشش کی ہے۔ پھر اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے بعض مفکرین مثلاً غزالیؒ، شیخ احمدؒ سرہندی، شاہ ولی اللہؒ اور بعض کے نزدیک اقبالؒ کا، بلند پایہ مجتہدین ہوتے ہوئے بھی تصوّف سے گہرا رشتہ رہا ہے۔ کیا ان لوگوں کی مثال سے ہم یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے، کہ ایک ایسا مقامِ اتصال بھی اسلام کی تعلیم کے دائرے میں رہتے ہوئے نکل سکتا ہے جہاں شریعت، اور تصوّف باہم شیر و شکر ہو جائیں۔

پرویز: حنیف صاحب! میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ان حضرات نے 'درحقیقت' کس قسم کا اسلام پھیلایا تھا، لیکن جس اسلام کو ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور جو اس وقت ہمارے ہاں رائج ہے' وہ وہی اسلام تو ہے جس کا رونا میں اور آپ دونوں بیٹھے رو رہے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ اس اسلام کا بہت گہرا اثر ہماری ہیئتِ اجتماعی پر ہوا ہے اور اسی اثر کو زائل کرنے کے لئے اس قدر کاہش و کاوش کرنی پڑ رہی ہے۔ لیکن وہ پھر بھی زائل نہیں ہو رہا۔

باقی رہی شخصیتیں، تو قرآن کریم نے اس باب میں ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ: تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (۲/۱۴۱)

یہ لوگ اپنے وقت میں گزر گئے، جو کچھ انہوں نے کیا وہ ان کیلئے ہے اور جو تم کرو گے وہ تمہارے لئے ہوگا اور ہم تم سے یہ کبھی نہیں پوچھیں گے کہ انہوں نے کیا کیا تھا" لہٰذا میرے نزدیک دین میں سند صرف خدا کی کتاب ہے متقدمین ہوں یا متاخرین، ان میں سے کسی سے جو اقوال و اعمال قرآنی تعلیم کے مطابق ہوں گے، انہیں ہم قابلِ ستائش سمجھیں گے۔ جو اسکے خلاف جائینگے انہیں ہم مسترد کر دیں گے کہ ہمارے لئے کسوٹی خدا کی کتاب ہے نہ کہ کسی انسان کا فکر و عمل۔

تشکیلِ پاکستان کے سلسلے میں

چند اہم استفسارات

(مئی ۱۹۶۵ء)

ذیل کا خط پرویز صاحب کے نام موصول ہوا ہے۔

"آپ چونکہ "نظریۂ پاکستان" کے روزِ اوّل سے مبلّغ ہیں، مزید برآں آپ کو اس نظریہ کے خالق اور بانیانِ پاکستان سے براہِ راست تعلق رہا ہے اس لئے میں بذریعہ مکتوب ہذا آپ سے اس نظریہ کی وضاحت چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اس کا جواب ماہنامہ طلوعِ اسلام میں شائع فرما کر شکر گزاری کا موقع بخشیں گے نیز بندہ کو بذریعہ خط ہدایت فرمائیں گے کہ کس مہینے کا "طلوعِ اسلام" دیکھ کر استدراک حاصل کروں۔

(۱) نظریۂ پاکستان جو کچھ میں نے پڑھا اور سنا ہے وہ یہ ہے: متحدہ ہندوستان میں مسلمان ایک الگ مستقل قوم ہیں اور مسلمانوں کے نزدیک قومیت کی بنیاد وطنیت کے تصور پر نہیں ہے۔ لہٰذا یہ ہندوستانی نہیں ہیں، بلکہ قومیت کی بنیاد اسلام ہے، لہٰذا یہ ہندوؤں سے الگ "مسلمان" قوم ہیں۔

(۲) کیونکہ از روئے تعداد متحدہ ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور از روئے جمہوریت حکومت اکثریت کی بنے گی، یعنی ہندوؤں کی، لہٰذا ایسی حکومت کے تحت اُن کے قومی وجود کی نفی ہوتی ہے۔ لہٰذا، "ایک قوم ایک وطن" کے اصول پر اُن کے لئے الگ وطن درکار ہے۔

(۳) تاکہ یہ قوم اس وطن میں اپنے تمدن اور نظریۂ حیات یعنی مختصر الفاظ میں اسلام کا تحفظ اور نفاذ (خاص کر نفاذ) کر سکے لہٰذا ہندی مسلمانوں کو ایک الگ وطن "پاکستان"، دیا جائے جو اُن کو اب حاصل ہو گیا ہے۔

تجزیہ: گویا ہم کو پاکستان کی جدوجہد اس لئے کرنی پڑی کہ ہم مسلمان اسلام کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے تھے جو ہندو اکثریت کی حکومت میں ناممکن تھی کیونکہ اسلام اپنے نفاذ کے لئے حکومت کی قوت کا طلب گار رہے اور ازروئے جمہوریت ہم کو متحدہ ہندوستان میں یہ "قوت" حاصل نہ ہو سکتی تھی۔

(۴) لیکن "قیامِ پاکستان"، سے صورتِ حال یہ بن گئی ہے کہ ہم نے کہا تو یہ تھا کہ "ہندوستان میں بسنے والے تمام مسلمان، ازروئے دین ایک قوم ہیں، ہندوؤں سے الگ۔ لہٰذا ان کو ایک الگ وطن نفاذِ دین کے لئے درکار ہے"، لیکن یہ مسلمان قوم دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک حصہ اقلیت کی حیثیت سے آج بھی ہندوؤں کا غلام ہے۔ اور دوسرا پاکستان کی شکل میں آزاد۔

(۵) یہاں پہنچ کر تحریکِ پاکستان خالص علاقائی تحریک بن جاتی ہے، یعنی ہم من حیث القوم، ہندوؤں سے آزادی کے خواہاں نہ تھے بلکہ ہم لاہور اور کراچی کو دہلی کے تسلط سے یا ڈھاکہ کو کلکتہ کے تسلط سے بچانا چاہتے تھے۔

پھر اصولاً یہ تحریک اس علاقہ کے مسلمانوں کو اس نظریہ پر شروع کرنی چاہیئے تھی۔

ہم کیونکہ "موجودہ پاکستانی علاقوں"، میں اکثریت میں ہیں لہٰذا ہم متحدہ ہندوستان میں شامل رہ کر اقلیت بننا پسند نہیں کرتے۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں ہمیں اس دعویٰ کی ضرورت نہ تھی کہ ہم ایک وطن میں اسلام کا نفاذ چاہتے ہیں۔

(۶) آپ کہہ سکتے ہیں کہ تقسیم ہندوستان ہندو اور مسلمان کی بنیاد پر واقع ہوئی ہے۔ لہٰذا اس کی ٹھوس شکل یہ تھی کہ ہندوستان سے تمام مسلمان سمٹ کر پاکستان میں چلے آتے اور پاکستان سے تمام ہندو بھارت چلے جاتے۔ (چودھری رحمت علی کا نظریہ یہی تھا)

(۷) ہم اتنی بڑی ہجرت کیوں کرتے؟ محض اس لئے کہ ہم اسلام پر عمل کرنا چاہتے ہیں جو اکٹھے رہتے ہوئے ناممکن ہے۔ لیکن آج اگر پانچ کروڑ مسلمانوں کا بھارت میں اقلیت کی حیثیت سے رہنا ان کے اتباعِ اسلام میں حارج نہیں ہے تو پھر ہم کیوں نہ رہ سکتے تھے۔

(۸) دراصل سوالات کی صورت یہ بن جاتی ہے کہ

و۔ مسلمان بحیثیت قوم ہو یا فرد، زندگی کے ہر پہلو میں اسلام کا اتباع فرض ہے۔
ب۔ اسلام ناقابلِ تقسیم ہے، یعنی اس کے احکام نجی یا اجتماعی یا فرد اور ریاست میں قابلِ تقسیم نہیں ہیں کہ کچھ کو چھوڑ دیا جائے اور کچھ پر عمل کیا جائے۔
ج۔ اس لئے اسلام کے نفاذ کے لئے حکومت کی قوت ضروری ہے۔ مثلاً مسلمان اپنے معاشرہ میں چور کے لئے "قطعِ ید" کی سزا رائج کرنا چاہتے ہیں، مگر ایک غیر مسلم حکومت کے شہری کی حیثیت سے وہ کسی مسلمان کا ہاتھ نہیں کاٹ سکتے۔ لازماً حکومتِ وقت کے قوانین حائل ہوں گے۔
د۔ اب ظاہر ہے کہ غیر مسلم حکومت سے اگر ان کو ہجرت کا مشورہ دیا جائے کہ مسلم حکومت میں آجاؤ، تو غیر مسلم علاقوں میں آئندہ کے لئے اشاعتِ اسلام کے سوتے سوکھ جائیں گے۔ یا اگر دوبارہ وہاں اشاعتِ اسلام ہو، تو پھر ایک مسلمان اقلیت پیدا ہو جائے گی جو اسلام پر عمل کرنے میں الجھن محسوس کرے گی۔ لہٰذا، ہر بار "پاکستان" کا جھگڑا پیدا ہوتا رہے گا، جو کہ اگر اقلیت بے اثر ہو تو شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ لہٰذا، اسلام کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کرنا اور پھر اس قوم کے لئے وطن مانگنا گویا عملاً اشاعتِ اسلام کو روکنا ہے۔
ذ۔ اگر اسلام کی بنیاد پر قوم بنتی ہے تو پھر چینی یا روسی مسلمانوں کو یا امریکی یا برطانوی مسلمانوں کو آج ہی الگ وطن کا مطالبہ کر دینا چاہیئے خواہ وہ ایک شہر ہی کیوں نہ ہو، تاکہ وہ اسلام پر پورا پورا عمل کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ تو پھر ان کو ہجرت کرنی چاہیئے، تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں اشاعتِ اسلام ختم ہو جائے گی۔
(ی) اس تشریح سے مختصر سوال یہ بنا کہ جس طرح اسلام نے ذمیوں کے حقوق و فرائض متعین کئے ہیں، آخر کیا اس نے اس کی بھی صورت متعین کی ہے کہ جب مسلمان کسی علاقے میں ذمی (اقلیت) بن جائیں تو کس طرز کی زندگی گزاریں کہ اسلام کی تقسیم نہ ہونے پائے۔
(ل) اور اگر اقلیت کی حیثیت سے اسلام پر عمل ہو سکتا ہے تو پاکستان کی ضرورت چہ معنی دارد؟
(م) اور اگر اقلیت کی حیثیت سے عمل نہیں ہو سکتا تو پھر ظاہر ہے کہ دنیا کے جس علاقے میں بھی اشاعتِ اسلام کی ابتداء کی جائے گی، وہاں ایک مدت تک مسلمان اقلیت میں رہیں گے۔ اب اگر وہ اسلام پر عمل کرنے میں حکومتِ وقت کو حائل سمجھتے ہیں تو اس کا ایک ہی حل ہے۔
(ا) قرونِ اولیٰ کی طرح بزورِ شمشیر علاقے فتح کر کے وہاں اسلام نافذ کیا جائے۔ (تاریخِ اسلام سے تو صرف یہی طریقہ سمجھ میں آتا ہے)۔

(ii) اور اگر ہم ایسا نہیں کر سکتے تو جمہوریت کے ساتھ اسلام کا نباہ کس طرح ہوگا؟ یعنی جمہوریت کی رُو سے ایک غیر مسلم ملک میں مسلمان اقلیت کس طرح اسلام پر آزادانہ عمل کر سکے گی؟ اسلام نافذ کر سکے گی؟

جواب: ص۱-۳۔ آپ نے اپنے پہلے تین سوالوں میں جو کچھ کہا ہے اور ان کے بعد جو تجزیہ کیا ہے، وہ درست ہے۔ پاکستان کا مطالبہ اسی بنیاد پر کیا گیا تھا کہ مسلمان دین کی بنیادوں پر غیر مسلموں سے الگ ایک مستقل قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور اسلام کے ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے متشکل ہونے کیلئے آزاد مملکت کی ضرورت ہے۔

سوال ۴: اس وقت یہی حالت ہے کہ کچھ مسلمان ہندوستان میں بستے ہیں (جس طرح دنیا کے اور ملکوں میں مسلمان غیر مسلم اکثریت کے مقابلے میں اقلیت کی حیثیت سے بستے ہیں) اور پاکستان کے مسلمان ایک آزاد مملکت میں بستے ہیں۔

سوال ۵: اس سوال سے آپ کا مفہوم یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد یہاں اسلامی انداز کی حکومت قائم نہیں ہوئی۔ ہوا صرف یہ ہے کہ چند علاقوں میں مسلمانوں کی آزاد حکومت قائم ہو گئی ہے۔

اس سے آپ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہمارے دعوئ پاکستان کی بنیاد غلط تھی۔ ہمیں اس بنیاد پر پاکستان کا مطالبہ کرنا چاہیئے تھا کہ ہم اپنی اکثریت کے علاقوں میں اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اسلام کو درمیان میں نہیں لانا چاہیئے تھا۔

آپ کا یہ نتیجہ صحیح نہیں۔ پاکستان کا مطالبہ کیا ہی اسلام کی بنیاد پر گیا تھا اور اس مطالبے کو پیش کرنے والے (علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ) اپنے اس مطالبے اور دعوے میں بالکل مخلص اور دیانت دار تھے انہوں نے اسلام کے تقاضے کو محض ایک "وکیلانہ حربے" کے طور پر استعمال نہیں کیا تھا۔

سوال ۶: خیال ایسا ہی تھا کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے مابین بین المملکتی سطح پر تبادلۂ آبادی کا معاہدہ کر کے زائد آبادی کے لئے مناسب رقبہ حاصل کیا جائے۔ اس طرح ہندوستان کے جو مسلمان پاکستان آنے کے لئے آمادہ ہوتے ان کے لئے یہاں جگہ بن جاتی اور ان کی نقل مکانی امن و سکون سے ہو جاتی لیکن تشکیلِ پاکستان کے بعد حالات اس تجویز کے لئے ناسازگار ہوتے چلے گئے ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد حالات کبھی اس کے لئے سازگار ہو جائیں لیکن بہ حالتِ موجودہ بھی کم از کم آٹھ کروڑ مسلمانوں کو اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کی امکانی قوت تو حاصل ہو گئی۔ اگر پاکستان نہ بنتا تو ہندوستان میں بسنے

والے کسی ایک مسلمان کے لئے بھی اس امکان کی گنجائش نہ ہوتی۔ لہٰذا اُس حالت کے مقابلے میں موجودہ حالت، بہر حال بہتر ہے۔

سوال ۷: اگر آپ اس سے متفق ہیں کہ اسلام پر صحیح معنوں میں عمل اپنی آزاد مملکت ہی میں ہو سکتا ہے، تو مسلمان کے لئے اسلامی زندگی بسر کرنے کی خاطر اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ جہاں رہتے ہوں، وہاں اپنی آزاد حکومت قائم کریں اور اگر اس کا امکان نہ ہو اور کسی دوسری جگہ اسلامی حکومت قائم ہو یا وہاں ایسی حکومت قائم کرنے کے امکانات زیادہ روشن ہوں، تو وہاں ہجرت کر جائیں۔ ہجرت مصیبتوں سے بچنے کے لئے فرار کی راہ نہیں۔ یہ دین کے پروگرام کا ایک ضروری جزو ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان کو بعض اوقات محض حصولِ امن کے لئے بھی نقلِ مکانی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن دین کے پروگرام میں ہجرت سے وہی مقصود ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ خود نبیٔ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ اس حقیقتِ کبریٰ کی شاہد ہے۔ مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں آپؐ کی یہی کوشش تھی کہ وہاں دین کا نظام قائم ہو سکے۔ لیکن جب دیکھا گیا کہ وہاں کی نسبت مدینہ میں اس کے امکانات زیادہ ہیں، تو آپ اپنی جماعت کے ساتھ وہاں تشریف لے گئے اور اسلام کی آزاد مملکت قائم کی۔

جب حالات ایسے مساعد ہو جائیں تو جو لوگ اپنے وطن میں (غیر مسلموں کی حکومت کے تابع) اطمینان سے بیٹھے رہیں اور ہجرت کر کے اسلامی مملکت کی طرف نہ آجائیں، ان کے متعلق سخت وعید آئی ہے۔ سورہ نساء میں دیکھئے۔ کہا گیا ہے کہ ایسے لوگوں سے ان کی موت کے وقت ملائکہ پوچھیں گے۔ کہ تمہیں کیا ہو گیا تھا کہ تم غیر اسلامی نظام کے تابع زندگی بسر کرتے رہے۔ وہ کہیں گے کہ کُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ۔ ہم کیا کرتے۔ ہم بہت بے بس تھے۔ اسلئے غیر مسلموں کے تابع زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔ وہ کہیں گے۔ اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا؟ کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم ہجرت کر کے دوسری جگہ چلے جاتے۔ اس کے بعد ہے۔ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (۴/۹۷) - پس ان کا ٹھکانہ جہنم ہو گا اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔ اس سے اگلی آیت میں صرف ان لوگوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے جو غیر اسلامی ملک میں اس طرح گھر چکے ہوں کہ انہیں وہاں سے نکلنے کی راہ ہی نہ مل سکے (۴/۹۸) اس قسم کے لوگوں کی مدد کے لئے پہنچنا اور عندالضرورت اس کے لئے جنگ کے لئے آمادہ ہو جانا آزاد مسلمانوں پر فرض قرار دیا گیا ہے (۴/۷۵) ان کے برعکس، جو لوگ ہجرت کا امکان رکھنے کے باوجود وہاں اطمینان

سے بیٹھے رہیں، ان کے متعلق آزاد مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا (۸/۷۲) جو لوگ ایمان لے آئے ہوں لیکن وہ ہجرت نہ کریں تو تم پر ان کی حمایت وحفاظت کی ذمہ داری نہیں تاآنکہ وہ ہجرت نہ کریں۔ ہاں اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے مدد طلب کریں۔ یعنی وہاں دین کا نظام قائم کرنے کے لئے یا وہاں سے ہجرت کرنے کے لئے، تو پھر ان کی مدد کی جائے گی اُن معاہدات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جو تم نے اس قوم سے کئے ہوں جن کے خلاف وہ تم سے مدد طلب کریں (۸/۷۲)۔ اس طرح امکان کے باوجود ہجرت نہ کرنے والوں کے متعلق یہاں تک کہہ دیا کہ فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط ان سے دوستی کے تعلقات مت وابستہ کرو تاآنکہ وہ خدا کی راہ میں ہجرت نہ کریں اور اس کے بعد ہے کہ اگر وہ اس کے بعد اس سے پھر جائیں تو ان سے جنگ کرو۔ (۴/۸۹)

آپ نے غور فرمایا کہ کسی علاقہ میں اسلامی زندگی بسر کرنے کے امکان کی موجودگی میں جو مسلمان غیر مسلموں کی حکومت میں زندگی بسر کر رہے ہیں، ان کے متعلق قرآن کا فیصلہ کیا ہے! اگر غیر مسلموں کے تابع رہنا اتباعِ اسلام کے راستے میں مارنع نہ ہوتا تو ان کے متعلق یہ کچھ کیوں کہا جاتا؟ پھر سُن لیجئے کہ یہ سب کچھ مسلمانوں (اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا) کے متعلق کہا جا رہا ہے۔

اِس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت اُن مستضعفین (بے بسوں) کی سی ہے جن کا ذکر (۴/۹۸) میں کیا گیا ہے۔ یعنی ایسے بے بس لوگ جو نہ تو وہاں دین کے مطابق زندگی بسر کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ ہی ان کے وہاں سے نکلنے کی کوئی صورت ہے لیکن جب ہمارے لئے وہاں سے نکل کر ایک آزاد (اسلامی) مملکت کی تشکیل کا امکان تھا تو اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانا اور ہندوستان میں یہ کہہ کر بیٹھے رہنا کہ یہاں بھی اسلام کے مطابق زندگی بسر ہو سکتی ہے، ہمیں اس وعید کا مستوجب بنا دیتا جس کا ذکر اوپر کی آیات میں آیا ہے۔

سوال ۸ (و، ب، ج)۔ یہ ٹھیک ہے کہ اتنا اور سمجھ لینا ضروری ہے سوال صرف چور کے ہاتھ کاٹنے کا نہیں، غیر اسلامی مملکت میں اسلامی نظام قائم ہی نہیں ہو سکتا۔

سوال ۸ (د) اگر آپ کے نزدیک "اشاعتِ اسلام" سے مراد فقط اس قدر ہے کہ کسی غیر مسلم کو کلمہ پڑھا دیا، اسے نماز روزہ کے احکام بتا دیئے اور اس کے بعد اس سے کہہ دیا کہ تم ان ارکان پر عمل کرنے کے

بعد ایک غیر مسلم مملکت میں سچّے اور پکّے مسلمان کی زندگی بسر کر سکتے ہو تو پھر آپ کا اعتراض صحیح ہے۔ دنیا کے "مذاہب" اپنی اشاعت کے لئے اتنا ہی چاہتے ہیں۔ لیکن اسلام، مذہب نہیں، یہ دین ہے اور دین نظامِ زندگی کو کہتے ہیں جس کا قیام ایک آزاد مملکت ہی میں ممکن ہے۔ لہٰذا، اشاعتِ اسلام سے مفہوم ہوگا لوگوں کو اس نظامِ زندگی کی طرف دعوت دینا۔ جو لوگ اس نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے پر بطیبِ خاطر آمادہ ہونگے، وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہونگے۔ اگر وہاں کا نظام غیر اسلامی ہے تو ان کی کوشش یہ ہوگی کہ وہ اس نظام کو اسلامی نظام میں بدل دیں، اور اگر ان کے لئے ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو وہ کسی ایسے علاقے کی طرف منتقل ہو کر آجائیں جہاں اسلامی نظام قائم ہو چکا ہو، یا جس جگہ اس کے قائم کرنے کے امکانات زیادہ وسیع ہوں۔ اگر کسی جگہ اسلامی نظام قائم ہے تو وہاں کے مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ اُن مسلمانوں کی وہاں سے نقلِ مکانی کے سلسلے میں امداد کریں۔

غیر مسلموں کے علاقہ میں اسلام کی اشاعت مسلم مبلّغین کے ذریعہ ہوگی۔ لیکن اس کا موثر ترین ذریعہ اسلامی نظام کے درخشندہ اور خوشگوار نتائج ہونگے جو کسی علاقہ میں قائم ہو چکا ہو ایسے انسانیت ساز نظام کی طرف دنیا خود بخود کھنچ کر آئے گی۔ (یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا) [۱۱۰/۲]

سوال ۸ (ذ) اس کا جواب اوپر آچکا ہے۔

سوال ۸ (ر) مسلمانوں کے لئے غیر مسلم حکومت کے تابع "ذمیوں" کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کے لئے قرآن میں کوئی خاص احکامات نہیں آئے۔ اس لئے کہ (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) وہاں انسان کی زندگی یا تو اسلامی نظام کے قیام کے لئے تمہید کی زندگی ہے اور یا مستضعفین (بے بسی) کی اضطراری زندگی، نبیٔ اکرمؐ اور جماعتِ مومنین کی مکّی زندگی کے متعلق جو کچھ قرآنِ کریم میں آیا ہے، اس سے اس باب میں راہ نمائی مل سکتی ہے، یا مثلاً حضرت موسیٰؑ کی زیرِ تربیت مصر میں بنی اسرائیل کی زندگی کے متعلق جو کچھ قرآنِ کریم میں مذکور ہے، اس سے۔

سوال ۸ (ل) اس کا جواب پہلے آچکا ہے۔

سوال ۸ (م) اشاعتِ اسلام بزورِ شمشیر کا تصور ہی غیر اسلامی ہے۔ ایمان نام ہے وحی کی صداقتوں کو دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ تسلیم کرنے کا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایسا ایمان جور دکراہ سے لایا ہی نہیں جا سکتا۔ ہماری تاریخ کے صحیح اسلامی دور میں اسلام بزورِ شمشیر نہیں پھیلا تھا، یہ پھیلا تھا اسلامی نظام کے درخشندہ نتائج کی کشش سے۔

البتہ اس نظام میں مظلوموں کی مدد کے لئے بعض اوقات قوّت کی ضرورت بھی لاحق ہو سکتی ہے۔ شمشیر کا استعمال ایسے مواقع کے لئے ہے۔

جو لوگ کسی غیر مسلم علاقہ میں اسلام قبول کر لیں گے وہ وہاں کس طرح زندگی بسر کریں گے، اس کے متعلق پہلے تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ واضح رہے کہ اسلام کا نباہ (یعنی مفاہمت) نہ عہدِ حاضر کی جمہوریت سے ہو سکتا ہے نہ آمریت سے۔ اس کا اپنا نظام ہے جو کسی دوسرے نظام کے ساتھ پیوند سازی نہیں کر سکتا۔

اس مقام پر ایک سوال اور بھی پیدا ہوتا ہے جس کا جواب ضروری ہے اور وہ یہ کہ اس وقت دنیا میں کہیں بھی اسلامی نظام قائم نہیں۔ اندریں حالات موجودہ مسلمانوں کے متعلق کیا کیا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس خود فریبی سے نکالا جائے جس میں وہ عرصۂ دراز کی غیر اسلامی تعلیم کی وجہ سے مبتلا چلے آرہے ہیں کہ غیر اسلامی نظام میں ــــ خواہ وہ غیر مسلموں کے ملک میں ہو یا مسلمانوں کے ملک میں، اسلامی زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔ انہیں بتایا جائے کہ اسلامی زندگی کسے کہتے ہیں اور اس کے لئے اسلامی نظام کا ہونا کس قدر لاینفک ہے۔ اس طرح اس امر کا امکان ہے کہ کسی علاقے میں صحیح اسلامی نظام قائم ہو جائے جب وہ نظام کسی ایک جگہ بھی قائم ہو گیا تو اس کے نتائج مسلم ممالک اور غیر مسلم ممالک (دونوں) میں بسنے والے مسلمانوں کے مسائل کا حل پیش کر دیں گے۔ اس ضمن میں اتنا اور سمجھ لینا چاہیئے کہ جو لوگ غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرتے ہوئے اپنے آپ کو پکّے اور سچّے مسلمان اور دوسروں کو خام قسم کے مسلمان سمجھتے ہیں وہ بھی خود فریبی میں مبتلا ہیں ــــ حقیقت شناس وہ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ غیر اسلامی نظام میں اسلامی زندگی بسر نہیں ہو سکتی اور پھر اس فکر کو عام کرتے ہیں کہ ملک میں اسلامی نظام قائم ہو سکے۔ جو لوگ بحالاتِ موجودہ (جب کہ دنیا میں کہیں بھی اسلامی نظام قائم نہیں جہاں وہ ہجرت کر کے چلے جائیں) غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں ــــ یعنی وہ اس زندگی کو اسلامی زندگی سمجھ کر اپنے آپ کو فریب نہیں دیتے بلکہ جانتے ہیں کہ اس کے سوا سرِ دست چارہ نہیں اور فضا میں اس فکر کو عام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ان مستضعفین کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں جنہیں قرآن نے معذور قرار دیا ہے ــــ قفس کو آشیاں سمجھ کر اس میں اطمینان سے بیٹھے رہنا اور بات ہے اور اس زندگی کے خلاف دل میں تڑپ اور خلش کا زندہ رکھنا اور، اسلامی نظام کی فضا میں بال فشا ہونے کی کوشش کرتے ہوئے دن بسر کرنا اور بات لیکن اس قسم کی آرزو اور فکر رکھنے والوں کو بھی یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم صحیح اسلامی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ باقی رہیں کسی شخص کی انفرادی اچھائیاں، سو وہ تو غیر مسلموں میں بھی مل سکتی ہیں۔

ہندو کیا ہے؟

طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۶۸ء میں خطابِ عام

صدرِ محترم و عزیزانِ گرامی قدر!

ہماری نئی نسل، جو یا تو تقسیمِ ہند کے وقت جھولوں میں تھی، اور یا اس کی پیدائش تشکیلِ پاکستان کے بعد ہوئی، اس اعتبار سے تو ایک گونہ خوش قسمت ہے کہ اسے ہندو کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں پڑا، لیکن یہی چیز قوم کے حق میں بڑی مضرّت رساں ہے کہ اس نژادِ نو کو معلوم ہی نہیں کہ ہندو کیا ہے؟ اس باب میں خود ہماری حکومتوں نے بھی جو مجرمانہ تغافل برتا، فطرت کبھی اسے معاف نہیں کرے گی۔ انہوں نے نہ تو، ان نوجوانوں کی تعلیم کا کوئی ایسا انتظام کیا جس سے وہ اس حقیقت کو سمجھ لیتے کہ ایک الگ مملکت کا وجود کس طرح ہمارے دین کا بنیادی تقاضا تھا ــــ یعنی اپنی آزاد مملکت کے بغیر ہم اس قابل ہی نہیں ہو سکتے تھے کہ اسلام کے مطابق زندگی بسر کر سکیں ــــ اور نہ ہی کوئی ایسی تاریخ مرتب کی گئی جس سے، ان نوجوانوں کو کم از کم اتنا ہی معلوم ہو جاتا کہ ہندو کیا ہے اور کوئی شریف انسان اس کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی تاریخ مرتّب کرنے سے ہمارا مقصود یہ نہیں کہ ہم اپنے نوجوانوں کے دل میں ہندو کی طرف سے خواہ مخواہ جذبۂ نفرت اُبھارنا چاہتے ہیں۔ اِس سے مقصد یہ ہے کہ ہندو ان کے سامنے بے نقاب ہو کر آجائے تاکہ یہ اُسے، اپنے جیسا انسان سمجھ کر

اس کے دامِ فریب میں نہ آجائیں۔ غالب نے ایک جگہ کہا ہے کہ

فغانِ من دلِ خلق آب کرد، ورنہ ہنوز
نہ گفتہ ام کہ مرا کار با فلاں افتاد

یعنی یہ بتانے کے لئے کہ ہم جو اس قدر واویلا مچا رہے ہیں، سیاسی پراپیگنڈہ نہیں، بلکہ ایک حقیقت ہے، یہ ضروری ہے کہ لوگوں کو بتایا جائے کہ ہمارا معاملہ کس کے ساتھ پڑا ہے۔ اصل یہ ہے کہ معاملہ پڑے بغیر انسان

جس سے معاملہ پڑے

دوسرے کے متعلق صحیح اندازہ لگا ہی نہیں سکتا۔ حضرت عمرؓ کے سامنے جب ایک شخص نے، کسی دوسرے کے متعلق کہا کہ وہ بڑا نیک اور شریف آدمی ہے تو آپ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم اس کے پڑوس میں رہے ہو۔ اس نے کہا کہ نہیں۔ پھر آپ نے پوچھا کہ کیا تم نے اس کے ساتھ کوئی کاروبار کیا ہے۔ اس نے کہا کہ نہیں۔ پھر پوچھا کہ کیا تم نے اس کے ساتھ کبھی سفر کیا ہے جب اس نے اس پر بھی کہا کہ نہیں، تو آپ نے ڈانٹ کر کہا کہ پھر تم نے اسے مسجد میں سر اٹھاتے اور سر جھکاتے دیکھا ہوگا اور اس سے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ بڑا نیک اور شریف انسان ہے۔ یہ اسی وقت کہو کہ جب تمہارا اس کے ساتھ کوئی معاملہ پڑے اور پھر وہ نیک اور شریف انسان ثابت ہو۔ ہماری دشواری یہ ہے کہ ہماری نئی نسل کو ہندو کے ساتھ کبھی واسطہ نہیں پڑا ــــــ اور خدا کرے کہ کبھی ایسا نہ ہو ــــــ اور نہ ہی ہم نے جنہیں اس کے ساتھ مدتوں واسطہ پڑتا رہا، انہیں یہ بتانے کی زحمت گوارا کی ہے کہ ہندو کیا ہے؟ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ہم ہندوستان میں اچھے بھلے بستے رہتے تھے۔ ان سے الگ ہو کر ہم نے خواہ مخواہ ایک مستقل خطرہ مول لے لیا۔ اس کی ضرورت کیا تھی؟ وہ ایسا سمجھنے اور کہنے میں سچے ہیں۔ حیوانات کے لئے آسانی یہ ہے کہ وہاں ہر نوع کی شکل و صورت جداگانہ ہوتی ہے جس سے انہیں ایک دوسرے کی پہچان میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ کسی بکری کو اس میں مغالطہ نہیں لگ سکتا کہ سامنے سے جو جانور آرہا ہے وہ درندہ شیر

انسان فریب میں آسکتا ہے

ہے یا بے ضرر ہرن۔ لیکن انسانوں کے معاملہ میں صورت یہ نہیں۔ یہاں انسانی پیکر سب ایک جیسے ہوتے ہیں، اسلئے اس باب میں تمیز کرنا بہت مشکل ہے کہ ہمارے ساتھ جو دوسرا انسان کھڑا ہے وہ رہزن ہے یا راہنما۔ ہندوؤں کی شکل و صورت چونکہ انسانوں ہی جیسی ہے اس لئے ہمارے نوجوان انہیں انسان ہی سمجھتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ جنہیں وہ (محض پیکروں کے دھوکے میں) انسان سمجھتے ہیں وہ درحقیقت کیسے کیسے خونخوار درندے، مہیب نہنگ واژدہا مکار

لومڑیاں ہیں۔ ان نوجوانوں کے سامنے ہندو کی ایک خفیف سی جھلک، ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران آئی تھی لیکن ایک تو وہ حادثہ ہی، برق کی چمک یا شرارے کی چمک سے زیادہ دیرپا نہ تھا، دوسرے ہم نے ابھی تک اس کی کبھی کوئی صحیح اور مکمل تصویر ان کے سامنے آویزاں نہیں کی، اس لئے وہ خفیف سی جھلک بھی ان کے آئینہ ذہن سے محو ہوتی چلی جارہی ہے۔ میں آج کی نشست میں، اس بھیروں ماتا، اس کالی دیوی کے چند ایک روپ آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں — چند ایک اس لئے کہ اس کی مکمل تصویر کھینچنے کے لئے، کئی ایک مجلدات کی ضرورت ہے — سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے — میرا خیال ہے کہ انہی چند ایک جھلکیوں سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارا معاملہ کس کے ساتھ پڑا تھا۔

ہندو اصولِ سیاست

ہندوؤں کی ساری تاریخ میں — اگر اس بھان متی کے پٹارے کو تاریخ کہا جاسکے — صرف ایک سیاسی فلاسفر پیدا ہوا ہے۔ نام تو اس کا چانکیہ تھا، لیکن وہ اپنے آپ کو نہایت فخر سے کوٹلیا کہتا تھا اور ہندو بھی اسے اسی لقب سے پکارتے ہیں۔ کوٹلیا کے معنی ہیں مکّار اور فریب کار۔ اس لقب سے ہی آپ اندازہ لگا لیجئے کہ یہ ذاتِ شریف تھے کیا؟

قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

انہوں نے اصولِ سیاست پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے ارتھ شاستر — چونکہ یہ کتاب سنسکرت میں تھی جس کی وجہ سے ہندو جاتی، اس میں درج شدہ اصولوں سے فیضیاب نہیں ہو سکتی تھی، اس لئے اب اس کا انگریزی ترجمہ شائع کردیا گیا ہے۔ اس میں سیاست کے جو اصول بطور ضابطۂ ہدایت دیئے گئے ہیں، وہ قابلِ غور ہیں۔ انہیں ذرا توجہ سے سُنیئے گا۔

پہلا اصول — حصولِ اقتدار اور ملک گیری کی ہوس کبھی ٹھنڈی نہ ہونے پائے۔

دوسرا اصول — ہمسایہ سلطنتوں سے وہی سلوک روا رکھا جائے جو دشمنوں سے رکھا جاتا ہے۔

تمام ہمسایوں پر ہمیشہ کڑی نگرانی رکھی جائے۔

تیسرا اصول — غیر ہمسایہ سلطنتوں سے دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں۔

چوتھا اصول — جن سے دوستی رکھی جائے، ان سے دوستی میں ہمیشہ اپنی غرض پیشِ نظر رہے اور

مکارانہ سیاست کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔

پانچواں اصول ـــــ دل میں ہمیشہ رقابت کی آگ مشتعل رکھی جائے۔ ہر بہانہ سے جنگ کی چنگاریاں سلگائی جاتی رہیں۔ جنگ میں انتہائی تشدد سے کام لیا جائے حتیٰ کہ خود اپنے شہریوں کے مصائب و آلام کی بھی پروانہ کی جائے۔

چھٹا اصول ـــــ دوسرے ملکوں میں مخالفانہ پراپیگنڈہ، تخریبی کارروائیاں، ذہنی انتشار پیدا کرنے کی مہم جاری رکھی جائے۔ وہاں اپنے آدمی ناجائز طریقہ سے داخل کر کے ففتھ کالم بنایا جائے اور یہ سب کچھ مسلسل انداز سے کیا جائے۔

ساتواں اصول ـــــ رشوت اور دیگر اسی قسم کے ذرائع سے اقتصادی جنگ جاری رکھی جائے اور دوسرے ملکوں کے آدمیوں کو خریدنے کی کوشش کی جائے۔

آٹھواں اصول ـــــ امن کے قیام کا خیال تک بھی دل میں نہ لایا جائے خواہ ساری دنیا تمہیں اس پر مجبور کیوں نہ کرے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں، سیاست کے وہ اصول جو ان کے ایک مہاتما نے انہیں دیئے۔ یہ مہاتما، ان کے ست جگ کے زمانے کی پیداوار تھے ـــــ یعنی وہ زمانہ جس میں (ان کے عقیدے کے مطابق، بھارت میں) سچائی کا دور دورہ تھا۔ اس کے بعد، کل جگ میں ایک اور مہاتما پیدا ہوئے، جنہیں گاندھی جی کہا جاتا ہے۔ انہیں سچائی کا مجسمہ اور اہنسا (عدم تشدد) کا اوتار کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ان مہاتما جی کی کیفیت کیا تھی،

گاندھی جی

اس کے متعلق قائدِ اعظمؒ کی زبان سے سنیئے جنہیں ان کے ساتھ رات دن واسطہ پڑتا تھا۔ قائدِ اعظمؒ نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن (جالندھر) کے اجلاس (منعقدہ ۱۹۴۲ء) میں پبلک پلیٹ فارم سے کہا تھا کہ

(مشکل یہ ہے کہ) گاندھی جی کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں اور جو ان کا درحقیقت مقصد ہوتا ہے، اُسے کبھی زبان پر نہیں لاتے۔

اسی طرح انہوں نے اگست ۱۹۴۵ء میں، ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

ہمیں جس حریف سے پالا پڑا ہے وہ گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ جب ان کے (یعنی مہاتما گاندھی کے) مفید مطلب ہوتا ہے وہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ کسی کے نمائندہ نہیں، وہ محض انفرادی حیثیت سے گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ کانگریس کے چار آنہ کے ممبر بھی نہیں۔ اور جب ضرورت ہوتی ہے

تو سارے ہندوستان کے واحد نمائندہ بن جاتے ہیں۔ جب اور حربوں سے کام نہیں چلتا تو مرن بھرت رکھ لیتے ہیں۔ جب کوئی دلیل بن نہیں پڑتی تو "اندرونی آواز" کو بدل لیتے ہیں کہیئے کہ ایسے شخص سے ہم کس طرح بات کر سکتے ہیں۔ وہ تو ایک چیستان ہیں — معمہ ہیں!

ان کی "مہاآتمیت" کا یہ عالم تھا کہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران، جب انگلستان پر دن رات بمباری ہو رہی تھی اور جاپانی کلکتہ تک بڑھ آئے تھے، وہ وائسرائے کے ہاں گئے اور کہا کہ جب میں لندن پر بمباری کی خبریں پڑھتا ہوں اور وہاں کے نوجوانوں۔ بوڑھوں، بچوں، عورتوں پر جو کچھ گذرتی ہے" اسے سنتا ہوں تو میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی۔ ایسے نازک حالات میں، میں انگریزوں کے لئے ہندوستان میں کسی پریشانی کا موجب نہیں بننا چاہتا — میں تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر، جنگ کے سلسلہ میں، بلامشروط تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔ یہ کہتے کہتے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے وائسرائے بہت متأثر ہوئے اور ان کی ہمدردی اور تعاون کا شکریہ ادا کیا۔

مہاتما جی نے اُدھر یہ کیا اور اِدھر کانگریس کی مجلس عاملہ سے ریزولیوشن پاس کرا دیا کہ اگر حکومت، ملک کے اختیارات، کانگریس کی طرف منتقل کرنے کا وعدہ نہیں کرتی تو ہم ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے یہاں کے نظم و نسق کو تہ و بالا کر کے رکھ دیں گے۔ انگریزوں کو یہاں سے نکال باہر کریں گے۔ اور جب وائسرائے نے گاندھی جی سے پوچھا کہ یہ کیا، تو انہوں نے نہائت معصومیت سے فرمایا کہ میرا کانگریس پر کیا اختیار ہے۔ میں تو اس کا چار آنے کا ممبر بھی نہیں۔

اہمسا کا اوتار

مہاتما گاندھی اپنے آپ کو اہمسا کا اوتار کہا کرتے تھے۔ اہمسا کے معنی یہ ہیں کہ خواہ کچھ بھی ہو، کسی کے خلاف تشدّد کا استعمال نہ کیا جائے۔ انجیل کی — ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے کر دینے کی — تعلیم پر عمل کیا جائے لیکن انہی مہاتما جی کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۳۹ء کے اواخر کی بات ہے، سندھ میں مسجد منزل گاہ کے سلسلہ میں ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں پر بے حد مظالم ہوئے۔ ہندوؤں نے یہ سب کچھ بھی کیا اور کوٹلیا کے اصولِ سیاست کے مطابق مہاتما جی کو تار دے دیا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں ہمارا کچھ بھی محفوظ نہیں۔ مہاتما جی نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ، نہ کسی تحقیق کی ضرورت سمجھی نہ تفتیش کی — اپنے اخبار میں لکھ دیا کہ

> اہمسا ایک دن میں نہیں سیکھا جاتا۔ دوسرا طریق وہ ہے جسے دنیا برتتی چلی آ رہی ہے یعنی جان و مال کی

حفاظت ہتھیاروں کے ذریعے کی جائے۔ سندھیوں کو چاہیئے کہ لٹیروں اور حملہ آوروں سے اپنی حفاظت کا ڈھنگ سیکھیں۔ (ہریجن، بابت ۱۲/۳۹، ۱۲)

یہی مہاتما جی ہیں جنہوں نے جنگ کے دوران انگریزوں سے کہا تھا کہ ہٹلر کا مقابلہ ہتھیاروں سے نہ کرو، اہنسا کے ذریعہ کرو۔ اور سرحدی گاندھی عبد الغفار کو اپدیش دیا تھا کہ پٹھانوں سے چاقو چھین لو تا کہ اہنسا میں ذرا سی ہنسا کی لاگ نہ رہے۔ اور دوسری طرف کلکتہ کی ہندو عورتوں سے تاکیداً کہا جاتا تھا کہ اپنے پاس پستول اور بندوق رکھو اور فائر کرنا سیکھو۔ گاندھی جی بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ

میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیونکہ میں ویدوں، اُپ نشدوں، پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں۔ اوتاروں کا قائل ہوں اور تناسخ کے عقیدہ پر یقین رکھتا ہوں۔ میں گاؤ رکھشا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہوں اور بُت پرستی سے انکار نہیں کرتا۔ میرے جسم کا رواں رواں ہندو ہے۔

(ینگ انڈیا، ۱/۲۱، ۱۲)

جو گاؤ رکھشا ان کے دھرم کا جزو تھی، اس کے متعلق انہوں نے ۱۹۱۸ء میں کہا تھا کہ

یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ یوروپین کے لئے گاؤ کشی جاری رکھنے کی بابت ہندو کچھ بھی محسوس نہیں کرتے۔ میں جانتا ہوں کہ ان کا غصہ اس خوف کے نیچے دب رہا ہے جو انگریزی عملداری نے پیدا کر دیا ہے مگر ایک ہندو بھی، ہندوستان کے طول و عرض میں ایسا نہیں جو ایک دن اپنی سرزمین کو گاؤ کشی سے آزاد کرانے کی اُمید نہ رکھتا ہو۔ ہندو مت، عیسائی یا مسلمانوں کو تلوار کے زور سے بھی مجبور کرنے سے تامل نہیں کریگا کہ وہ گاؤ کشی کو بند کر دیں۔ (الفضل، ۳/۱۸، ۹، بحوالہ اسٹیٹس مین)

یہ تھی سچائی کے اوتار اور اہنسا کے دیوتا گاندھی جی کی کیفیت۔ گاندھی جی کیا تھے اس کے متعلق قائدِ اعظمؒ نے ایک فقرہ میں وہ کچھ کہہ دیا تھا جس کے لئے کتابوں .... کی کتابیں بھی کافی نہیں ہو سکتیں۔ بات یوں ہوئی کہ ایک دن گاندھی جی شنوگرام آشرم میں، اپنی کٹیا میں بیٹھے پرارتھنا میں محو تھے کہ ایک کونے سے ایک سانپ آگھسا۔ مہاتما جی خاموشی سے پرارتھنا میں مصروف رہے۔ اس نے کٹیا کا چکر کاٹا اور آہستہ سے باہر چلا گیا۔ ہندو اخبارات نے اسے مہاتما جی کی کرامت قرار دے کر بہت اُچھالا۔ صبح کو یہ خبریں اخبارات میں شائع ہوئیں تو ایک اخبار کا رپورٹر قائدِ اعظمؒ کے پاس گیا اور اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد، ان سے پوچھا کہ آپ کا اس کے متعلق کیا خیال ہے۔ قائدِ اعظمؒ نے سر ہلایا اور نہایت سنجیدگی سے کہا کہ

(YES; PROFESSIONAL ETIQUETTE)

یہ وہ ریمارکس ہیں جن کا بس لطف لیا جا سکتا ہے۔ سمجھا یا نہیں جا سکتا۔

جس قوم کے "مہاتما" ایسے ہوں، اس کے عام افراد جس سیرت وکردار کے مالک ہو سکتے ہیں، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مسٹر سری پرکاش پاکستان میں، بھارت کے پہلے ہائی کمشنر تھے۔ انہوں نے ۱۳ نومبر ۱۹۴۸ء کی شام، تھیاسوفیکل ہال کراچی، میں ایک تقریر کی تھی جس کا عنوان تھا "ہندومت ایک ضابطۂ اخلاق کی حیثیت سے"۔ اس تقریر میں انہوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ ہندومت کوئی مستقل اخلاقی ضابطہ متعین کرتا ہے جس پر سوسائٹی کی بنیاد رکھی جا سکے، وہ ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ ہندومت، انسانی زندگی کے لئے کوئی غیر متبدل اصول اقدار پیش نہیں کرتا بلکہ وہ ہر موقع اور ہر مقام کے لحاظ سے، مختلف اصول وضع کرتا ہے جو ایک دوسرے سے یکسر متضاد ہو سکتے ہیں مثلاً وہ سوسائٹی کے ایک طبقہ (براہمنوں) کو اہنسا (عدم تشدد) کی تعلیم دیتا ہے تو دوسرے طبقہ (کھشتریوں) کو قتل وخونریزی سکھاتا ہے۔ یا مثلاً وہ پنڈتوں سے کہتا ہے کہ سچ بولو لیکن ویش (تجارت پیشہ لوگوں) کو کبھی اس کا پابند نہیں ٹھہراتا کیونکہ وہ کہتا ہے کہ سچ بولنے سے تجارت میں نقصان ہوتا ہے اس لئے وہ انہیں جھوٹ بولنے کی اجازت دیتا ہے۔ مختصر اًیہ کہ وہ ایک قسم کے حالات میں سچ اور دیانت کی تاکید کرتا ہے تو دوسری قسم کے حالات میں جھوٹ اور فریب کو جائز قرار دیتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ

ہندومت کا ضابطۂ اخلاق

کسی کو یہ بات پسند آئے یا نہ آئے، لیکن یہ حقیقت ہے جس کا کھلے بندوں اعتراف کرنا چاہیئے کہ ہندومت میں کوئی اصولِ زندگی قطعی (ABSOLUTE) نہیں۔ ہر مصلحت کے لئے اس کا الگ اصول ہے۔ ہندومت ایک عملی مذہب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر موقع پر دیانت اور سچائی سے کام نہیں چل سکتا۔ اس لئے وہ کبھی ایسی تعلیم نہیں دیتا جو ناممکن العمل ہو[1]۔ یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر ہندومت ہزارہا سال سے مختلف حالات اور متبائن ماحول میں زندہ رہا ہے اور زندہ رہے گا۔

(طلوعِ اسلام، بابت دسمبر ۱۹۴۸ء)

---

[1] یہی تعلیم پاکستان میں مودودی صاحب دیتے ہیں۔

لال بہادر شاستری

یہی ہے وہ ہندو دھرم، جس کے سب سے بڑے عالم[2] اور ہندوستان کے وزیرِ اعظم، مسٹر لال بہادر شاستری نے، جنوری ۱۹۶۵ء میں، بنارس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

ملک میں لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے لیکن غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا یہ رویّہ، ہماری روایات کے مطابق ہوگا؟ ہمارے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک تو یہی راستہ ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے اور دوسرا راستہ امن و خوشحالی کا ہے جو قوم کے باپو، مہاتما گاندھی نے ہمیں سکھایا ہے۔ امن اور عدمِ تشدّد کا جو راستہ ہمیں گاندھی جی نے سکھایا ہے وہ نہ صرف فطری طور پر مناسب ہے بلکہ عملی نقطۂ نگاہ سے بھی مفید ہے۔ جب ہم پوری دنیا میں امن و صلح کی تبلیغ کرتے ہیں تو ہم کس طرح دوسرا راستہ اختیار کر سکتے ہیں! (اخبار مدینہ، بجنور، یکم جنوری ۱۹۶۵ء

بحوالہ طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۶۵ء)

یہ کچھ انہوں نے پبلک پلیٹ فارم سے جنوری میں کہا اور اسی سال ستمبر میں، چوروں کی طرح، اکیس ڈویژن فوج، پاکستان کے سر پر لاکھڑی کر دی! سچ ہے، اُس قسم کے "باپو" کے اسی قسم کے سپوت ہونے چاہئیں! یہی تھے وہ شاستری جی، جن کی حکومت سے خود ہندوستان کے ہندو، تنگ آکر، چیخ اُٹھے تھے کہ

شاستری حکومت ایک سانپ ہے جس کے سینکڑوں منہ ہیں اور ہر منہ میں زبان الگ الگ بولی جاتی ہے اور ہم فانی انسان اس کا فیصلہ ہی نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کس کی بات سرکاری اعلان ہے اور کس کی نہیں۔ حسّاس طبائع نے اندازہ لگایا ہوگا کہ حکومت کا سربراہ ـــ مسٹر شاستری ـــ خود اس کائیں کائیں کا منجھا ہوا فنکار ہے۔

(نیوایج، بحوالہ ہندوستان ٹائمز ۱۴/۵ طلوعِ اسلام ستمبر ۱۹۶۶ء)

یہ ہے ہندو دھرم اور یہ ہیں اس دھرم کے پجاری ـ کوٹلیا سیاست کا امام ۔ مہاتما گاندھی، ستیا کے اوتار ۔ اور شاستری صاحب، اُس باپو کے نامور سپوت!

یہ ہے ہندو دیوتک کے مجسّمہ کا ایک روپ ۔ اب آگے بڑھیئے۔

---

[2] شاستری، بہت بڑے عالم کو کہتے ہیں جو شاستروں کا علم رکھتا ہو۔

مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اس دعویٰ پر تھی کہ اسلام کی رُو سے، ہندوستان میں بسنے والے مسلمان اپنے مذہب کی بنا پر (جسے دین کہا جاتا ہے) ایک الگ قوم ہیں اور وہ اپنے دین کے مطابق اسی صورت میں زندگی بسر کر سکتے ہیں جب ان کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں وہ قوانینِ خداوندی نافذ کر سکیں۔ یہ دعوےٰ مسلمانوں کا تھا جس کا تعلق ان کے "مذہب" سے تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں کسی غیر مسلم کو دخل دینے کا حق نہیں پہنچتا تھا لیکن دیکھئے کہ ہندوؤں کا اس باب میں رویہ کیا تھا۔

مذہب کے متعلق

پنڈت جواہر لال نہرو نے آل انڈیا نیشنل کانگریس منعقدہ مارچ ۱۹۳۷ء کے خطبۂ صدارت میں کہا کہ

> ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں۔
>
> (طلوعِ اسلام بابت جون ۱۹۳۸ء)

یہ تو رہا، دو قومی نظریہ کے متعلق خود مذہب کے متعلق انہوں نے اپنی کتاب "میری کہانی" میں لکھا۔

> جس چیز کو مذہب یا منظّم مذہب کہتے ہیں، اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے کی آرزو تک کی ہے۔ قریب قریب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا، بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بیجا فائدہ اٹھانے کا قائم شدہ حقوق اور مستقل حقوق کی بقاء کا حامی ہے۔
>
> (بحوالہ طلوعِ اسلام، جون ۱۹۳۸ء)

آپ کہیں گے کہ پنڈت جواہر لال نہرو، دہریہ تھے۔ اس لئے مذہب کے ——— متعلق ان کا یہ طرزِ عمل حق بجانب تھا۔ وہ سیکولر نظام کے حامی تھے ——— اس لئے ان کی اس مخالفت میں، اسلام کی خصوصیت نہیں۔ وہ تمام مذاہب کے مخالف تھے لیکن اول تو آپ نے اس اقتباس میں "منظّم مذہب" کی تخصیص پر غور نہیں فرمایا — منظّم مذہب — یعنی وہ مذہب جو مذہب کی بنیاد پر ایک جداگانہ تنظیم کا حامی ہے (جسے قوم کہا جاتا ہے) ہندو مت نہیں، اسلام ہے۔ دوسرے یہ کہ پنڈت جواہر لال نہرو ہندو مت کو سرے سے مذہب ہی قرار نہیں دیتے تھے۔ وہ اپنی کتاب — میری کہانی — میں دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

> ہندو مت کے دائرے میں بے حد مختلف اور متضاد خیالات و رسوم داخل ہیں۔ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندو مت پر صحیح معنوں میں مذہب کا اطلاق ہی نہیں ہوتا — ممکن ہے ایک شخص کھلم کھلا خدا کا منکر ہو

(جیسے قدیم فلسفی چارواک) لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص ہندو نہیں رہا۔ جو لوگ ہندو گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں وہ چاہے کتنی ہی کوشش کریں، ہندومت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں برہمن پیدا ہوا تھا اور برہمن ہی سمجھا جاتا ہوں، چاہے مذہبی اور سماجی رسموں کے متعلق میرے خیالات اور اعمال کچھ ہی ہوں۔

اب ظاہر ہے کہ جب پنڈت نہرو کے نزدیک، ہندومت کوئی مذہب ہی نہیں تھا، تو اسے مٹانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو اسلام تھا جو ان کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا اور جسے وہ مٹانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس کی تصریح، نہرو کے ہم مرتبہ ایک کانگریسی لیڈر مسٹر ولبھائی ڈیسائی نے ان الفاظ میں کر دی کہ:۔

اب یہ ناممکن ہوگا کہ کوئی ایسا نظام قائم کیا جائے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آچکا ہے کہ ہم اس امر کا اعتراف کر لیں اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رہنے دیا جائے۔

(ہندوستان ٹائمز، ۵ ۳۸ء، بحوالہ طلوع اسلام، اگست ۱۹۳۸ء)

قرآنی حکومت کے خلاف

اور اگر آپ اس سے بھی واضح تر الفاظ میں سننا چاہتے ہیں، تو وہ بھی سُن لیجئے۔ ۱۹۴۱ء میں، "اکھنڈ ہندوستان کانفرس" کا اجلاس لدھیانہ میں منعقدہ ہوا جس کی صدارت مسٹر منشی نے کی۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ تمہیں اس کا علم ہے کہ نظریۂ پاکستان کا مفہوم کیا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ

مسلمان اپنے لئے ایسے مساکن بنائیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے۔ اور جہاں اردو ان کی قومی زبان بن سکے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایسا خطۂ ارض ہوگا جس میں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ:۔

ہندو قوم خواہ کتنی ہی بزدل اور غیر منظم کیوں نہ ہو، وہ کبھی اسے برداشت نہیں کر سکتی کہ مسلمان اس قسم کی حکومت قائم کر لیں۔ اس حکومت میں ہندو قوم کے افراد شمشیر و سناں کا نشانہ بنائے جائیں گے۔ ان کی عورتوں کی عصمت دری اور ان کے مقدس مقامات کی بے حرمتی ہوگی۔

(بحوالہ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۴۱ء)

واضح رہے کہ یہ خیالات، ہندو قوم کے بازاری افراد کے نہیں تھے۔ یہ ان کے چوٹی کے لیڈروں کے خیالات

اور عزائم تھے اور ان کے بلند ترین اخبارات دن رات یہ کہتے رہتے تھے کہ

حکومتِ الٰہی کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور مسلمانوں کا یہ فعل عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں۔

(ہندوستان ٹائمز، ۱۱/۳۹-۴ ،بحوالہ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۳۹ء)

لیکن تماشا یہ ہے کہ ایک طرف مسلمانوں کے متعلق تو یہ کچھ کہا جا رہا تھا اور دوسری طرف ہندوؤں سے یہ کہا جاتا تھا کہ:۔

ہندوستان کو نظریہ اور عمل دونوں لحاظ سے ایک ہندو اسٹیٹ ہونا چاہیئے جس کا کلچر ہندو، جس کا مذہب ہندو اور جس کی حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہو۔

(طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۳۸ء)

یہ الفاظ ڈاکٹر رادھا مکرجی کے تھے جو ہندو مہا سبھا کے نائب صدر اور بنگال میں کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے۔ یہ الفاظ انہوں نے آل انڈیا ہندو ویدک یوتھ کانفرنس (لاہور) کے خطبۂ صدارت میں ارشاد فرمائے تھے۔ اور مسٹر ساورکر نے یہ کہہ کر سارا ٹنٹا ہی ختم کر دیا تھا کہ:۔

لفظ ہندو سے عبارت ہے ہر وہ شے جو ہندوستان کی ہو۔ مثلاً کلچر، نسل اور روایات وغیرہ اور ہندو کے معنی ہیں ہر وہ شخص جو ہندوستان کا رہنے والا ہو۔

(داسٹیٹسمین، ۲/۳۹-۲۰ ،بحوالہ طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۳۹ء)

آپ غالباً متعجب ہوں گے کہ اس باب میں گاندھی جی کا "ذکرِ خیر" آیا ہی نہیں۔ کیا وہ خاموش بیٹھے تھے؟ جی نہیں۔ گاندھی جی ایسے اہم معاملہ میں خاموش کیسے رہ سکتے تھے۔ لیکن ان کا بات کرنے کا اپنا انداز تھا۔ سُنیئے کہ اس دوران میں وہ کیا کرتے اور کیا کہتے تھے۔

گاندھی جی کا اُپدیش

مہاتما گاندھی نے، ۱۵ ستمبر ۱۹۴۴ء کو قائدِ اعظمؒ کے نام ایک خط میں لکھا تھا۔

میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباء و اجداد کا مذہب چھوڑ کر، ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور ان کی اولاد یہ دعوے کرے کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان، اسلام کی آمد سے پہلے، ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم رہنا چاہیئے، خواہ اُس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

پھر انہوں نے، اپنے اخبار، ہریجن کی ۹، فروری ۱۹۴۶ء کی اشاعت میں لکھا۔

> اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو بالکل الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم، میں اس کے لئے اپنی جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ، مذہب ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔

آپ کہیں گے کہ گاندھی جی سیکولر نظامِ حکومت کے قائل تھے اور سیکولر نظامِ حکومت کے قائل کو مذہب کے متعلق یہی عقیدہ رکھنا چاہیئے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا گاندھی جی واقعی سیکولر نظامِ حکومت کے قائل تھے؟ اس کا جواب ہم سے نہیں، اس خط کے الفاظ سے لیجئے جو قائدِاعظمؒ نے مسٹر گاندھی کو یکم جنوری ۱۹۴۰ء کو لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے (گاندھی جی سے) کہا تھا۔

> آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کے تعیّن میں مذہب کو کوئی دخل ہونا چاہیئے۔ لیکن جب خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ آپ کا زندگی میں مقصد کیا ہے۔ آپ کے نزدیک وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جو ہمیں کسی کام کے کرنے پر آمادہ کرتا ہے ___ کیا وہ جذبہ، وہ مقصد مذہبی ہے یا معاشرتی یا سیاسی ___ تو آپ نے کہا تھا کہ "خالص مذہبی"۔

یعنی اپنی سیاسی جدّوجہد کا جذبۂ محرکہ خالص مذہبی، اور دوسروں کو تلقین کہ وہ مذہب کو سیاست میں دخیلِ کار نہ ہونے دیں۔ یہی تھی گاندھی صاحب کی وہ دو رُخی پالیسی جس کے پیشِ نظر علاّمہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

نگہ دارد برہمن کارِ خود را نمی گوید بکس اسرارِ خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر بدوشِ خود بُرد زُنّارِ خود را

اور مسلمانوں کا یہ طعن کسی مفروضہ پر مبنی نہیں تھا، ایک حقیقت تھا۔ گاندھی جی اِدھر ان سے یہ کہہ رہے تھے کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھو۔ اور اُدھر، ہندوستان میں جس قسم کی سیاست کو رائج کرنا چاہتے تھے، اس کے متعلق کانگریس کے جنرل

ہندوستان کی حکومت

سیکرٹری، اچاریہ کرپلانی نے، اگست ۱۹۳۹ء میں، اپنے ایک طویل بیان میں کہا تھا کہ:۔

> گاندھی جی نے کانگریس کو بتایا کہ ہمارا کام صرف یہ نہیں کہ ملک کی سیاسی باگ ڈور انگریز کے ہاتھ سے چھین کر اہلِ ملک کے ہاتھ میں دے دیں۔ بلکہ یہ سب سے ضروری چیز ہے کہ ہم اپنی تمام جدّوجہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفۂ حیات پر رکھیں جس کے دائرہ میں ہماری معاشرت، اخلاق اور روحانیت‘ سب

کچھ داخل ہو۔ بالفاظِ دیگر، ہماری تحریک کو صرف سیاسی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اسے روحانی اور اعلیٰ فلسفۂ زندگی کے ماتحت ہونا چاہیئے۔ تاکہ اس جدّوجہد سے نہ صرف ہماری سیاسی زندگی متأثر ہو بلکہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ اس سے اثر پذیر ہو اور ہماری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو جسے ہم تاریخ کا نیا دور کہہ سکیں۔ زندگی کا یہی نیا باب اور نیا دور ہے جسے گاندھی جی کانگریس کے ذریعے، ہندوستان میں لانا چاہتے ہیں۔

واردھا اسکیم

گاندھی جی کو سب سے بڑا ڈر یہ کھائے جا رہا تھا کہ مسلمان بچوں کے دل میں یہ عقیدہ راسخ ہوتا ہے کہ اسلام باقی مذاہب کے مقابلہ میں افضل ہے۔ ان کی اسکیم یہ تھی کہ مسلمان بچوں کے دل سے اس خیال کو نکال دیا جائے تاکہ ان کے ذہن سے اپنے مذہب کی عظمت و اہمیت کا احساس مٹ جائے۔ اس کے لئے انہوں نے بھارت کے موجودہ[1] پردھان، ڈاکٹر ذاکر حسین خان کے مشورہ اور تعاون سے ہندوستانی بچوں کے لئے ایک مشترکہ تعلیم کی اسکیم مرتب کی (جو واردھا کی تعلیمی اسکیم کے نام سے مشہور ہوئی) اس اسکیم کا مقصد کیا تھا، اس کا اندازہ گاندھی جی کے اس وضاحتی بیان سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے اس سلسلہ میں اخبارات کو دیا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا کہ

> مختلف طبقات و مذاہب کے بچوں میں رواداری اور دوستی کی جو روح پیدا ہو رہی ہے میں، اس کے پیش نظر اس بات کو سخت مہلک اور خطرناک سمجھتا ہوں کہ ان کو یہ سکھایا جائے کہ ان کا مذہب، دیگر تمام مذاہب پر برتری رکھتا ہے، یا جس مذہب کے وہ قائل ہیں بس وہی سچا مذہب ہے۔
>
> (ہندوستان ٹائمز ۱۷؍ ۱۰؍ ۳۸ء بحوالہ طلوعِ اسلام ۱۹۳۸ء اگست)

(طلوعِ اسلام نے اس ملعون تعلیمی اسکیم کے خلاف کس قدر ملک گیر مہم چلائی اور کس طرح اسے، اور اس کے تحت مرتّب کردہ نصاب کی کتابوں کو غرقِ سمندر کرایا گیا، یہ ایک الگ داستان ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں)

مطالبۂ پاکستان کی مخالفت

لیکن جب، گاندھی جی اور ان کے چیلوں چانٹوں کی ان تمام سازشوں اور روباہ بازیوں کے باوجود، تحریک پاکستان آگے بڑھتی گئی، حتیٰ کہ مارچ ۱۹۴۰ء میں حصول پاکستان کا مشہور ریزولیوشن پاس ہو گیا تو گاندھی جی کے تن بدن میں آگ لگ گئی

---

[1] اب مرحوم ہو چکے ہیں (۱۹۷۲ء)

اور وہ کھل کر سامنے آ گئے۔ انہوں نے ۷ اپریل ۱۹۴۰ء کو اپنے ایک بیان میں کہا:۔

میں پوری جرأت اور جسارت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناح اور ان کے ہم خیال حضرات اپنی اس روش سے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے بلکہ وہ اس پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں جو لفظ اسلام کے اندر پوشیدہ ہے۔ مجھے یہ کچھ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آ رہی ہے کہ آجکل مسلم لیگ کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے اس سے میرے دل پر سخت ٹھیس لگ رہی ہے۔ میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کروں گا اگر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس دروغ بافی سے متنبہ نہ کر دوں گا جس کا اس نازک وقت میں ان میں پراپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔

(بحوالہ طلوعِ اسلام، جون ۱۹۴۰ء)

پھر انہوں نے، اسی سلسلہ مضامین کی دوسری قسط میں ۱۴ اپریل ۱۹۴۰ء کو لکھا:۔

میری روح اس امر کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندو مت دو مختلف اور متضاد کلچر اور نظریہ حیات ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مرادف ہے۔ میں اس نظریہ کے خلاف یقیناً بغاوت کرونگا کہ وہ لاکھوں مسلمان جو ابھی کل تک ہندو تھے، اسلام قبول کر کے اپنی قومیت بھی بدل بیٹھیں۔ (ایضاً)

پھر انہوں نے ۵ مئی ۱۹۴۰ء کو لکھا کہ

میں ایک تنگ نظر ہندو مت یا تنگ نظر اسلام کا تصور نہیں کر سکتا۔ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے اور ایک بہت بڑی قوم جو مختلف تہذیبوں پر مشتمل ہے اور یہ تہذیبیں اب ایک دوسرے میں مدغم ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ لیکن مسلم لیگ نے مسلمانوں کو یہ سبق پڑھانا شروع کر دیا ہے کہ یہ تہذیبیں ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہو سکتیں۔ (ایضاً)

آپ نے غور فرمایا عزیزانِ من! کہ مسلمانوں کے متعلق، ہندوستان کے ہندوؤں کے عزائم کیا تھے؟ مولانا حالی نے بھارت کو "اکال الامم" کہا ہے، یعنی وہ کالی دیوی جو ان تمام قوموں کو نگل گئی جو زمانہ قبل از تاریخ سے لے کر مسلمانوں کی آمد تک، باہر سے آئی تھیں۔ جب وہ قومیں ہندوستان میں آئی تھیں تو ان کا جداگانہ تشخص، جداگانہ قومیت، جداگانہ مذہب، جداگانہ تہذیب تھی لیکن اس کے بعد دیکھئے کہ ان کے جداگانہ وجود کا نشان تک مٹ گیا گویا وہ کبھی دنیا میں موجود ہی نہ تھیں۔ وہ سب ہندو بن گئیں لیکن

اکال الامم

ان سب میں مسلمان سخت ہڈی کے نکلے۔ یہ ہندوؤں کی تمام چالوں کے باوجود، ان میں جذب نہ ہوئے اور ان کی یہی سخت جانی تھی جو ہندو کے لئے خارِ پہلو بن رہی تھی۔ مہاتما جی، اور ان کے چیلوں میں مسلمانوں کے غم میں یہ تمام دردناک آہیں اور جگر گداز نالے، اسی کانٹے کی کھٹک کا نتیجہ تھے۔ پہلے انہیں یہ غم ستا رہا تھا کہ یہ ایک الگ قوم کی حیثیت سے زندہ کیوں ہیں اور اب یہ صدمہ مار رہا تھا کہ یہ شکار ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ چنانچہ اُن کے بڑے بڑے مہاپُرش، اپنی جاتی کے سپوتوں سے للکار للکار کر کہہ رہے تھے کہ دیکھنا! یہ کہیں جلنے نہ پائیں۔ سردار پٹیل نے، مارچ ۱۹۴۲ء میں، احمد آباد میں ایک تقریر کے دوران کہا۔

> جو لوگ ایک جداگانہ قومیت کے متمنّی ہیں، ان میں سے نوے فیصد وہ ہیں جو اس ملک کی مٹی کی پیداوار ہیں۔ اس لئے اگر یہ لوگ پھر اپنی اصل میں جذب نہیں کئے جا سکتے تو یہ اُن لوگوں کا قصور ہے جن سے نکل کر یہ لوگ الگ ہوئے تھے۔ (طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۴۲ء)

یہ حضرات، اس قسم کی تقاریر سے۔ ہندو سپوتوں کو مشتعل کر رہے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ انہوں نے مختلف مقامات

مسلمانوں کا قتلِ عام

پر مسلمانوں کو قتل و غارت کرنا شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں مسلمانوں پر کس قدر تشدّد کیا جاتا تھا، اس کی تفصیل طول طویل ہے۔ (مسلم لیگ کی طرف سے متعیّن کردہ پیرپور کمیٹی کی رپورٹ اس پر شاہد تھی) میں اس مقام پر صرف ایک واقعہ پر اکتفا کروں گا۔ ۱۹۴۰ء میں، سی۔ پی کے بسوا چاندور میں، ہندو بلوائیوں نے مسلمانوں کو بُری طرح سے قتل کیا اور لُوٹا اور وہاں کی کانگریسی حکومت نے، خود مسلمانوں کو گرفتار کر کے انہیں جیل میں ٹھونس دیا۔ اس سلسلہ میں ان پر کس قدر تشدّد کیا گیا اس کے متعلق وہاں کے سیشن جج نے اپنے فیصلے میں لکھا تھا کہ،

> تمام مسلمانوں کی ذلت کے ساتھ شہر کی سڑکوں پر تشہیر کی گئی اور پھر اسکول کے ایک کمرے میں ۱۴۵ مسلمان بند کر دیئے گئے۔ یہ کمرہ تیس فٹ لمبا اور بیس فٹ چوڑا تھا جس میں مسلمان رات بھر مقفل رکھے گئے۔ ان لوگوں کی تشہیر کے لئے جب انہیں سڑکوں پر گھمایا گیا تو وہ دوپہر کا وقت تھا اور چونکہ یہ سخت ترین گرمی کا زمانہ تھا اس لئے اس وقت گرمی یقیناً بہت زیادہ ہوگی۔ جو مجسٹریٹ اس تشہیر کے وقت ساتھ تھا اس نے تسلیم کیا ہے کہ اس وقت اتنی شدید گرمی تھی کہ اس تشہیر میں کئی لوگوں کو قے آگئی حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو ذلت کے ساتھ برسرِعام کھڑا کر کے ان کی جانچ کرنے سے لے کر، ۱۴۵ آدمیوں کو ان کے جیل بھیجنے کے وقت تک پولیس کا جو عمل رہا ہے اسے دیکھ کر آجکل کے نازی جرمنی کا نقشہ آنکھوں

کے سامنے پھر جاتا ہے۔ (مدینہ ۲۵ ربحوالہ طلوعِ اسلام ستمبر ۱۹۴۰ء)

یہ تھا کانگریس حکومت کے تحت، مسلمان اقلیت کا حشر!

کہا جاتا ہے — اور خود اُس زمانے کے (مسلمان، غدارانِ ملّت جو حصول پاکستان کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل تھے، کہا کرتے تھے — کہ ہندو، وہاں اپنی حکومت قائم نہیں کرنا چاہتا تھا، جمہوری نظام قائم کرنا چاہتا تھا۔ میں یہاں اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے خود مغربی جمہوریت ہی کس قدر ملعون و مردود نظامِ مملکت ہے۔ اگر مغربی زاویۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے، تو ہندوستان کی جمہوریت بھی نرالے قسم کی ہوتی — اور ہے — مغربی انداز جمہوریت میں ہوتا یہ ہے کہ جو پارٹی آج اقلیت میں ہے اس کے لئے امکان ہے کہ

جمہوری نظام

وہ کل کو اکثریت بن کر اپنی حکومت قائم کر لے لیکن ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں تھے اور چونکہ یہ اقلیت مذہب کی بنیاد پر تھی اس لئے اس کے لئے اس کا امکان ہی نہیں تھا کہ یہ کبھی اکثریت بن کر اپنی حکومت قائم کر سکے۔ لہٰذا، اسے مستقلاً ہندو اکثریت کی محکومی کی زندگی بسر کرنی پڑتی۔ ہندو کی محکومی کس قسم کی ہوتی، اس کا جواب ہم سے نہیں، خود وہاں کے اربابِ سیاست کی زبان سے سُنیئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے، اس ضمن میں لکھا تھا کہ

> دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر، اور دھمکا کر، اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہے۔ (میری کہانی، جلد دوم، صفحہ ۴۵۵)

اس اکثریت کی حکومت کے تابع مسلمانوں پر کیا گذرتی، اس کے متعلق، متحدہ قومیّت کی سب سے بڑی مؤید جماعت — جمعیت العلماءِ ہند — کے سیکرٹری، مولانا احمد سعید (مرحوم) نے ۱۹۲۶ء میں کہا تھا کہ:-

> اسلامی حکومت کے زوال پر اس ملک میں ہندوؤں کی حکومت قائم ہو جاتی تو مسلمانوں کو چھٹی کا کھایا یاد آ جاتا — جو قوم موجودہ غلامی کی حالت میں یہ ستم ڈھا رہی ہے، حکمران بن کر خدا جانے مسلمانوں کے ساتھ کیا کرتی۔ (الجمعیۃ، بابت ۱۰ جنوری ۱۹۲۶ء)

مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کا نام تو آپ نے سنا ہوگا — یہ وہی بزرگوار ہیں جن کے نظریۂ قومیّت کی بنا پر، علّامہ اقبال نے ان کے ماتھے پر وہ کلنک کا ٹیکہ لگایا تھا کہ اگر وہ اسے تسنیم و سلسبیل کے پانی سے بھی مل کر دھو رہے ہوں گے، تو وہ نہیں اترے گا — انہی مدنی صاحب نے ۱۹۲۸ء میں، مولانا شوکت علی (مرحوم) کو ایک خط

میں لکھا تھا۔

چونکہ ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور ہندو اکثریت میں، اور ان کی اکثریت بھی غیر معمولی ہے اور تین اور ایک کی نسبت ہے اور ان کی یہ حالت ہے کہ آج تک ڈاکٹر مونجے صاحب یہی فرما رہے ہیں کہ "یہ سرزمین کسی مسلمان یا کسی فرقہ کی زمین نہیں ہے۔ یہاں جو راج قائم ہوگا وہ ہندو راج ہوگا۔ مجھے کروڑوں ہندو رضاکاروں کی ضرورت ہے"۔ جو مظالم آئے دن دفتروں میں، شہروں میں اور ریاستوں میں کئے جا رہے ہیں اور جس تعصب اور عدم رواداری کا ثبوت حسب تصریح جناب "ہندو دیوتا" گاندھی جی اور نہرو صاحب نے دیا ہے ان کی بنا پر ہم کسی طرح بھی اپنے ابنائے وطن کے ساتھ متحدہ قومیت نہیں بنا سکتے۔

(طلوع اسلام، بابت اپریل ۱۹۴۲ء)

(آسمان نے ایسا منظر بھی شاید ہی کبھی دیکھا ہو کہ جو لوگ چند سال پہلے ہندوؤں کی حکومت کے متعلق یہ کچھ کہہ رہے تھے، وہ خود اُسی ملک میں، انہی ہندوؤں کی حکومت کے لئے مصروفِ جدوجہد ہو گئے اور جو مسلمان ان کے چنگل سے نکل کر اپنی آزاد مملکت قائم کرنے کے لئے کوشاں تھے، ان کی سخت مخالفت کرنے لگے (لیکن یہ ایک جداگانہ کہانی ہے جسے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ اس وقت تو صرف یہ دیکھئے کہ ہندو کیا ہے!) انگریز

ہندوؤں کے عزائم

کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد، ہندوؤں کے عزائم کیا تھے، اس کا انکشاف قائداعظمؒ نے، دسمبر ۱۹۴۱ء میں، آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس میں ان الفاظ میں کیا تھا

ساورکر (صدر ہندو مہاسبھا) کی اسکیم یہ ہے کہ جب (انگریز کے جانے کے بعد) میدانی، بحری اور فضائی فوج میں ہندوؤں کو ۷۵ فیصد حصہ مل جائے گا تو پھر ہندو راج قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی ان مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا جو شمال مغرب اور شمال مشرق میں بستے ہیں، ان کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ سرحدوں پر ہندو فوج اس طرح بٹھا دی جائے گی جس طرح اب برطانوی فوج متعین ہے اور یہ فوج اس کا خیال رکھے گی کہ مسلمان سر نہ اٹھا سکیں۔

پاکستان بن جانیکے بعد

یہ تھا برادرانِ عزیز! وہ ہندو جس کے پنجہ استبداد سے نجات حاصل کرنے کے لئے ملّتِ اسلامیہ کے مجاہد اعظم محمد علی جناحؒ نے دس سال تک مسلسل لڑائی لڑی اور ہندو اور انگریزوں کے علاوہ، خود نیشنلسٹ مسلمانوں، ——جمعیت العلماء—— جمعیت الانصار——

سرحد کے سرخپوش، مجلسِ احرار ــــ نیز جماعتِ اسلامی اور یونینسٹ پارٹی ــــ کی مسلسل مخالفت کے علی الرغم، پاکستان حاصل کر لیا۔ اس پر ان مخالفین کے دلوں کے اضطراب کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک طرف، ڈاکٹر شیام پرشاد مکھرجی یہ کہہ رہا تھا کہ:۔

> ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ پاکستان کو پھر سے ہندوستان کا حصہ بنا لیا جائے۔ اس حقیقت کے متعلق میرے دل میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا، خواہ یہ معاشی دباؤ سے ہو یا سیاسی دباؤ سے یا اس کے لئے دیگر ذرائع استعمال کرنے پڑیں۔ (آرگنائزر ۱/۳)

دوسری طرف سے دیوان چمن لال جیسے (بظاہر اعتدال پسند ہندو) یہ کہہ کر ہندوؤں کی ڈھارس بندھا رہے تھے کہ:۔

> میں ناامید ہونے والوں میں سے نہیں ہوں۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ تقسیمِ ہند ایک عارضی سا حادثہ ہے، اس کے باوجود ہمیں تیس کروڑ ہندوؤں کو اس مقصد کے حصول کے لئے جان تک دے دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ یہ بہت غلط ہوگا کہ ہم (اپنی قوم کو) امن اور شانتی کی لوریاں دے دے کر اسی طرح سلائے رکھیں جس طرح ہم نے انہیں اس وقت تک سلائے رکھا اور جس کا نتیجہ اب ہمارے سامنے ہے۔ ہم میں بنیادی نقص یہ ہے کہ ہم ضرورت سے زیادہ امن پسند واقع ہوئے ہیں۔ (ایضاً)

اور تو اور، جب تقسیمِ ہند کا بل منظوری کے لئے برطانوی پارلیمان میں پیش ہوا تو برطانیہ کے وزیرِ اعظم، لارڈ ایٹلی (جو اس وقت میجر ایٹلی تھے) اپنی تقریر میں فرما رہے تھے کہ:۔

> ہندوستان تقسیم ہو رہا ہے، لیکن مجھے اُمیدِ واثق ہے کہ یہ تقسیم زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکے گی اور یہ دونوں مملکتیں جنہیں ہم اس وقت الگ کر رہے ہیں، ایک دن پھر آپس میں مل کر رہیں گی۔

پاکستان، انگریز، کانگریس اور مسلم لیگ کے باہمی سمجھوتے سے وجود میں آیا تھا۔ اس سلسلہ میں آپ نے اس سمجھوتہ کے ایک فریق (انگریز) کے خیالات معلوم کر لئے۔ اب کانگریس کی سنیئے۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو تقسیمِ ہند کا اعلان ہوا۔ اور ۱۶ جون کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے، حسبِ ذیل ریزولیوشن پاس کیا۔

> آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو پورا پورا یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی آ جائے گی تو ہندوستان کے مسئلہ کا حل، صحیح صحیح پس منظر میں دریافت کر لیا جائے گا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قومیں ہونے کا باطل نظریہ مردود قرار پا جائے گا۔

کانگریس کی طرف سے، تقسیمِ ہند کے فیصلہ پر دستخط پنڈت جواہر لال نہرو نے کئے تھے۔ وہ ایک طرف اس فیصلہ پر

دستخط کر رہے تھے اور دوسری طرف اپنی قوم سے کہہ رہے تھے کہ:۔

ہماری اسکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔ (پاکستان فیسز انڈیا صفحہ ۹۹)

اس کے بعد، راجہ مہندر پرتاپ نے ۱۹۵۰ء میں اپنی قوم کو مشورہ دیا کہ:۔

جب تک پاکستان کا وجود ختم نہیں ہو جاتا ہمارا ملک کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ حالات اس طرح بدل رہے ہیں کہ مجھے یقین ہوتا چلا جا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ لابدی ہوگئی ہے۔ بنابریں میں حکومت ہند کو مشورہ دونگا کہ وہ افغانستان کو اپنے ساتھ ملا کر پاکستان کو ختم کر دے۔ (ویر بھارت، ۵۰/۱۲/۲۱)

سوشلسٹ اپنے آپ کو بڑا منصف مزاج اور تعصّب سے بالا قرار دیا کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک مسلمانوں کی مخالفت کا تعلق ہے، اس میں ہندو مہاسبھا اور سوشلسٹ پارٹی میں کوئی فرق نہیں۔ چنانچہ اس پارٹی کے لیڈر، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے اپنی کتاب "اگلا قدم" میں لکھا تھا کہ:۔

ہم زیادہ عرصہ تک انتظار نہیں کر سکتے۔ شاید دو تین سال کے عرصہ ہی میں امرتسر اور پاکستان کی درمیانی حدِ فاصل مٹ جائے گی۔ ہمیں پاکستان کے اس زہر کو ختم کر کے تقسیمِ ہند کو معدوم کر دینا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مصنوعی تقسیم ختم ہو جائیگی اور پاکستان اور ہندوستان پھر سے ایک ملک ہو جائینگے۔

میرا خیال ہے کہ آپ اس انتظار میں ہوں گے کہ اس باب میں بڑے میاں (مسٹر گاندھیؒ) نے کیا دکھان دیا تھا وہ بھی سن لیجئے۔ انہوں نے پاکستان بننے کے تین دن پہلے کہا تھا کہ:۔

اگر سارا ہندوستان جل کر راکھ ہو جائے ہم پھر بھی مطالبۂ پاکستان منظور نہیں کریں گے خواہ مسلمان اسے بزورِ شمشیر ہی کیوں نہ طلب کریں۔ (دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا۔ صفحہ ۱۶۱، مصنفہ ای۔ ڈبلیو۔ آر۔ لوبی)

یہ اس داستان کا پہلا باب ہے۔ اب دوسرا باب ملاحظہ فرمایئے کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد، ہندو کس روپ میں سامنے آیا۔ اس روپ کے دو حصے ہیں۔ ایک یہ کہ ہندو نے خود اپنے ہاں کے بسنے والے مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا اور دوسرے یہ کہ پاکستان کی طرف آنیوالے مسلمانوں کو کس طرح اپنی ہوسِ خون آشامی کی تسکین کا سامان بنایا

باب دوم
(تشکیلِ پاکستان کے بعد)

(۱) وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ کیا ہوا

ہندوؤں نے اپنی حکومت قائم ہونے کے بعد، پہلا کام یہ کیا کہ سومنات کی جامع مسجد کو، جو ایک ہزار سال سے وہاں ایستادہ تھی، مسمار کر کے اس کی جگہ مندر بنا دیا۔ یہ تقریب بڑے جوش و خروش سے منائی گئی اور اس "مقدس رسم" کی ادائیگی کے لئے سیکولر حکومت کے صدر، بابو راجندر پرشاد کو بلایا گیا۔[1] اس کے بعد جو وہاں مسجدیں ڈھانے کی طرح پڑی ہے تو پھر ایسے واقعات کا کوئی انت شمار ہی نہیں رہا۔ حالانکہ تقسیمِ ملک سے متعلق آئین میں، اقلیتوں کے مذہب اور ثقافت کی حفاظت کی ضمانت دی گئی تھی۔ اخبار مدینہ کی ۲۸ جولائی ۱۹۶۵ء میں شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق، ایک شہر لدھیانہ کی ۱۱۷ مساجد میں سے ۹۰ میں گردوارے بن چکے ہیں، ۱۵ میں مندر اور باقیوں میں رہائش ہے۔

(طلوعِ اسلام۔ فروری ۱۹۶۶ء)

اسلامک کلچر کا خاتمہ جہاں تک ثقافت کا تعلق ہے، ہندوستان کے پہلے جشنِ آزادی کی تقریب پر، یُوپی کانگریس کمیٹی کے صدر اور وہاں کی اسمبلی کے اسپیکر، مسٹر ٹنڈن نے پورے جوش و خروش سے کہا کہ:۔

> ہندوستان یونین میں، جداگانہ زبان اور جداگانہ کلچر کی آواز کہیں سے نہیں نکلنی چاہیئے۔ جو لوگ کسی خاص فرقے کیلئے جداگانہ زبان یا کلچر کی حمایت کرتے ہوں، ان کیلئے ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں۔ اگر یہ لوگ اپنا نظریہ نہ بدل سکیں تو انہیں ہندوستان چھوڑ کر کہیں اور چلے جانا چاہیئے۔ مذہب اور کلچر دو مختلف چیزیں ہیں۔ چین جاپان اور دیگر ممالک میں بھی مسلمان بستے ہیں۔ نہ ان کی جداگانہ زبان ہے، نہ جداگانہ کلچر۔ ان کا کلچر وہی ہے جو ان کی مادرِ وطن کا کلچر ہے۔ اگر مسلمان ہندوستان میں رہنے کے خواہش مند ہیں تو انہیں ہندی کو بطور زبان اور ناگری کو بطور رسم الخط اختیار کرنا ہوگا۔ انہیں اپنی تہذیب اور تمدن کے لئے عرب یا پاکستان کی طرف نہیں دیکھنا چاہیئے بلکہ بھارت ورش کے کلچر کو اپنا کلچر بنانا چاہیئے۔
>
> (ہندوستان ٹائمز، ۸/۱۶ ۴۸)

سی۔ پی کے وزیرِ اعظم، مسٹر شکلا نے بھی یہی کچھ فرمایا اور کہا کہ:۔

---

[1] آپ کو معلوم ہے کہ ہم (پاکستان کے مسلمانوں) نے اس کا جواب کیسے دیا تھا؟ یہ تقریب ۱۱ مئی کو منعقد ہوئی تھی۔ یہاں کے مسلمانوں نے فیصلہ کیا تھا کہ ۱۱ مئی کو قوم میں جس قدر لڑکے پیدا ہوں ان کا نام محمود رکھا جائے۔ چنانچہ ایسا کرنے کے بعد ہم خوش ہو گئے کہ ہماری قوم میں اتنے محمود پیدا ہو گئے ہیں۔ کس قدر خود فریب واقع ہوئی ہے یہ قوم!

میں ان مسلمانوں کو جن کے دماغ میں ابھی تک مسلم لیگی ذہنیت موجود ہے، یہ چیلنج دینا چاہتا ہوں کہ آج ایک زبان اور ایک تہذیب کے خلاف جو کوشش ہو رہی ہیں انہیں نہ تو ہم برداشت کریں گے اور نہ ہی کامیاب ہونے دیں گے۔

(ملاپ، ۱۲/۴۸ ۱۲)

اور انڈین پارلیمنٹ کے اسپیکر، مسٹر مولنکر نے ایک جلسہ میں کہا کہ:۔

ہم اس وقت سخت کشمکش میں مبتلا ہیں۔ اگر اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلے کہ کسی ایک فرقہ کی زبان اور تمدن تباہ ہو تو اصول کا تقاضا یہ ہے کہ اقلیت کے فرقہ کی زبان اور تمدن کو تباہ ہو جانا چاہیئے۔۔۔۔۔۔ اقلیت کے فرقہ کو اس کا احساس ہونا چاہیئے کہ وہ ایک بڑے خاندان کا ممبر ہے اور اسے بڑے خاندان ہی میں اپنی ہستی کو ضم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ (الجمعیۃ، دہلی، بحوالہ طلوعِ اسلام، بابت فروری ۱۹۴۹ء)

جب مسلمانوں نے ہندوؤں کے معتدل مزاج لیڈروں کی توجہ ان تقاریر کی طرف دلائی تو پنڈت سندر لال جیسے لیڈر نے جو بڑے فخر سے اپنے آپ کو ایک طرح کا مسلمان کہا کرتے تھے، جامع مسجد دہلی میں مسلمانوں سے کہا کہ اگر ان کے ساتھ کسی قسم کی سختی ہوتی ہے تو انہیں اس سختی کو ان لوگوں کی طرف سے کفارہ سمجھ کر برداشت کر لینا چاہیئے جنہوں نے پاکستان بنوایا تھا۔ آخر تمہیں میں سے وہ لوگ تھے جو "لے کے رہیں گے پاکستان" اور "بٹ کے رہیگا ہندوستان" کے نعرے لگایا کرتے تھے۔ (صدق ۱۲/۴۸ ۱۷)

یہ ۱۹۴۸ء کی باتیں تھیں اور ۱۹۶۶ء میں، ہندو مہاسبھا نے الیکشن کے سلسلہ میں جو اپنا منشور شائع کیا اس میں واضح الفاظ میں لکھا کہ:۔

مہاسبھا دستور میں اس قسم کی ترمیمات کے حق میں ہے جو ہندو کلچر کی روایات کے مطابق ہوں اور جس کے نتیجے میں ملک صحیح معنوں میں ایک جمہوری ہندو ریاست بن سکے۔ اگرچہ اقلیتیں کلچر اور مذہب کے معاملہ میں آزاد ہوں گی، لیکن انہیں ہندو قومیت کے خاص دھارے میں سموجانا چاہیئے اور مذہب اور کلچر کے نام پر علیحدہ قومیت کے تصور کو خیرباد کہہ دینا چاہیئے۔ (مدینہ بجنور، ۱۰/۶۶ ۲۵)

ان دھمکیوں پر وہاں عمل کس طرح ہو رہا ہے، اس کا اندازہ ایک نہایت دلچسپ واقعہ سے لگایئے جو الٰہ آباد کے ایک مشہور شاعر اور افسانہ نگار ہندو کے ساتھ حال ہی میں پیش آیا اور جسے انہوں نے ایک خط میں بیان کیا جو لکھنؤ کے اخبار صدق میں شائع ہوا۔ انہوں نے اس میں لکھا تھا کہ:۔

میں ڈاڑھی رکھتا ہوں اور ویسے بھی چہرہ ترکی چہرہ ہے، بالکل اس ترک کی طرح جو ہزاروں سال سے گھس کر اور عربی بھگت کر چھوٹا پڑ گیا ہو۔ پھر میں گرمیوں میں علی گڑھ پاجامہ اور کرتہ بھی پہنتا ہوں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان فرقہ وارانہ فسادات میں (جو ان دنوں الٰہ آباد میں ہو رہے تھے) مجھے کیا سمجھا جاتا ہوگا۔۔۔ اصل

مسلمان، بلکہ مسلنٹا ،۔۔۔ ایک دن سات بجے، میں کچھ کتابیں اور فائلیں لئے پیدل جا رہا تھا کہ اچانک میرے دونوں جانب کچھ لوگ سائیکل سے اترے اور ایک نے چھرا نکال لیا۔ میں نے چلّا کر کہا کہ میں ہندو ہوں بس وہ چلّانا کام آگیا اور خوش قسمتی سے میں زندہ ہوں پھر انہوں نے میرے ساتھ یہ مسخرا پن کیا کہ مجھے قریب کی نائی کی دکان پر لے گئے اور میری برسوں کی محفوظ ڈاڑھی کٹوادی۔ انہیں کسی مسلنٹے پر ہاتھ صاف کرنے میں مزا آرہا تھا۔

(طلوعِ اسلام، جون ۱۹۶۸ء)

یہ کچھ وہاں موجودہ مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ جہاں تک وہاں کے مسلمانوں کی آنیوالی نسلوں کا تعلق ہے، ان کے لئے نظامِ تعلیم ایسا وضع کر دیا گیا ہے کہ جس سے وہ بھول جائیں کہ وہ کسی جداگانہ قوم کے افراد ہیں۔ (یہی گاندھی جی کی واردھا کی تعلیمی اسکیم کا مقصد تھا)۔ اس سلسلہ میں کوئی دو سال اُدھر، مولانا ابوالحسن ندوی نے، ہندوستان میں رہنے والے اپنے ایمانی بھائیوں کے نام ایک اپیل میں کہا تھا کہ:

> دل پر پتھر رکھ کر لیکن آنکھوں کی پٹی کھول کر یہ بات عرض کرنی پڑتی ہے کہ اب اس بات کے سمجھنے میں کسی دوربینی یا فراستِ ایمانی کی ضرورت نہیں کہ سرکاری اسکولوں میں جو نصاب (بالخصوص ہندی اور سنسکرت میں) پڑھایا جاتا ہے اس کے بعد کسی مسلمان بچے کا، کم سے کم معنی میں بھی مسلمان رہنا عقلاً اسی طرح ممکن نہیں جیسے دریا میں کودنے اور غوطہ لگانے کے بعد جسم کا خشک رہنا اور دامن کا تر نہ ہونا ممکن نہیں۔

(طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۶۶ء)

فسادات

یہ کچھ وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ ذہنی اور نفسیاتی طور پر کیا جا رہا تھا کہ اس کے ساتھ وہاں متواتر بیس سال سے جو فسادات کا سلسلہ جاری ہے اور جن میں مسلمانوں کی جان، مال، عزت، آبرو عصمت کچھ بھی محفوظ نہیں رہتی، ان کا حد و شمار ہی نہیں۔ سید بدرالدجیٰ مغربی بنگال کے ایک مسلم راہنما ہیں، بہت پرانے کانگریسی، آزادی کی جنگ میں ہندوؤں کے چوٹی کے لیڈروں کے ہمراہ، شانہ بشانہ لڑنے اور جیل جانیوالے۔ اس وقت وہ وہاں کی مرکزی پارلیمان کے رُکن ہیں۔ انہوں نے کوئی دو سال اُدھر، پارلیمان کے بھرے اجلاس میں ایک طویل تقریر میں تفصیل سے بتایا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ آزادی کو حاصل کئے انیس سال ہوئے ہیں۔ ان انیس سالوں میں (مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے) پولیس کی بے امتیاز فائرنگ انگریزوں کی ڈیڑھ سو سالہ روایات کو پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ پورے ملک میں قتل و غارت گری، جھوٹی یقین دہانیاں، لوٹ مار کے دل دوز مناظر، ہزاروں مسلمانوں کا قتلِ عام، بلاکسی امتیاز کے لاکھوں کی گرفتاری آسام اور مغربی بنگال سے بے دخلیاں اور اس قسم کے دوسرے ہزارہا واقعات مسلمانوں سے موجودہ سیکولر حکومت کے جانبدارانہ سلوک کے ثبوت ہیں۔ انہوں نے اپنی تقریر میں انکشاف کیا کہ پاکستان اور بھارت کی جنگ کے دوران پچاس ہزار سے زیادہ مسلمانوں کو پاکستان کا جاسوس قرار

دے کر غداری کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ مغربی بنگال میں ۴۵ ہزار پاکستانی موجود تھے۔ ان میں سے دس ہزار نظر بند کر لئے گئے جو مسلمان تھے۔ ہندوؤں کو پاکستانی ہونے کے باوجود کچھ نہیں کہا گیا۔

(طلوعِ اسلام جولائی ۱۹۶۶ء)

جہاں تک فسادات کا تعلق ہے، ان کی کیفیت بڑی دلدوز اور جگر سوز ہے۔ کلکتہ سے شائع ہونیوالے اخبار (NOW) کی ۱۲ جنوری ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں منجملہ دیگر امور کے کہا گیا تھا کہ:۔

تقسیمِ ہند کے بعد کم از کم پانچ سو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہیں جن میں ہلاک ہونیوالوں کی تعداد پچاس ہزار سے بھی زائد ہے۔ لیکن یہ تخمینہ بہت پرانا ہے اور نظرِ ثانی کا محتاج۔ یہ تمام فسادات سیکولرازم کے پردے میں ہوتے ہیں اور یہ سیکولرازم اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس برہمن ذہنیت کی حفاظت کی جائے جس کی نمائندگی جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس جیسی فاشسٹ جماعتیں کر رہی ہیں۔ ظاہر میں جن سنگھ فساد کراتی ہے لیکن پس پردہ اس کو کانگریس کی پوری تائید حاصل ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں مسٹر نراد سی۔ چودھری لکھتا ہے کہ "واقعہ یہ ہے کہ ہندو روایت جس قدر متشدد آج ہے اتنی آزادی کے وقت نہ تھی اور جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے اس میں مسلمانوں کے بارے میں، اور بھی زیادہ شدت آ رہی ہے۔

(بحوالہ ایشیاء ۲۱ ۷/۶۷)

حال ہی میں، بھارت کے وزیرِ داخلہ نے اپنی رپورٹ میں تسلیم کیا ہے کہ ملک کے مختلف حصوں میں جو فسادات ہوئے ہیں ان کی تعداد ۱۹۶۶ء میں ۱۳۳ اور ۱۹۶۷ء میں ۲۶۷ تھی۔ ۱۹۶۸ء میں جو اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال کے صرف چار ماہ میں مسلمانوں کے خلاف ۱۰۳ فسادات ہو چکے ہیں۔ خونریزی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ۱۹۶۵ء تک مقتولین کی تعداد کا جو اوسط تھا ۱۹۶۷ء کے صرف پہلے ۹ ماہ میں مقتولوں کی تعداد اس سے دگنی ہو چکی تھی۔

(بحوالہ ایشیاء ۲۱ ۷/۶۸)

مسلمانوں کے خلاف ان تمام ذہنی اور نفسیاتی دھمکیوں اور اس قسم کی خونریزیوں اور غارت گریوں کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں کے مسلمان سخت مرعوب اور (DEMORALIZED) ہو گئے ہیں اور وہ ہندوؤں کے سامنے اس قدر جھکنے اور ان کی اس درجہ خوشامد کرنے لگ گئے ہیں کہ رفتہ رفتہ ان سے ملی غیرت اور انسانی حمیت رخصت ہوتی چلی جا رہی ہے۔ مثلاً ابھی ہندو حکومت کو قائم ہوئے ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ مہاتما گاندھی کی وفات ہو گئی۔ اس پر (۵ فروری ۱۹۴۸ء کے) ہندوستان ٹائمز میں یہ خبر شائع ہوئی کہ:۔

دہلی کے مسلمانوں کی خواہش ہے کہ مہاتما گاندھی کے شایانِ شان ایک یادگار قائم کریں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی مقدس راکھ میں سے کچھ انہیں بھی دیا جائے۔ وہ اس راکھ پر دہلی کی جامع مسجد کے قریب مقبرہ بنائیں گے۔ انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ ۱۲ فروری کو اس راکھ کا جلوس نکالیں گے اور اسے ہرے بھرے کے مزار کے قریب (جامع مسجد کے سامنے) دفن کر دیں گے۔ (بحوالہ طلوعِ اسلام مارچ ۱۹۴۸ء)

ایک صاحب (عبدالرحمٰن خان) نے ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کے ہندوستان ٹائمز میں لکھا تھا۔

اگر میں یہ عقیدہ نہ رکھتا کہ نبوت محمدؐ رسول اللہ کے ساتھ ختم ہوگئی ہے تو میں یقیناً مہاتما گاندھی کو بیسویں صدی کا پیغمبر کہتا۔ (ایضاً)

اور میر مشتاق احمد صاحب، ایک قدم اور بھی آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے فرمایا کہ :-

گاندھی جی کی عظمت مکان و زمان سے بالاتر ہے۔ یہ محبت اور سلامتی کا پیغمبر اپنی عظمت میں، بدھ، عیسیٰؑ اور محمدؐ سے بھی بڑھ گیا ہے۔ (معاذ اللہ) (ہندوستان ٹائمز ۲۴ ۱۸)

اس کے چند ماہ بعد، ایک صاحب، مسٹر ایم۔ انیس۔ ایچ۔ قریشی کا جریدہ اسٹیٹس مین میں ایک خط شائع ہوا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ :-

ہندوستان سے ہندو اور مسلمان قسم کے الفاظ یکسر نابود کر دینے چاہئیں۔ یہ تفریق ترقی کی راہ میں سنگِ گراں ہے۔ جونہی ہم نے محسوس کر لیا کہ ہم فقط ہندوستانی ہیں، موجودہ تصادم کی جگہ خیر سگالی اور خوشحالی آجائیگی۔

(طلوعِ اسلام، بابت فروری ۱۹۴۹ء)

وہاں کی دستور ساز اسمبلی کے ۱۹۴۸ء کے سرمائی سیشن میں، ایک ممبر، مسٹر تجمل حسین نے یہ تجویز پیش کی کہ آئندہ اس ملک میں کوئی شخص نہ ایسا لباس پہنے نہ ایسا نام رکھے، نہ ایسی وضع قطع اختیار کرے جس سے اس کے مذہب کا پتا چل سکے۔ (طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۴۹ء)

یہ کچھ تو ایک سال کے اندر ہوا۔ اور اس کے سترہ سال بعد، حالت کہاں تک پہنچی، اس کا اندازہ، وہاں کے

مسلمانوں کی مرعوبیت

ایک ہندو صحافی مسٹر نراد۔ سی۔ چودھری کے ایک مضمون سے لگائیے جو انہوں نے (رام لیلا کے تیوہار کے سلسلہ میں) ۹ دسمبر ۱۹۶۶ء کے اخبار (NOW) میں لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے پہلے یہ کہا کہ ہندوستان کی حکومت اپنے آپ کو سیکولر کہتی ہے لیکن حالت یہ ہے کہ اس حکومت کی سب سے بڑی نمائندہ، مسز اندرا گاندھی، رام لیلا کے تیوہار میں شرکت کرتی ہیں اور وہ تمام رسوم

ادا کرتی ہیں جو ہندو دھرم کا جزو ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے لکھا کہ۔

اس سے کہیں زیادہ تعجب انگیز واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۶۵ء میں، بھارت کے نائب صدر، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب رام لیلا گراؤنڈ (دہلی) میں تشریف لائے اور انہوں نے اس تقریب کا افتتاح کیا۔ میں نے یہ تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھا اور محوِ حیرت رہ گیا اس لئے کہ ہم ہندو، رام کو خدا کا اوتار سمجھتے ہیں۔

اس کے بعد مسٹر چودھری نے لکھا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خان کو اس کا علم ہونا چاہیے تھا کہ رام لیلا کے تیوہار میں شرکت سے وہ شرک کے مرتکب ہو رہے ہیں جو اسلام کی رُو سے گناہِ عظیم ہے اور احادیثِ نبویؐ نے اس کی سخت مذمت کی ہے اور اس سے ایک مسلمان اس توحید کے مقامِ بلند سے گر جاتا ہے جو نہایت پاکیزہ تصور ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں تو انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا لیکن اگر وہ اسلام کے پیرو نہیں رہے تو وہ شرک کے الزام سے تو بچ جائیں گے لیکن پھر ہندوؤں کے اس دعوے کی حقیقت کیا رہے گی کہ دیکھو! ہم نے ایک مسلمان کو اپنی مملکت کا نائب صدر بنا لیا ہے۔

اس کے بعد، مسٹر چودھری نے مسلمانوں کے منہ پر اس زور سے ایک چپت لگایا کہ اس کی آواز آج تک فضا میں گونج رہی ہے۔ انہوں نے لکھا تھا۔

میں ایک ہندو ہونے کی حیثیت سے کہوں گا کہ بھارت کے نائب صدر ہونے کی جہت سے، ڈاکٹر ذاکر حسین خان پر، معاشرتی سیاسی یا اخلاقی نقطۂ نگاہ سے یہ کسی طرح بھی لازم نہیں آتا تھا کہ وہ رام لیلا کے خالصتہً ہندووانہ تیوہار میں اس طرح شریک ہوں۔ میری اپنی حالت یہ ہے کہ میں تقریباً پندرہ یا سولہ برس کا تھا جب میں نے بُت پرستی کے عقیدہ کو خیرباد کہا۔ اس کے بعد میں نے کبھی مندر میں جھانک کر نہیں دیکھا۔ (طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۶۷ء)

ان واقعات کو سن کر آپ ماتھے پر بل نہ ڈال لیجئے کہ ہندوستان کا مسلمان بڑا بے غیرت ہے۔ کیا معلوم ہم وہاں ہوتے تو ہماری کیفیت کیا ہوتی — سوچیئے یہ کہ ہندو کی تنگ نظری، کمینگی اور ہوسِ انتقام نے، ایک طرف مسلسل اعصابی جنگ اور دوسری طرف قتل و غارت گری سے مسلمانوں کی حالت کیا کر دی ہے! پنڈت نہرو نے کہا تھا کہ جمہوریت میں اقلیتوں کو ڈرا کر، دھمکا کر، اپنی گرفت میں رکھا جاتا ہے۔ انہوں نے ڈرا کر، دھمکا کر مسلمانوں کو اپنی گرفت ہی میں نہیں رکھا بلکہ استبداد کے آہنی شکنجہ میں جکڑ کر ان کی ہڈیاں توڑ دی ہیں۔

اب آپ دہشت اور وحشت کے اس لرزہ انگیز منظر کا دوسرا سین لیجیے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء (بروز جمعۃ الوداع) ہندوستان اور پاکستان کی دو الگ الگ مملکتوں کا وجود عمل میں آیا اور اس کے دو روز بعد مسلمانوں نے آزادی کی فضا میں پہلی عید منائی لیکن ہنوز نمازِ عید کی تکبیریں بھی پوری نہیں ہوئی تھیں کہ مشرقی پنجاب اور اس کی ریاستوں۔

مسلمانوں کا قتلِ عام

نابھہ، پٹیالہ، کپورتھلہ، فرید کوٹ سے مسلمانوں کے منظم اور وسیع پیمانے پر قتلِ عام کی خبریں آنی شروع ہوگئیں۔ اس قتل و غارت گری میں ہزاروں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ عورتوں کو اغوا کیا گیا۔ بچوں کو سنگینوں کی نوک پر اچھالا گیا۔ عصمت دری کے واقعات عام ہونے لگے۔ بعض شہروں میں مردوں کو ختم کرکے، نوجوان عورتوں کے برہنہ جلوس نکالے گئے۔ چند ہی ہفتوں کے اندر اندر تقریباً پانچ لاکھ مسلمان قتل کر دیئے گئے۔ اس کے بعد قتل و غارت گری کی اس آگ کا رُخ دہلی کی طرف پھرا اور ہندوستان کے دارالسلطنت میں پورا ستمبر کا مہینہ اس قسم کے قتلِ عام میں گزرا جس کی مثال تاریخ کے اوراق میں کہیں نہیں ملتی۔ ایک اندازہ کے مطابق اس خونی تماشا میں، بھارت میں قریب دس لاکھ مسلمان قتل و غارت گری کی نذر ہو گئے اور قریب ایک کروڑ مسلمان، انتہائی کس مپرسی کے عالم میں، کسی نہ کسی طرح جان بچا کر، پاکستان پہنچ گئے۔ ان تارکینِ وطن کے ساتھ راستے میں کیا گزری؟ اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ نومبر ۱۹۴۷ء میں ضلع انبالہ کے کرالیا کیمپ سے پانچ ہزار پناہ گزینوں کا قافلہ لائلپور کے قریب پہنچا۔ ان میں سے دو ہزار مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے۔ ان میں ہیضہ کا مرض عام تھا۔ اس کیمپ میں انہیں جو آٹا کھانے کو دیا جاتا تھا جب اس کا کیمیاوی تجزیہ کیا گیا تو اس میں نیلا تھوتھا کا زہر ملا ہوا تھا۔ ایک گاڑی، ۱۱ نومبر کو دہلی سے لاہور پہنچی تو اس میں سفر کرنے والی عورتوں اور لڑکیوں نے بتایا کہ حکومتِ ہند نے جو سپاہی ان کی حفاظت کے لئے گاڑی کے ساتھ متعیّن کئے تھے، انہوں نے کس طرح راستے میں ان کی عصمت دری کی۔ ایک ٹرین میں قریب ڈیڑھ ہزار پناہ گزین دہلی سے آ رہے تھے امرتسر کے قریب ان سب کو ختم کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ ہندوستان میں ہندوستانی حکومت کی طرف سے وہاں سے آنیوالے مسلمانوں کے خلاف ہو رہا تھا لیکن آپ کو معلوم ہے کہ دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کیلئے ہندوؤں کی طرف سے کیا واویلا مچایا جا رہا تھا؟ انکی طرف سے مسلسل چیخ و پکار ہو رہی تھی کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کو تباہ کر دیا ہے۔ ان کے گھر لوٹ لئے ہیں۔ ان کی عورتوں کو اغوا کر لیا ہے۔ یہ تھا وہ واویلا جس کی طرف اشارہ کرتے کے بعد مہاتما گاندھی نے ۲۶ ستمبر ۱۹۴۷ء کی اپنی شام کی پرارتھنا کی میٹنگ میں کہا تھا کہ:۔

> اگرچہ میں نے جنگ کی ہمیشہ مخالفت کی ہے لیکن اگر اس سلسلہ میں پاکستان سے انصاف حاصل کرنے کا کوئی اور طریق کارگر نہ ہوا تو پھر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا کہ ہندوستان، پاکستان کے خلاف جنگ کرے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ "میں چاہتا تھا کہ اپنی فوجیں پاکستان پر حملہ کرنے کے لئے بھیج دوں، لیکن ہندوستان کے اندرونی خلفشار نے اس کی اجازت نہ دی۔"

یہ تھا ہندو لیڈروں کی طرف سے مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دینے والے قیامت خیز واقعات کا جواب، خدا خدا کر کے، کسی نہ کسی طرح یہ آگ فرو ہوئی تو ۱۹۵۰ء میں بنگال میں فسادات شروع کرا دیئے گئے جس کے نتیجہ میں قریباً ڈیڑھ لاکھ مسلمان، اپنا سب کچھ وہیں چھوڑ کر، نہایت کس مپرسی کی حالت میں، مشرقی بنگال کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔

یہ تو رہیں قتل و غارت گری کی دہشت سامانیاں۔ اب بٹوارے کی طرف آیئے تقسیم کے معاہدہ کی رُو سے،

ترکہ کی تقسیم

ایک لاکھ پینسٹھ ہزار ٹن فوجی سامان پاکستان کے حصہ میں آیا تھا۔ اس میں سے ہندوستان نے (۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء تک) صرف ۴۷.۳ ٹن سامان پاکستان کو دیا۔ باقی سب خود ہڑپ کر گیا۔ تقسیم کے وقت، چار ارب روپیہ نقد ہندوستان میں موجود تھا جس میں سے ایک ارب روپیہ پاکستان کے حصہ میں آتا تھا۔ ہندوستان نے اس رقم کے دینے سے بھی انکار کر دیا اور دسمبر ۱۹۴۷ء میں بمشکل اس پر رضامند ہوا کہ پاکستان کو ۷۵ کروڑ روپیہ دیا جائے۔ اس میں سے بیس کروڑ روپیہ، پاکستان کو پہلے مل چکا تھا۔ ہندوستان، بقایا ۵۵ کروڑ دبا کر بیٹھ گیا۔ اس کے لئے پاکستان کو ہزار جتن کرنے پڑے۔ اور جب بین الاقوامی دباؤ کے ماتحت، ہندوستان کو یہ روپیہ ادا کرنا پڑا تو اس میں سے بھی پانچ کروڑ روپیہ ڈنڈی مار کر رکھ لیا جو آج تک نہیں دیا۔ (جس زمانے میں ہندوستان، پاکستان کا روپیہ دبا کر بیٹھا ہوا تھا، ہندوستان کے حصے کے نوّے جنگی ہوائی جہاز پاکستان میں پڑے تھے —— پاکستان نے نوّے کے نوّے، بحفاظت ان کے حوالے کر دیئے۔)

لیکن کمینہ فطرت ہندو کی آتش انتقام اس سے فرو تھوڑے ہو سکتی تھی۔ وہ تو پاکستان کو سرے سے ختم کر دینے کی فکر میں تھا۔ تقسیم کے بعد، پاکستان جس حالت میں تھا، اور ہندوستان اُسے کمزور سے کمزور تر کرنے

جنگ کی تیاریاں

کے لئے جو کچھ کر رہا تھا، اسے پیشِ نظر رکھیئے اور اس کے بعد وہاں کے سابق چیف جسٹس مسٹر مہاجن کا یہ انکشاف ملاحظہ فرمایئے کہ ہندوستان نے دسمبر ۱۹۴۷ء میں فیصلہ کر لیا تھا کہ پاکستان پر حملہ کر دیا جائے لیکن بعض داخلی مصالح کے پیش نظر اس فیصلہ پر عملدرآمد نہ ہو سکا۔ جب

۱۹۵۰ء میں بنگال میں فسادات کرائے گئے تو اس کے ساتھ ہی وہاں پاکستان پر فوجی حملہ کرنے کی ایک تحریک چلائی گئی جس کی تائید وہاں کے بڑے بڑے لیڈروں ـــ مثلاً پنڈت نہرو، جے پرکاش نرائن، آر۔ کے چودھری وغیرہ سب نے کی۔ وزیرِ اعظم پاکستان ـــ نواب زادہ لیاقت علی خاں (مرحوم) نے صلح کا ہاتھ بڑھایا لیکن پنڈت نہرو نے اس پیشکش کو نہایت بے اعتنائی سے ٹھکرا دیا۔ ابتدائے ۱۹۶۵ء میں، ہندوستان نے "رن اوف کچھ" میں چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تو وہاں کے ہوم منسٹر نندا نے لوک سبھا میں اعلان کیا کہ ہم نے پوری آٹھ لاکھ فوج کو تیاری کا حکم دے دیا ہے اور وزیرِ اعظم نے یہ کہہ کر اس کی تائید کی کہ آج ہندوستان کی بینتالیس کروڑ آبادی، ہر قربانی کے لئے تیار کھڑی ہے۔ اِدھر رن اوف کچھ کے علاقے میں یہ ہو رہا تھا، اور اُدھر، بنگال میں انہوں نے پاکستانی علاقہ، داھاگرام پر دھاندلی سے قبضہ کر لیا ـــ اور پھر، ستمبر ۱۹۶۵ء میں جو کچھ ہوا اسکی تفصیل میں جانیکی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ واقعہ تو ہماری موجودہ نسل کی آنکھوں کے سامنے ظہور میں آیا تھا۔

میں نے عزیزانِ من! اس سلسلہ میں مسئلہ کشمیر کا ذکر قصداً نہیں چھیڑا کیونکہ وہ ہندو ذہنیت کی فی ذاتہٖ مکمل تصویر ہے اور اس کی تفصیل میں جانے کے لئے کافی وقت چاہیئے لیکن میں اس ضمن میں کم از کم ایک مثال ضرور پیش کروں گا جس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ہندو کس قدر کمینہ فطرت واقع ہوا ہے۔ کوئی دو سال اُدھر کا ذکر ہے کہ جمعیت العلماءِ ہند کے ناظمِ عمومی، (اور مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے صاحبزادہ) مولانا سید اسعد مدنی نے اپنا ایک خط اخبارات میں شائع کیا تھا جو انہوں نے کسی وقت لال بہادر شاستری کو لکھا تھا۔ اس خط میں انہوں نے شاستری صاحب سے کہا تھا۔

> میں نے اخبارات میں شائع شدہ آپ کی ایک تقریر پڑھی جس میں آپ نے این۔ سی۔ سی کے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ پاکستان جو ہمیشہ اسلام کی اصطلاح میں سوچتا ہے اس دھوکے میں ہے کہ وہ کشمیر کو اس لئے ہڑپ کر لیگا کہ وہ مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ یہ پاکستان کی خام خیالی ہے۔ ہندوستان میں پانچ کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ اگر پاکستان یہ سوچتا ہے کہ وہ مسلم اکثریت کے بل پر کشمیر کو لے سکتا ہے تو اسے اچھی طرح سوچ رکھنا چاہیئے کہ اس صورت میں ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا۔ (ماہ نامہ "تذکرہ" دیوبند، بابت دسمبر ۱۹۶۵ء، بحوالہ طلوعِ اسلام، جون ۱۹۶۶ء)

آپ سوچیئے، برادرانِ گرامی قدر! کہ کیا دنیا میں کمینگی اور بدفطرتی کی اس سے بدتر مثال کوئی اور بھی ہو سکتی ہے؟

یہ ہے میری قوم کے نونہالو! ہندو دیوتا کے روپ کی ایک جھلک. اب آپ خود ہی اندازہ لگالیں کہ ہمیں کس قسم کے ہمسایہ سے واسطہ پڑا ہے. اور اس کے بعد آپ سوچئے کہ کیا ہم ایک سیکنڈ کے لئے بھی اپنے دل میں خیال کر سکتے ہیں کہ اس ہمسایہ کے ہاتھوں ہمارا کچھ بھی محفوظ ہے! اگر کوئی شخص ایسا خیال کرتا ہے تو وہ فریبِ نفس کا شکار ہے مسلمان کے خلاف ہندو کی دشمنی ازلی ہے اور یہ ابد تک اسی طرح رہے گی. اگر آپ کو اس کا مزید ثبوت درکار ہو تو آپ (اس زمانے کے ہندوستان کے) وزیرِ دفاع مسٹر چون کا وہ بیان پڑھیے جو اس نے ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں شکست کھانے کے بعد دیا تھا. اس بیان میں اس نے کہا تھا کہ :-

> پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اسی دن سے مخاصمت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جس دن پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا. پاکستان اور بھارت کے درمیان آئیڈیالوجی کا اختلاف ہے. اس کے سوا کوئی اختلاف نہیں اور یہ اختلاف اور دشمنی مہینے یا ہفتے بھر کی نہیں بلکہ سالہا سال تک رہے گی. بھارت کو اس لئے ایک تازہ اور فیصلہ کن جنگ کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ (طلوعِ اسلام، فروری ۶۶ء)

مسٹر چون نے یہ بیان اس وقت دیا تھا جب وہاں کے وزیرِ اعظم، معاہدۂ تاشقند پر دستخط ثبت فرما رہے تھے. ایسے کھلے ہوئے دشمن سے اپنے آپ کو ایک لمحہ کے لئے بھی محفوظ سمجھنا انتہائی خود فریبی ہے. اس خطرہ سے محفوظ رہنے کے لئے قوم کو ہر وقت تیار رہنے کی ضرورت ہے کہ

جہاں بازو سمٹتے ہیں، وہیں صیاد ہوتا ہے!

یہی ہے وہ دشمن جس کے متعلق قرآن کریم نے ہم سے تاکیداً کہا تھا کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًاؕ اے جماعتِ مومنین! دیکھنا، اپنوں کے سوا کسی کو اپنا ہمراز و دمساز نہ بنانا. وہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھیں گے. وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ جس بات سے تمہیں نقصان پہنچے اُس سے وہ بہت خوش ہوتے ہیں. قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚۖ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُؕ تمہارے خلاف جو کچھ وہ سوچتے رہتے ہیں، اس میں سے یونہی کوئی بات ان کے منہ سے نکل جاتی ہے تو تمہیں کچھ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے عزائم کیا ہیں لیکن جو کچھ ان کے سینے میں مخفی ہوتا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتا ہے. (۳/۱۱۷) اب سوال یہ ہے کہ اس قسم کے دشمن سے محفوظ رہنے کے لئے کیا کیا جائے سو اس کے لئے ایک تو

اس کا علاج کیا ہے؟

قرآن نے یہ تدبیر بتائی ہے کہ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ (۸/۶۰) اپنی سرحدوں کو فوجی چھاؤنیوں سے مستحکم رکھو.

لیکن یہ اس تدبیر کا صرف خارجی پہلو ہے۔ اس خطرہ سے مصئونیت کا حقیقی علاج اور ہے۔ اسے قرآن نے ان چار لفظوں میں بیان کر دیا ہے کہ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا یَضُرُّکُمْ کَیْدُھُمْ شَیْئًا (۳/۱۲۰) اگر تم ثابت قدم رہے اور اپنا نظامِ معاشرہ قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل کر لیا، تو ان کی خفیہ تدبیریں اور سازشیں تمہارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکیں گی۔

بس یہ ہے اس خطرہ سے محفوظ رہنے کا صحیح، قابلِ اعتماد اور یقینی علاج، یعنی نظامِ معاشرہ کی قوانینِ خداوندی کے مطابق تشکیل۔ یہی وہ نظام ہے جس میں کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ جس میں کوئی کسی کی محنت کو غصب نہیں کر سکتا۔ جس میں ہر شخص کو بلا قیمت و بلا مشقت انصاف ملتا ہے۔ جس میں ہر انسانی بچہ محض انسان ہونے کی جہت سے، یکساں عزت کا مستحق قرار پاتا ہے۔ جس میں عورت اور مرد دونوں یکساں حقوق کے مالک ہوتے ہیں۔ جس میں کوئی انسان، اپنے آپ کو، سوائے قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے، کسی کا محکوم و محتاج نہیں پاتا۔ یہی ہے وہ نظام جس میں تمام افرادِ ملت، دل کے پورے سکون اور ذہن کے کامل اطمینان کے ساتھ ہر خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت تیار اور مستعد رہتے ہیں اور اس کے لئے جان تک دے دینے میں حیاتِ ابدی کا سرور پاتے ہیں۔ یہی ہیں وہ افراد جن کا عزم و استقلال تعداد کی قلت اور سامانِ حرب و ضرب کی کمی کو اس طرح پورا کر دیتا ہے کہ ان میں ایک ایک فرد دشمن کے دس دس پر بھاری ہوتا ہے۔ یہی ہیں وہ جن کے متعلق کہا کہ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَ رَحْمَۃٌ (۲/۱۵۷) ان پر خود خدا سلام و رحمت کے پھول برساتا ہے۔

اس کے سوا عزیزانِ من! ہندو کے مستقل خطرہ سے محفوظ رہنے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ وَاللّٰہُ عَلٰی مَا نَقُوْلُ شَہِیْدٌ۔

وَالسَّلَام!

نظریۂ پاکستان کیا ہے؟

مارچ ۱۹۷۰ء

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ انسان کو قوّتِ گویائی عطا کی گئی ہے۔ وہ اپنے مقصد کا اظہار الفاظ میں کر سکتا ہے، عَلَّمَهُ الْبَيَانَ خود خدا کا ارشاد ہے۔ انسان کی تمدنی زندگی کا دار و مدار اسی خصوصیت پر ہے، لیکن یہ خصوصیت اسی صورت میں نعمت ہے کہ ہم جو لفظ بولیں، سننے والوں کے ذہن میں اس کا مفہوم متعیّن ہو۔ اگر ایسا نہ ہو، اور ایک ہی لفظ کے معانی مختلف افراد مختلف لیں، تو اس سے زندگی اجیرن ہو جائے، مثلاً آپ اس ماجرا پر غور فرمائیں کہ آپ نیم بیہوشی کے عالم میں، شدّتِ پیاس سے کہیں — پانی — اور آپ کے گھر والوں میں سے کوئی ماچس کی ڈبیا لئے چلا آ رہا ہو اور کوئی لالٹین۔ ایک آپ کے سرہانے تولیہ لئے کھڑا ہو اور دوسرا بالٹی، کسی کے ہاتھ میں تیل کی شیشی ہو اور کوئی آپ کا جوتا تلاش کر رہا ہو — سوچئے کہ اگر صورت یہ ہو تو خدا کی یہ نعمت (قوّتِ گویائی) کس قدر عذاب بن جائے۔ یہ نعمت اسی صورت میں قرار پائے گی کہ جب آپ "پانی" کہیں، تو ہر سننے والا اس سے "پانی" مراد لے۔

یہ مثال تو زندگی کے عام معمولات سے متعلق ہے۔ اسے ذرا آگے بڑھائیے اور سوچئے کہ آپ اہم مسائلِ حیات کے متعلق جو الفاظ یا اصطلاحات استعمال کریں، اگر سننے والوں کے نزدیک ان کا متعیّن مفہوم نہ ہو، تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا! اسے سمجھنے کے لئے آپ خود اپنی تاریخ پر ایک نظر ڈال لیجئے۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے ایک نظامِ حیات پیش کیا ہے جسے اِسلام کی اصطلاح سے تعبیر کیا۔ اس کا مفہوم اس قدر واضح اور متعیّن تھا کہ موافق مخالف ہر ایک سمجھتا تھا کہ اس سے مراد کیا ہے۔ لیکن اس سے ذرا آگے چل کر ہمارے سامنے یہ نقشہ آتا ہے کہ ہر شخص

کی زبان پر اسلام ہے، لیکن ہر شخص کے نزدیک اس کا مفہوم جداگانہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ کہ وہی قوم جو اس اصطلاح کے متعین مفہوم سے امتِ واحدہ تھی، فرقوں میں بٹ گئی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئی۔ تاریخ میں مسلمانوں کے سینکڑوں فرقوں کا تذکرہ آپ کے سامنے آئے گا، لیکن ان میں کوئی ایک فرقہ بھی ایسا نہیں ملے گا جس نے یہ کہا ہو کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر کسی اور دین کی دعوت دے رہا ہے، ہر ایک اسلام کی طرف دعوت دینے کا مدعی تھا اور ہر فرقہ دوسرے کے دعوے کی تکذیب کرتا تھا۔ ماضی کو چھوڑیئے اور حال کی طرف آیئے، آج بھی مسلمانوں میں بیسیوں فرقے ہیں اور ان سب کا دعویٰ یہی ہے کہ وہ اسلام پر قائم ہیں اور اسی کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اس کے باوجود ہر فرقہ اپنے آپ کو اسلام کا علمبردار قرار دیتا ہے اور دوسروں کے اسلام کو کفر بتاتا ہے اور کوئی شخص اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کس کا دعوائے اسلام سچا ہے اور کس کا جھوٹا۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس اصطلاح کا کوئی متعین مفہوم سامنے نہیں، ان اصطلاحات کے مفہوم کے عدم تعین کا مظاہرہ ہم منیر کمیٹی کی روئیداد میں دیکھ سکتے ہیں۔ انہوں نے پاکستان کے علمائے کرام سے کہا کہ وہ بتائیں کہ مسلمان کسے کہتے ہیں، یعنی اس اصطلاح کا مفہوم کیا ہے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر تو اس سوال کا سرے سے کوئی جواب ہی نہ دے سکے اور جنہوں نے جواب دیا، ان میں سے کسی کا جواب دوسرے کے جواب سے ملتا نہیں تھا، ان بنیادی اصطلاحات کے مفہوم کے عدم تعین کا نتیجہ ہے کہ قوم اس قدر تشتت و انتشار اور فساد و خلفشار کا شکار ہو رہی ہے۔ ہر ایک کی زبان پر لفظ اسلام کا ہے لیکن ہر ایک کا راستہ جدا جدا اور منزل الگ الگ ہے، قرآنِ کریم نے تفرقہ کو جو شرک قرار دیا ہے (۳۰/۳۱-۳۲) تو اس کے یہ معنی نہیں کہ مسلمانوں کے مختلف گروہ خدا کے ساتھ بتوں کو پوجنے لگ گئے ہیں۔ توحید کے معنی ہیں ساری قوم کے سامنے ایک نصب العین حیات (جو خدا کا متعین کردہ ہو) اور شرک سے مراد ہے ہر گروہ کا الگ الگ نصب العین۔ یعنی اسلام کا اپنا اپنا مفہوم!

اسلام کا جداگانہ مفہوم

تشتت و انتشار کے عذاب میں گرفتار قوم کی ایک خرابی یہ بھی ہوتی ہے کہ اگر وہ کبھی ان خرابیوں کے ازالہ کی فکر کرے، تو بجائے اس کے کہ ان خرابیوں کے علل و اسباب پر غور کر کے انہیں دور کرنے کی کوشش کرے، وہ ان میں ایک اور خرابی کا اضافہ کر لیتی ہے — جیسے فرقہ بندی کی خرابیوں کو دور کرنے کے خیال سے اٹھنے والا، ایک نیا فرقہ بنا کر بیٹھ جاتا ہے اور پارٹیوں کے پھیلائے ہوئے فسادات کو مٹانے کا دعویدار، ان میں ایک اور پارٹی کا اضافہ کر دیتا ہے، چنانچہ لفظ اسلام کے مفہوم کے عدم تعین سے گھبرا کر، قوم نے (بجائے اس کے کہ وہ اس اصطلاح کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کرے) اب ان اصطلاحات میں ایک اور اصطلاح کا اضافہ کر لیا ہے اور وہ اصطلاح ہے

نظریۂ پاکستان کی اصطلاح

۔۔۔نظریۂ پاکستان ۔۔۔ اس جدید اصطلاح کو وضع کئے، (یا اختیار کئے) کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ اس کے بھی اتنے ہی مفہوم ہو گئے ہیں، جتنے مفاہیم لفظ اسلام کے تھے، اب ہر پارٹی نظریۂ پاکستان کے تحفظ کی مدعی ہے اور ہر پارٹی دوسری پارٹی سے، اس بنا پر برسرِ پیکار کہ نظریۂ پاکستان کے حامل ہم ہیں، فریقِ مخالف نہیں۔ آیئے ہم دیکھیں کہ اس اصطلاح کا مفہوم کیا ہے۔

پولیٹیکل سائنس (علم السیاسیات) کی رُو سے، مملکت (STATE) سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ ایک خطۂ زمین میں بسنے والے افراد، ایک ہیئتِ اجتماعیہ (انفرادی کے بجائے اجتماعی زندگی بسر کرنے) کا تہیہ کر کے، ایسا نظم و نسق قائم کریں، جس سے وہ ملک مستحکم ہو اور اس کے باشندے خوشحال اور ہر قسم کے خطرات سے مامون۔ اس مملکت کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ افرادِ مملکت کا تصورِ زندگی کیا ہے اور نظریات و معتقدات کس قسم کے۔ یہ افراد کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے، اس قسم کی مملکت کو قومی یا وطنی مملکت کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس مملکت کا ایک تصور قرآن نے دیا تھا اور وہ یہ کہ ایک قسم کا نظریۂ حیات اور فلسفۂ زندگی رکھنے والے افراد، اپنی منفرد ہیئتِ اجتماعیہ متشکل کرنے کا فیصلہ اور عزم کریں (ہمارے زمانے میں کمیونزم کے حاملین نے اس تصورِ مملکت کو اپنایا ہے) ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں، ہندوؤں کے پیشِ نظر ایک قومی یا وطنی مملکت کا قیام تھا، اس کے برعکس تحریکِ پاکستان کے پیشِ نظر اس قسم کی مملکت کا قیام تھا، جس کا تصور قرآن نے دیا تھا۔ اس کا صحیح نام تو قرآنی مملکت تھا لیکن غیر مسلموں کو سمجھانے کے لئے (نیز اسے تھیاکریٹک سٹیٹ سے متمیز کرنے کے لئے) پہلے علامہ اقبالؒ نے اور اس کے بعد قائدِ اعظمؒ نے اسے نظریاتی مملکت (IDEOLOGICAL STATE) کہہ کر پکارا۔ یعنی وہ مملکت جس کی بنیاد ایک خاص نظریۂ حیات (IDEOLOGY) پر ہوگی۔ اسی سے نظریۂ پاکستان (IDEOLOGY OF PAKISTAN) کی اصطلاح وجود میں آئی، یعنی ایسی مملکت جو میرے، آپ کے، یا ہندوستان میں بسنے والے افراد کی اکثریت کے یا وہاں کی پوری کی پوری آبادی کے ذاتی خیالات یا مقاصد کے مطابق متشکل نہیں ہوگی، بلکہ قرآنی اقدار کے فروغ اور برومندی کے لئے وجود میں لائی جائے گی۔

آگے بڑھنے سے پہلے، ایک نکتہ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ میں ان مقامات میں "اسلام"

لفظ اسلام کے بجائے قرآن

کی جگہ "قرآن" کا لفظ استعمال کر رہا ہوں، میں ایسا عمداً کر رہا ہوں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے (اور جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے لفظ "اسلام"

کا مروجہ مفہوم، متعیّن نہیں رہا، اس لئے جب اس لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے تو کسی کے سامنے نہ کوئی متعیّن مفہوم آتا ہے اور نہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معانی متعیّن کرنے کے لئے کس طرف رجوع کیا جائے۔ اس کے برعکس، جب لفظ "قرآن" استعمال کیا جائے تو اس سے ہر ایک کی نگاہ ایک خاص کتاب کی طرف اٹھتی ہے جس کے متعلق ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ وہ خدا کی عطا کردہ ہے اور ہمارے لئے ابدی راہنمائی کا ذریعہ لہٰذا اس ذہنی خلفشار اور نظری انتشار کے عالم میں "قرآن" کے لفظ سے کم از کم توجہات ایک مرکز پر تو مرکوز ہو جاتی ہیں، یہ وجہ ہے کہ میں اسلام کے بجائے قرآن کا لفظ استعمال کیا کرتا ہوں، ورنہ اگر صدرِ اوّل کی طرح اسلام کا متعیّن مفہوم ہمارے سامنے ہوتا تو اسلام اور قرآن کے الفاظ کا عملاً مفہوم ایک ہی ہوتا ـــــ اسلام اس نہج زندگی کا نام ہے جو قرآن کے مطابق بسر کی جائے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن ؛ نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

چونکہ گروہ بندانہ مفاد کا تقاضا یہ ہوتا ہے (خواہ وہ مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو اور خواہ سیاسی پارٹیوں کی صورت میں) کہ قوم کے سامنے، اس کے نظریۂ حیات اور نصب العین زندگی کے متعلق کوئی متفق علیہ اور متعیّن مفہوم نہ آنے پائے، اس لئے قرآن کا نام سامنے لانے سے ان کی طرف سے یہ اعتراض وارد کر دیا جاتا ہے کہ قرآن بے شک ایک متعیّن کتاب کا نام ہے لیکن اس کتاب کا مفہوم تو متعیّن نہیں، اس کی تعبیر الگ الگ کی جاتی ہے لہٰذا اس سے بھی انتشار اور خلفشار کی وہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو لفظ "اسلام" سے پیدا ہوتی ہے۔

اس پر اعتراض

اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ (انسانی تصانیف میں بھی) ایک عمدہ کتاب کی بنیادی خوبی یہ قرار دی جاتی ہے کہ وہ اپنے مفہوم کو واضح اور متعیّن طور پر سامنے لائے، اگر کوئی تحریر ایسے الفاظ میں منضبط ہو کہ وہ ہر شخص کو، اس کی منشاء کے مطابق (الگ الگ) معانی دیدے، تو وہ کتاب اٹھا کر پھینک دینے کے قابل سمجھی جائے گی، جب انسانی تصانیف کے عمدہ ہونے کا معیار یہ ہے تو ایک ایسی کتاب جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ وہ کسی انسان کی نہیں، بلکہ انسانوں سے بلند و بالا، خود خدا کی تصنیف ہے، کیا اس کی کیفیت یہ ہو گی کہ اس کے الفاظ مختلف اور متضاد معانی دینے کے قابل (CAPABLE) ہوں، بالخصوص جب اس کا دعویٰ یہ ہو کہ اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں ـــــ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا (۴/۸۲) ـــــ کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے۔ اگر یہ کتاب خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتی تو اس میں بہت سے اختلافات پائے جاتے ـــــ سوچئے کہ جس کتاب کا بنیادی دعویٰ یہ ہو کیا

اس کی کیفیت یہی ہو گی کہ وہ ہر ایک کو الگ الگ تعلیم دے؟

دوسری بات یہ سمجھ لینی چاہیئے کہ قرآنِ عظیم کی تعلیم کا ایک حصّہ وہ ہے جس میں اس نے انسانی زندگی کے لئے

آیاتِ محکمٰت و متشابہات

راہنمائی دی ہے، انہیں اصولِ حیات یا مستقل اقدار کہا جائے گا ــــ یہ اصول و اقدار بالکل واضح اور متعیّن ہیں اور ان کے سمجھنے میں کوئی اختلاف نہیں پیدا ہو سکتا۔ امورِ مملکت کا تعلّق اسی گوشہ سے ہے۔ قرآنی تعلیم کا دوسرا گوشہ وہ ہے جس کا تعلّق حقائقِ کائنات اور مابعد الطبیعاتی مسائل (METAPHYSICAL) سے ہے۔ ان حقائق کے سمجھنے کا مدار، انفرادی فکر اور بہ ہیئتِ مجموعی انسانی علم کی سطح پر ہے۔ جوں جوں انسانی علم کی سطح بلند ہوتی جائے گی یہ حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ اور کوئی شخص جس قدر زیادہ غور و فکر سے کام لے گا۔ وہ انہیں اسی قدر زیادہ عمدگی سے سمجھ سکے گا مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ:۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ ــــ (۴۲/۲۹)

اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے ارض و سمٰوٰت (زمین اور دیگر اجرامِ فلکی) کو پیدا کیا اور ان میں ذی حیات کو پھیلا دیا۔ اور وہ اس پر بھی قادر ہے کہ اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق، زمین اور ان اجرام کے ذی حیات کو اکٹھا کر دے۔

ظاہر ہے کہ اس آیت کا مفہوم آج سے کچھ عرصہ پہلے کچھ اور لیا جاتا تھا اور آج (بالخصوص تسخیرِ قمر کے بعد) اس کا مفہوم واضح ہوتا چلا جا رہا ہے، اور جس دن کسی اور کرّہ کے ذی حیات (خواہ وہ جراثیم ہی کیوں نہ ہوں) زمین پر لائے جائیں گے تو اس آیت کا مفہوم متعیّن ہو جائے۔ اسی قسم کے حقائق ہیں، جن کا صحیح مفہوم سامنے آنے کے سلسلہ میں فرمایا کہ:۔

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ .... (۴۱/۵۳)

ہم انہیں خارجی کائنات اور خود ان کی اپنی دنیا میں اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے، تا آنکہ یہ بات واضح طور پر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن جو کچھ کہتا ہے، وہ حقیقت پر مبنی ہے۔

یوں ان حقائق کا مفہوم متعیّن ہوتا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ ان نشانیوں کے بے نقاب ہونے کے بعد بھی ان کا مفہوم، ہر شخص کی علمی اور فکری استعداد کے مطابق اس کی سمجھ میں آئے گا۔ اس کے لئے عربی زبان سے واقف ہونا بیشک ضروری ہو گا لیکن محض اس زبان سے واقف ہونا کافی نہیں ہو گا ــــ آج کتنے لوگ ہیں جو انگریزی زبان کا علم رکھنے کے باوجود، آئن سٹائن کی اصطلاح (RELATIVITY) کا صحیح مفہوم سمجھ سکنے کے قابل ہیں۔

لیکن یہ شرائط، بسیط حقائق کے مفہوم سے متعلق ہیں۔ جہاں تک انسانی زندگی کی راہنمائی اور امورِ مملکت کا تعلق ہے، قرآنی اصول واقدار کا مفہوم متعین اور واضح ہے۔ جب وہ اسلامی مملکت کے متعلق کہتا کہ ــــ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے ــــ تو فرمائیے کہ اس اصول کا مفہوم سمجھنے میں کس قسم کا الجھاؤ یا اختلاف پیدا ہوسکتا ہے؟ (یاد رکھیے، قرآن، اصول دیتا ہے۔ ان اصولوں کو، بروئے کار لانے کا پروگرام، ہر دور کی قرآنی مملکت خود متعین کرتی ہے)۔ــــ

لہٰذا، اگر نظریۂ پاکستان (یا اسلامی مملکت کے اصول ومبانی) کا تعین قرآن کریم کی رُو سے کیا جائے تو اس کے مفہوم میں نہ کوئی الجھاؤ یا ابہام رہ سکتا ہے، نہ اختلاف یا تضاد پیدا ہوسکتا ــــ

قرآن کریم کی رُو سے، اسلامی مملکت کی بنیاد اس حقیقت کبریٰ پر ہے کہ اس میں کوئی شخص نہ کسی دوسرے شخص کا محکوم ہوتا ہے نہ محتاج۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

کس در ایں جا سائل ومحروم نیست عبد و مولا حاکم ومحکوم نیست

اس میں حکومت صرف خدا کی ہوتی ہے، لیکن یہ اصول وضاحت طلب ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا خود حکومت کرنے کے لئے سامنے نہیں آتا۔ اس لئے خدا کی حکومت کس طرح قائم ہوگی؟ ایک حکومت تو شخصی ہوتی ہے یعنی مملکت کا پورا اقتدار ایک شخص

خدا کی حکومت کا مطلب

کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہ جو حکم دے، اس کی اطاعت ضروری ہوتی ہے۔ اس کی مملکت میں نہ کوئی شخص یہ جان سکتا ہے کہ اس (صاحبِ حکومت) نے کل کو کیا حکم دے دینا ہے، نہ کسی کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے وہ حکم کیوں دیا ہے۔ اس اندازِ حکومت کو ملوکیت کہا جاتا ہے۔ قرآن، اس قسم کی حکومت قائم نہیں کرنا چاہتا۔ اس لئے "خدا کی حکومت" بھی ملوکیت کے انداز کی نہیں ہوتی۔ دوسرا اسلوبِ حکومت یہ ہے کہ اطاعت قوانین کی ہو اور قوانین کی غرض وغایت اور علت وحکمت کا ہر ایک کو علم ہو ــــ قرآن اسی نہج کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لئے خدا نے ایک ضابطۂ قوانین دے دیا ہے، جس میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ ان قوانین کی حکمت اور غایت کیا ہے۔ اس ضابطۂ قوانین (قرآن) کی اطاعت کا نام خدا کی محکومیت ہے اور یہی مومن اور کافر کا امتیازی نشان ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔ (۵/۴۴)

جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے تو یہی لوگ کافر ہیں۔

اور اس کے بعد، خود رسولؐ اللہ سے ارشاد ہوا کہ:۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ (۵/۴۸)

(اے رسولؐ!) تو ان لوگوں میں کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کر دان کے معاملات کے فیصلے اس کے مطابق کر۔ جب یہ کتاب (الحق) تمہارے پاس آچکی ہے تو پھر انسانوں کے خیالات اور آراء کا اتباع کیوں کیا جائے!۔

یہ ہے خدا کی حکومت قائم کرنے (یا اس کی محکومیت اختیار کرنے) کا عملی طریقہ، یعنی قرآنی اصول و اقدار کو حکومت کا آئین قرار دینا اور اس کے قوانین و ضوابط کو ملک میں نافذ کرنا۔ یہ وہ بنیادی حقیقت تھی جس کا اظہار قائدِ اعظمؒ نے ان الفاظ میں کیا تھا جو نظریۂ پاکستان کا مفہوم متعین کرتے ہیں، اور جس مقصد کے لئے انہوں نے حصولِ پاکستان کے لئے اس قدر جدوجہد کی تھی۔ یہ الفاظ انہوں نے ۱۹۴۱ء میں، حیدر آباد (دکن) میں، عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کے ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمائے تھے۔ اورینٹ پریس آف انڈیا نے انہیں نشر کیا تھا اور (علاوہ دیگر اخبارات) انقلاب (لاہور) نے انہیں چھاپا تھا۔ الفاظ یہ تھے:۔

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت صرف خدا کی ہوتی ہے جس کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن مجید کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں، اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

یہ ہے نظریۂ پاکستان یعنی حکومت کا حق خدا کے سوا کسی کو نہیں، اور اس کی عملی شکل یہ ہے کہ مملکت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود، خدا کی کتاب کے اصول و احکام کی رُو سے متعین ہوں۔ بالفاظِ دیگر نظریۂ پاکستان سے مراد ہے قرآن کی حکمرانی۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کے لئے "نظریہ" کا لفظ بھی موزوں نہیں، اس لئے کہ ہمارے ہاں نظریہ انگریزی

نظریہ کا لفظ

زبان کے لفظ (THEORY) کے[1] معنوں میں استعمال ہوتا ہے، جو عمل (PRACTICE) کے بالمقابل ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ نظری مسائل کہا ہی ان مسائل کو جاتا ہے جن کے متعلق محض لفظی بحث

[1] قائدِ اعظمؒ نے بھی (THEORY OF PAKISTAN) کی اصطلاح استعمال کی تھی، مثلاً انہوں نے ۸ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے وقت یہی الفاظ استعمال کئے تھے، لیکن یہ اس لئے کہ انگریزی زبان میں اس مفہوم کے لئے (THEORY) یا (IDEOLOGY) کے الفاظ ہی مستعمل ہیں۔

ہوتی رہے اور وہ عمل میں نہ لائے جائیں۔ علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ:۔ ؎

میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہوگا ٭ مسائلِ نظری میں اُلجھ گیا ہے خطیب!

وہ (ابلیس کی مجلس شوریٰ میں) اس قسم کے مسائل کو "الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات" کہہ کر پکارتے ہیں اور انہیں اُمت کی تباہی کا بنیادی سبب قرار دیتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ نظریہ (THEORY) کی طرح آئیڈیالوجی کا لفظ بھی کچھ زیادہ وزنی نہیں سمجھا جاتا، اس کے متعلق بھی ذہن میں یہی آتا ہے کہ یہ ایک تخیّلاتی سا تصور ہے جو عمل میں نہیں آسکتا، چنانچہ (IDEALIST) کہا ہی اسے جاتا ہے جس کی کیفیت یہ ہو کہ ــــ افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار ــــ اقبالؒ نے جب (۱۹۳۰ء میں) پاکستان کا تصور پیش کیا تھا تو سیاسئین نے اسے یہ کہہ کر ناقابلِ اعتنا قرار دے دیا تھا کہ یہ محض ایک شاعر کا خواب ہے، جس کا دنیائے ممکنات سے کوئی تعلق نہیں۔ خود مغرب میں بھی (IDEALISTS) کا لفظ، تصورات کی دنیا میں بسنے والوں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ قرآن نے اس کے لئے "کلمۃ اللہ" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس کے معنی ہیں ایسا بنیادی اصول جس میں نشو و نما پاکر محسوس پیکر اختیار کر لینے کی صلاحیت ہو چنانچہ

کلمۃ اللہ

جب بدر کے میدان میں کفر اور اسلام کا پہلا عملی تصادم ہوا ہے تو اس کی غرض و غایت کے متعلق کہا۔ وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (9/40) تاکہ ان لوگوں کا کلمہ جنہوں نے صداقت سے انکار و سرکشی کی راہ اختیار کی ہے مغلوب ہو، اور خدا کا کلمہ غالب آجائے، اس لئے کہ یہ کلمہ وہ ہے جو حکمت اور قوت پر مبنی ہے یہی وہ کلمہ ہے جسے سورۂ ابراہیم میں ایک مثال کے ذریعے یوں سمجھایا گیا ہے کہ كَلِمَةً طَيِّبَةً کی مثال یوں سمجھو ــــ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ (14/24) اس پھلنے پھولنے والے درخت کی طرح جس کی جڑیں محکم ہوں اور جس کی شاخیں آسمان کی بلندیوں میں جھولے جھول رہی ہوں، تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا (14/25) اور وہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہر موسم میں پھل دے۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہاں کلمۃ اللہ کی کیا خصوصیات بتائی گئی ہیں۔ وہ نہایت مضبوط جڑوں والا تناور درخت، جو ہمیشہ اپنا پھل دیتا رہتا ہے، یعنی وہ محض ایک نظری مسئلہ یا تخیّلاتی تصور نہیں، وہ ایک ایسا فارمولا ہے جو عمل میں لایا جاتا ہے تو اس کے دعویٰ کی صداقت اس کے محسوس نتائج سے سامنے آجاتی ہے اس کے برعکس كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ (14/26) ہے، جس کی کیفیت اس پودے کی سی ہے جس کی جڑیں زمین کے اوپر ہی اوپر ہوں اور ہوا کے ذرا سے تیز جھونکے سے اکھڑ جائیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، قرآنِ کریم نے دین کی اساس و بنیاد اس حقیقت کو قرار دیا ہے کہ حقِ حکومت

خدا کے سوا کسی کو نہیں اس حقیقت کے اظہار کے لئے اس نے ایک جامع فقرہ استعمال کیا ہے اور وہ ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دنیا میں کوئی ہستی (شخص، گروہ یا ادارہ) ایسی نہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے بجز اللہ کے محکومیت صرف خدا کی اختیار کی جا سکتی ہے "حکم اس ہے اک وہی باقی بتان آزری" اس انقلاب انگیز اساسی پیغام کا جو ترجمہ آج کل کیا جاتا ہے یعنی یہ کہ دنیا میں کوئی شے یا ہستی پرستش کے قابل نہیں سوائے اللہ کے، تو یہ تصور اس دور کا پیدا کردہ ہے جب اسلام کو دین کی سطح سے اتار کر، مذہب کی سطح پر لا کھڑا کر دیا گیا تھا۔ دین میں الٰہ سے مراد، صاحبِ اقتدار و اختیار ہوتا ہے۔ مذہب میں اس کا مفہوم "پرستش کی شے" ہو جاتا ہے۔ اسلام کا اساسی اصول، لا الٰہ الا اللہ کے مختصر لیکن بے حد جامع الفاظ میں مرتکز ہے اور اسی کو کلمہ یا کلمہ طیبہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جب دین میں اسے کلمہ کہا گیا تھا تو اس سے جو عملی نقشہ سامنے آتا تھا، اس کے متعلق قرآنی تصریحات اوپر پیش کی جا چکی ہیں، لیکن اس کے بعد یہی کلمہ، ایک رسم بن کر رہ گیا، یا زیادہ سے زیادہ علم الکلام کا ایک مسئلہ، یا اہل تصوف کا سرِ باطن، جنہوں نے "وحدت الوجود" کے فلسفہ کی رو سے اس کے معنی یہ کر دیئے کہ دنیا میں کوئی معبود ایسا نہیں جو خود خدا نہ ہو، یعنی انسانوں نے جتنے معبود تراش رکھے ہیں وہ سب خدا ہی کی مختلف شکلیں ہیں، معاذ اللہ۔ معاذ اللہ۔) بہرحال، میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن نے اسلامی مملکت کے اساسی اصول کو لا الٰہ الا اللہ کے کلمہ سے تعبیر کیا ہے اور اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ، قرآن مجید کے احکام و اصول و اقدار کو حاصل ہو گا۔

لیکن ہمارے ہاں، جو حضرات اسلامی حکومت کے قیام اور نظریۂ پاکستان کے تحفظ کے مدعی ہیں۔ (اور آج کون ہے جو اس کا مدعی نہیں) ان میں سے کوئی بھی اس اساس کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں، اسلئے کہ اس اساس پر اُمتِ واحدہ کی عمارت استوار ہوتی ہے، جس میں نہ مذہبی فرقوں کی کوئی گنجائش ہوتی ہے نہ سیاسی پارٹیوں کے لئے کوئی جگہ ــ نہ جغرافیائی حدود کی بنا پر علاقائی تفریق روا رکھی جا سکتی ہے اور نہ نسلی امتیاز کی بنا پر کوئی تمیز۔ اس میں ساری کی ساری اُمت، غیر مسلموں کے مقابلہ میں ایک پارٹی (حزب اللہ) ہوتی ہے، جس کے اندر فرقہ سازی، یا پارٹی بازی، یا اسی قسم کی کوئی اور تفریق، شرک سمجھی جاتی اور حکمتِ فرعونی قرار پاتی ہے ($\frac{28}{4}$)۔ یہ وجہ ہے کہ یہ حضرات (لفظ اسلام کی طرح) "نظریۂ پاکستان" کے الفاظ کو تو اس شدّومد سے دہراتے رہتے ہیں، لیکن اس کا متعیّن مفہوم کبھی پیش نہیں کرتے۔ فرقہ بندیوں اور پارٹی بازیوں میں الجھی اور کھوئی ہوئی قوم، توحید خالص کی طرف آنا ہی نہیں چاہتی۔ قرآن کے الفاظ میں ــ وَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَ اِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ($\frac{39}{45}$) ان کی کیفیت یہ ہے کہ جب ان لوگوں

کے سامنے، جو آخرت کے منکر ہیں، خدائے واحد کا تصور پیش کیا جاتا ہے تو وہ سخت کبیدہ خاطر ہو جاتے ہیں۔ اور جب خدا کے علاوہ، اوروں کا ذکر کیا جائے تو وہ ہشاش بشاش ہو جاتے ہیں۔

دوسری جگہ ہے کہ اہلِ جہنم سے کہا جائے گا کہ اِذَا دُعِیَ اللّٰہُ وَحْدَہٗ کَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ یُّشْرَکْ بِہٖ تُؤْمِنُوْا۔ جب تمہیں خدائے واحد کی طرف دعوت دی جاتی تھی تو تم اس سے انکار کرتے تھے، اور جب اس کے ساتھ اوروں کو بھی شریک کیا جاتا تھا، تو تم اس اسلوبِ حکومت کو صحیح تسلیم کر لیتے تھے، حالانکہ حقیقت یہ تھی (اور ہے) کہ فَالْحُکْمُ لِلّٰہِ الْعَلِیِّ الْکَبِیْرِ۔ (۴۰/۱۲) حکومت صرف خدا کی ہو سکتی ہے، وہی عُلوّ اور کبریائی کا مالک ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔ اِذَا ذَکَرْتَ رَبَّکَ فِی الْقُرْاٰنِ وَحْدَہٗ وَلَّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِھِمْ نُفُوْرًا (۱۷/۴۶) جب تو قرآن میں خدائے واحد کا ذکر کرتا ہے تو یہ لوگ نفرت آگیں انداز سے مُنہ موڑ کر چل دیتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی کیفیت یہ ہے کہ خدائے واحد (یعنی قرآنِ خالص) کی حکمرانی کو نہ ہمارا مذہب پرست طبقہ گوارا کرتا ہے نہ مغرب زدہ طبقہ — نہ دیر میں، نہ حرم میں خودی کی بیداری؛ کیونکہ اس سے ان کے مفادات پر زد پڑتی ہے اور ان کے فرقے اور پارٹیاں باقی نہیں رہتیں، لیکن ان میں اتنی جرأت بھی نہیں کہ یہ اپنے اس شرک کا اعلان یا اعتراف کریں اس کے لئے انہوں نے ٹیکنیک یہ اختیار کر رکھی ہے کہ اسلام یا نظریۂ پاکستان جیسی اصطلاحات کا مفہوم متعیّن نہ کیا جائے، انہیں مبہم رکھا جائے۔

ہمارے ہاں یہ شعر جو زبان زدِ خلائق ہے کہ:۔

پاکستان کا مطلب کیا ——— لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ!

معلوم نہیں کہنے والے کے سامنے اس کا وہ مفہوم تھا یا نہیں جو قرآن کریم کی رُو سے اوپر بیان کیا گیا ہے۔ لیکن بات اس نے پتا کی کہی تھی۔ حقیقت یہی ہے کہ پاکستان (یا اسلامی مملکت) کی اساس، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہے، اور اس سے مُراد ہے خدا کی کتاب (قرآن مجید) کی حکمرانی۔ اگر باین نرسیدی تمام بولہبی است۔ یہی نظریۂ پاکستان سے مراد ہے۔

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

اسلامی نظریۂ قومیت

خطاب بتقریب سعید عیدِ میلاد النبیؐ، منعقدہ ۹ مئی ۱۹۷۱ء

عزیزانِ گرامی قدر! ــــ سلام و رحمت

یوں تو کشتیٔ عمرِ رواں کے ہر مسافر کو ساحلِ مراد تک پہنچنے کے لئے روشنی کے مینار کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن جب صورت یہ ہو کہ ــ شبِ تاریک و بیمِ موج و گرداب چنیں حائل ــ تو اُس وقت اس مینار کی راہ نمائی کی ضرورت اور بھی اشد اور اس کی اہمیت کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اس وقت، مملکتِ پاکستان کے مورِ ناتواں کا سفینۂ برگِ گل کچھ اس طرح، ہجومِ بلا میں گھر رہا ہے کہ ہر قلبِ حساس کاشانۂ صد اضطراب ہے اور ہر چشمِ بینا آئینۂ ہزار خطرات۔ خارجی قوتوں کی پیدا کردہ تلاطم خیزیاں اور سیلاب انگیزیاں تو شروع ہی سے، اسے اپنے گھیرے میں لئے چلی آ رہی تھیں، لیکن اب جو خود کشتی کے مسافروں نے اس کے پیندے میں سوراخ کئے ہیں، تو اس کی سلامتی مخدوش ہو گئی ہے[1] ظاہر ہے کہ جب تباہیاں اور بربادیاں اس طرح اندر اور باہر سے یورش کر کے اُمنڈ آئیں اور تاریکیوں کے بادل چاروں طرف چھا رہے ہوں تو روشنی کے مینار کی راہ نمائی کس قدر عافیت کا آخری سہارا بن جاتی ہے ہماری آفت رسیدہ کشتیٔ اُمت کے لئے روشنی کا یہ مینار، اُس حاملِ قندیلِ آسمانی کا اسوۂ حسنہ ہے، جسے خود اس کے بھیجنے والے نے سراجاً منیراً کہہ کر پکارا ہے (۳۳/۴۶) اور جس کی شمعِ نورانی کو نور السمٰوٰت والارض قرار دیا ہے۔ ہم آج اُسی درخشندہ روشنی کے پائندہ مینار سے راہ نمائی حاصل کرنے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں تاکہ ہماری یہ ضعیف و ناتواں سی کشتی اس گردابِ بلا سے نکل کر صحیح و

---

[1] مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کی عوامی لیگ کی باغیانہ سرگرمیوں کی طرف اشارہ ہے۔

سلامت ساحلِ مُراد تک پہنچ جائے۔

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، پاکستان دشمن قوتیں، روزِ اوّل ہی سے ہمارے درپئے تخریب چلی آ رہی ہیں۔ لیکن ان کے حملوں کی مثال آسمان سے گرنے والی بجلی کی سی تھی جو عمارت کے بالائی حصّے (UPER-STRUCTURE) کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ لیکن اس دفعہ جو حملہ ہم پر ہوا ہے[1] اس کی مثال زلزلہ کی سی ہے، جو عمارت کی بنیاد کو تہ و بالا کر دیتا ہے اور اس کے بعد اس کا بالائی حصّہ خود اپنے بوجھ سے نیچے آ گرتا ہے۔ میں آج کی نشست میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ بنیاد کیا تھی جس پر ہماری اس مملکت کی رفیع الشان عمارت استوار ہوئی تھی اور حالیہ یورش اور سازش سے اس بنیاد میں کس طرح تزلزل واقع ہو گیا ہے۔ علّامہ اقبالؒ نے اپنے متعلق کہا تھا کہ — میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو — اور میں اپنے متعلق اس سے زیادہ اور کیا عرض کروں کہ میری تمام سرگزشت، قرآنی نظریۂ حیات کی تعلیم و تلقین کی، سعیٔ نامشکور ہے۔ میں نے اس سعی کو "نامشکور" اس لئے کہا ہے کہ میں قریب تیس سال سے ان تصورات کو مسلسل قوم کے سامنے پیش کر رہا ہوں لیکن اس دبستانِ فکر و نظر کے طلباء کی کیفیت یہ ہے کہ یہ ہر بار امتحان میں فیل ہو جاتے ہیں اور مجھے، اُسی کلاس کو، بار بار، الف، بے، سے سبق شروع کرانا پڑتا ہے۔ غالبؔ کے الفاظ میں ؎

پاکستان پر تازہ حملہ

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ "رفت" گیا، اور "بُود" تھا

بنابریں، میں اس قصۂ زلف چلیپا کو آج پھر از سرِ نو چھیڑنا چاہتا ہوں اور بتانا چاہتا ہوں کہ اسلام کا نظریۂ قومیّت کیا ہے اور یہ نظریہ کس طرح خود اسلام کی اساسی تعلیم اور مملکتِ پاکستان کی اصل و بنیاد ہے اور اس باب میں ہمیں اس ذاتِ اقدس و اعظمؒ کے تابندہ نقوشِ قدم سے کیا راہ نمائی ملتی ہے جو ہر راہ روِ سفرِ حیات کے لئے خضرِ طریقت ہیں۔ وَمَا تَوفِیقِی اِلَّا بِاللہِ العَلِیِّ العَظِیم۔

عزیزانِ من! قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ انسان نے جب اپنی تمدنی زندگی کی ابتدا کی ہے تو وہ ایک مختصر

---

[1] طلوعِ اسلام کا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔

انسان کی ابتدائی زندگی

سی آبادی تھی، جو ایک گروہ کی شکل میں بستی رہتی تھی وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ لیکن بعد ازاں جب ان کے مفادات میں ٹکراؤ ہوا، تو ان میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے فَاخْتَلَفُوْا۔ (۱۹/۱۰) انہی اختلافات و تنازعات کا نتیجہ وہ فساد کی چنگاریاں اور خون کے چھینٹے تھے جنہیں ملائکہ نے ہیولیٰ آدم میں بھانپا تھا اور خدا سے کہا تھا کہ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ (۲/۳۰) کیا تو کرۂ ارض پر اس مخلوق کو صاحبِ اقتدار بنانا چاہتا ہے جو وہاں خوں ریزیاں کرے گی اور فساد کی آگ بھڑکائے گی۔ یہی وہ خوں ریزی تھی جسے قرآن نے ہابیل و قابیل کے مشہور قصے میں تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے اور جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ زمین پر پہلا قتل تھا قرآن نے نہ تو ہابیل اور قابیل کا نام لیا ہے اور نہ ہی یہ کہا ہے کہ وہ نوعِ انسان کا پہلا قتل تھا۔ اس نے جو کچھ کہا ہے وہ اس نظریۂ زندگی کی اساس ہے جو آج کی نشست میں ہمارا موضوعِ سخن ہے اور جس میں فکرِ انسانی کے لئے ہزار سامانِ تدبر موجود ہے وہ کہتا

آدم کے دو بیٹے

ہے کہ آدم کے دو بیٹے تھے ــــ یعنی بنی آدم کے دو افراد ــــ "بیٹے" کہنے سے اس نے وہ سب کچھ کہہ دیا جس کا اظہار اس کے مقصدِ پیشِ نظر کے لئے ضروری تھا، یعنی ان دونوں کی نسل ایک تھی، اُن کا وطن ایک تھا، اُن کی زبان ایک تھی۔ آج کی اصطلاح میں یوں سمجھیے کہ ذہنِ انسانی نے قومیت کی تشکیل کے لئے جن جن عناصر کے اشتراک کو ضروری قرار دیا ہے وہ ان دونوں میں سب موجود تھے اور اس طرح وہ دونوں ایک ہی قوم کے افراد تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان میں سے ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا۔ کیوں قتل کر دیا؟ اس لئے کہ ان میں نظریۂ زندگی کا اختلاف تھا ایک کا نظریہ یہ تھا کہ خدا کے نزدیک وجۂ تقرب، قوانینِ خداوندی کی نگہداشت (تقویٰ) ہے۔ اور دوسرا قوت کے نشہ میں بدمست تھا، اس نے اُسے قتل کر دیا۔ اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، نسل، زبان، رنگ، وطن کا اشتراک انسانوں کو باہمی خوں ریزیوں سے نہیں بچا سکتا۔ یہ صرف مبنی برحقیقت نظریۂ حیات ہے جس سے انسانوں میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور قلب و نگاہ کی یہی ہم آہنگی و یک رنگی، انسانوں کے باہمی تصادمات کو روک سکتی ہے، اسی سے فساد مٹ سکتے اور خوں ریزیاں رُک سکتی ہیں چنانچہ جہاں قرآن نے کہا ہے کہ انسانوں میں اختلافات رونما ہو

انبیاء کی تعلیم

گئے، تو اسی سلسلہ میں دوسری جگہ مذکور ہے کہ خدا نے انبیاء کو بھیجا تاکہ وہ وحیٔ خداوندی کی رُو سے لوگوں کے باہمی اختلافات کو دُور کریں اور اس طرح انہیں پھر اُمّتِ واحدہ بنا دیں۔ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ

بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ (۲/۲۱۳) نوعِ انسان ایک برادری تھی (پھر انہوں نے آپس میں اختلافات پیدا کر لئے تو) خدا نے انبیاء کو بھیجا جو مبشر بھی تھے اور منذر بھی، اور ان کے ساتھ کتاب نازل کی، تاکہ وہ لوگوں کے اختلافات اس کے ذریعے مٹا دیں۔

آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت کی ساری تاریخ، اسی بنیادی حقیقت کی بصیرت افروز و دل کشا داستان ہے یعنی انسان، رنگ، نسل، زبان، وطن کے اختلاف کی بنا پر، قبیلوں اور گروہوں میں بٹ کر، ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن جاتے تھے اور حضرات انبیاء کرامؑ تشریف لا کر، ان میں، نظریۂ حیات کی بنا پر ہم آہنگیٔ فکر و نظر پیدا کر کے، انہیں ایسی اُمّت بنا دیتے تھے جس میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا تھا۔ بالفاظِ دیگر، حضرات انبیاء کرامؑ کی بعثت اس حقیقت کی شہادت ہے کہ انسانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کی بنیاد کیا ہو سکتی ہے — نسل، رنگ، زبان وطن کا اشتراک یا نظریۂ زندگی کی یکسانیت!— اس داستان کی ابتداء حضرت نوحؑ کے تذکارِ جلیلہ سے ہوتی ہے ارشاد ہے لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ (۷/۵۹) ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، یہاں اِلٰی قَومِہٖ کہہ کر یہ واضح کر دیا کہ حضرت نوحؑ اُسی قوم کے ایک فرد تھے، دوسری جگہ انہیں اَخَاھُمْ کہہ کر اُس کی مزید وضاحت کر دی کہ وہ اور دیگر افرادِ قوم ایک ہی نسل سے متعلق تھے، یعنی ان سب کی نسل بھی ایک تھی اور وطن بھی ایک، ایک اور جگہ کہا ہے کہ ہر رسول کی زبان بھی وہی ہوتی تھی جو اس کی قوم کی زبان تھی، یعنی ان میں زبان کا اشتراک بھی تھا۔ اب ظاہر ہے کہ انسانوں کے خود ساختہ معیارِ قومیّت کے لحاظ سے وہ ایک ہی قوم کے افراد تھے، لیکن حضرت نوحؑ نے یہ کہہ کر ان کی مخالفت کی کہ جس نظریۂ زندگی کے تم حامل ہو، وہ باطل ہے کہا جائے گا کہ قوموں میں اس قسم کے مصلحین اخلاق پیدا ہوتے رہتے ہیں، جو قوم کے اخلاقی عیوب کی مخالفت کرتے اور ان کی اصلاح کا بیڑہ اٹھاتے ہیں، اس کے باوجود وہ اسی قوم کے افراد رہتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے اور جب مذہب کو (اخلاقیات کی طرح) ایک پرائیویٹ مسئلہ سمجھ لیا جائے، تو اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ لیکن انبیاء کرامؑ دین کے داعی ہوتے تھے اور دین کسی کا پرائیویٹ معاملہ نہیں ہوتا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اُسی قوم سے جن افراد نے حضرت نوحؑ کی دعوت پر لبیک کہا، وہ ایک مختلف قوم کے افراد قرار پا گئے۔ چنانچہ قرآن کریم نے انہیں جماعتِ مؤمنین کہہ کر اس کی تصریح کر دی کہ وہ اپنی قوم سے الگ، ایک اور قوم کے افراد بن گئے تھے اور ان میں اور ان کی (سابقہ) قوم میں کوئی شے قدرِ مشترک نہیں رہی تھی، اور وطن اور زبان تو ایک طرف، ان کا خاندانی رشتہ بھی منقطع ہو گیا تھا، چونکہ یہ تفریق و تخصیص پہلی دفعہ سامنے آئی تھی، اس لئے قرآن کریم نے اس کی مزید وضاحت یہ کہہ کر کر دی کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا کہ حضرت

نوحؑ کے "اہل" کو غرقابی سے بچا لیا جائے گا۔ جب ان کا بیٹا ان کے سامنے ڈوبنے لگا، تو انہوں نے خدا سے کہا کہ آپ نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میرے "اہل" کو بچا لیا جائے گا، تو پھر میرے بیٹے کو کیوں نہیں بچایا جاتا۔ تو اس کے جواب میں کہا گیا کہ اے نوحؑ! تیرا یہ خیال غلط ہے کہ تیرا بیٹا تیرے اہل میں سے ہے اِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ اَھْلِکَ ج (۱۱/۴۶) چونکہ اس کا نظریۂ زندگی مختلف ہے، اس لئے وہ تیرا بیٹا ہونے کے باوجود تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ اسی طرح اُن کی بیوی کے متعلق بھی کہا کہ چونکہ وہ نظریۂ زندگی میں تیری ہمنوا نہیں، اس لئے تیرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ (۶۶/۱۰)

قرآن کریم نے مختلف انبیاء کرامؑ (حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت شعیبؑ وغیرہ (علیہم السلام) کے متعلق بھی یہی کہا کہ وہ اپنی اپنی قوم کے افراد اور ان کے بھائی بندوں میں سے تھے۔ انہی میں انہوں نے اپنے نظریۂ زندگی کی تبلیغ کی اور جن لوگوں نے اسے قبول کر لیا، وہ ایک الگ قوم کے افراد قرار پا گئے (حضرت نوحؑ کی بیوی کی طرح)، حضرت لوطؑ کی بیوی کا بھی ذکر خصوصیت سے آیا ہے (۶۶/۱۰) اجمالی طور پر ان تمام رسولوں کے متعلق کہا کہ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِہٖ رُسُلًا اِلٰی قَوْمِھِمْ (۱۰/۷۴) ان رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا جن لوگوں نے ان کے پیش کردہ نظریۂ حیات کی تردید و تکذیب کی وہ تباہ ہو گئے۔ ثُمَّ نُنَجِّیْ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۱۰/۱۰۳) اور خدا نے اپنے رسولوں کو اور جو لوگ ان کے نظریۂ حیات پر ایمان لائے تھے، انہیں تباہی سے محفوظ رکھا۔

نظریۂ زندگی کی بنا پر اپنی قوم سے الگ ہو کر، ایک جداگانہ قومیت کی تشکیل کے مسلک کو داستانِ حضرت ابراہیمؑ میں مزید وضاحت سے بیان کیا گیا ہے، انہوں نے، سب سے پہلے،

داستان حضرت ابراہیمؑ

اپنے گھر میں، اپنے باپ کے سامنے اس نظریہ کو پیش کیا اور کہا کہ یٰاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِکَ فَاتَّبِعْنِیْٓ اَھْدِکَ صِرَاطًا سَوِیًّا (۱۹/۴۳) اے میرے باپ! مجھے میرے خدا کی طرف سے وہ علم ملا ہے جو تیرے پاس نہیں۔ اس لئے اپنی غلط روش کو چھوڑ اور میرا اتباع کر، میں تجھے زندگی کے صحیح راستے پر چلاؤں گا اور جب باپ نے اس نظریہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو آپ نے کہا — سَلٰمٌ عَلَیْکَ ج (۱۹/۴۷) اچھا! خدا حافظ! — آپ جانیں آپ کا کام۔ میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر آپ نے اپنے پیغام کو اپنی قوم کے سامنے پیش کیا اور انہوں نے بھی اس کی مخالفت کی، پھر ملک کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ اور اس نے بھی اس سے انکار کیا، تو آپ نے ان سب سے برملا کہہ دیا کہ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْکُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ تم اگر اس نظریۂ زندگی کو نہیں مانتے تو میرا تم سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ میں تم سے بھی قطعِ علائق

کرتا ہوں اور تمہارے معبودوں سے بھی۔ کَفَرْنَا بِکُمْ سن رکھو کہ ہم تمہارے نظریۂ حیات سے کھلے بندوں انکار کرتے ہیں۔ وَبَدَا بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃُ وَالْبَغْضَاءُ اَبَدًا اور اس انکار و اختلاف کے معنی نہیں کہ یہ ایک پرائیویٹ معاملہ تھا، تم نے یوں مان لیا، ہم نے یُوں۔ بات ختم ہوئی، اس میں جھگڑا کا ہے کا؟ نہیں، بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس سے تم میں اور ہم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عداوت اور نفرت رہے گی۔ اس عداوت کے ختم کرنے کی ایک اور صرف ایک صورت ہو گی اور وہ یہ کہ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَحْدَہٗٓ (۶۰/۴) تم بھی ہماری طرح اس نظریۂ حیات کو قبول کر لو۔ اور اگر تم ایسا نہیں کرتے تو میرا اس خطۂ زمین سے بھی کوئی واسطہ نہیں۔ نظریۂ زندگی کے مقابلہ میں وطن کی جاذبیت کوئی شے نہیں۔ اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ (۳۷/۹۹) لو! میں چلا اپنے رب کی طرف تمہارے خون کے رشتے، تمہاری قومی نسبتیں، تمہاری وطن کی جاذبیت تمہیں مبارک۔ مجھے اُس باپ، اُس خاندان، اُس قوم، اس وطن سے کیا تعلق جو میرے خدا کے عطا کردہ نظریۂ حیات کے مخالف ہے۔ میں اس سرزمین کو جا کر اپنا وطن بناؤں گا جو اس نظریۂ زندگی کے لئے سازگار ہو گی اور ان افراد سے اپنے رشتے استوار کروں گا جو اس نظریہ میں مجھ سے ہم آہنگ ہوں گے میں ایک نیا دیس بساؤں گا اور اس میں ایک نئی قوم تشکیل کروں گا۔ چنانچہ وہ وہاں سے نکلے اور دنیا کے بتکدے میں اس پہلے گھر کی بنیاد رکھی جو نسل، رنگ، زبان، وطن کی نسبتوں سے بلند، ان افرادِ انسانیہ کا مرجع و ماویٰ قرار پایا جو خدا کے عطا کردہ نظریۂ حیات کو اپنا لینے سے ایک جداگانہ اُمّت کے قالب میں ڈھل گئے ہوں۔

یہ تھا وہ مسلکِ ابراہیمی جس کے متعلق ہم سے کہا گیا کہ قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ (۶۰/۴) تمہارے لئے ابراہیمؑ اور اس کے رُفقا کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے اور یہی تھی وہ روش جس کی وجہ سے کہا گیا کہ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (۲/۱۲۴) ابراہیمؑ! تم نوعِ انسانی کی لیڈرشپ کے مستحق قرار پا گئے ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی کہ یہ لیڈرشپ، تمہاری اولاد میں ملوکیت کی طرح وراثت میں نہیں چلے گی۔ لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ (۲/۱۲۴) ان میں سے جو اس معیار پر پورا نہیں اُترے گا، وہ اس منصب سے محروم کر دیا جائے گا اور یہی تھی وہ حقیقتِ کبریٰ جس کے پیشِ نظر صنم کدۂ نسل و وطن و قوم کے اس بت شکن نے اعلان کر دیا کہ:

فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّہٗ مِنِّیْ (۱۴/۳۶)

سن رکھو! اور اچھی طرح سے جان لو کہ میرا وہ ہے جو میرے مسلک کا اتباع کرتا ہے جو اس

کے خلاف چلتا ہے اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔

یہ ہے اپنے اور بیگانے کا وہ ازلی معیار، جسے اس معمارِ حرم، اس خدائے واحد کے محکوم، اس مسلمِ قانت، اس حنیفِ مخلص نے اس بلند آہنگی سے پیش کیا اور جس پر عمل کر کے، دنیا میں تشکیلِ اُمّت اور تعمیرِ قومیت کا درخشندہ نمونہ قائم کر دکھایا۔

یہ تھے وہ حضرات انبیاء کرامؑ جو مختلف زمانوں میں بمختلف قوموں میں، زمین کے مختلف خطوں میں مختلف زبانیں بولنے والی قوموں میں پیدا ہوئے، لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود، خدا نے ان کے متعلق کہا کہ:۔

اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (۲۱/۹۲)

یہ سب ایک ہی اُمّت کے افراد، ایک ہی تسبیح کے دانے اور ایک ہی لڑی کے موتی تھے۔ رنگ، نسل، زبان، وطن یعنی زمان و مکان کے ان تمام اختلافات کے باوجود، جس قدرِ مشترک سے یہ ایک قوم کے افراد قرار پاتے ہیں، وہ اس نظریۂ حیات کی وحدت تھی جسے ان کے خدا نے عطا کیا تھا۔

اور یہ سلسلہ اسی طرح آگے بڑھتا گیا تا آنکہ انسانیت اُس دور کی حدود میں داخل ہو گئی جس میں وسائل رسل و رسائل کی فراوانی اور ذرائع مواصلات کی کثرت سے زمین کی طنابیں کھینچ کر پوری نوعِ انسانی کو سمٹ سمٹا کر گویا ایک مختصر سی آبادی بن جانا تھا، اس طرح کہ کسی

رسولﷺ کافۃً للنّاس

ایک مرکز سے اٹھتی ہوئی آواز بیک وقت اکنافِ عالم تک پھیل جائے اس سے پہلے حضرات انبیاء کرامؑ خاص قوموں کی طرف مبعوث ہوتے تھے اور ان کی رسالت کا دائرۂ اثر و نفوذ، ایک خاص علاقہ تک محدود ہوتا تھا، لیکن اب جو رسول بھیجا گیا تو اس سے کہا گیا کہ تم اعلان کر دو کہ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (۷/۱۵۸) اے نوعِ انسان! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغامبر بن کر آیا ہوں، آپ غور کیجئے کہ اس سے پہلے جو حضرات انبیاء کرام تشریف لاتے تھے، ان کے پیشِ نظر، کسی ایک علاقہ میں بسنے والی ایک قوم کو دو قوموں میں تقسیم کرنا ہوتا تھا، لیکن اب جو رسولﷺ آیا تو اس کا مشن یہ تھا کہ وہ تمام دنیا کے انسانوں کو دو قوموں میں تقسیم کرے۔ دنیا میں بے شمار نسلیں تھیں، سینکڑوں قومیں، ہزاروں زبانیں۔ اس رسولِ آخر الزّمانﷺ کا نصب العین یہ تھا کہ وہ اس قدر کثیر النوع اختلافات و امتیازات کے باوجود انہی انسانوں میں سے، ایک ایسی اُمّت کی تشکیل کرے جو ان اختلافات سے بلند ہو کر صرف ایک قدرِ مشترک کی بنا پر، اُمّتِ واحدہ بن جائے۔

اس رسولؐ کے پروگرام کی حد آخریں تو عالمگیر انسانیت تھی، لیکن اس کا آغاز بہرحال ایک خاص خطۂ زمین، اور ایک مخصوص قوم ہی سے ہونا تھا۔ یہ قوم جو اس پیغام کی اولین مخاطب تھی، نسل پرستی میں اپنی انتہا تک پہنچی ہوئی تھی۔ ہر قبیلہ اپنے حسب اور نسب کے غلغلے بلند کرتا۔ شاعر ان کے آباؤ اجداد کی حمد و ستائش کے قصیدے پڑھتے۔ میدانِ جنگ میں ہر نبرد آزما، اپنے آپ کو اپنے اسلاف کے کارناموں سے متعارف کراتا۔ نسبی افتخار کا یہ عالم کہ بڑے قبیلے کا فرد، کسی ادنیٰ قبیلے کے فرد سے، رشتہ ناطہ تو کجا، میدانِ جنگ میں لڑنا تک گوارا نہ کرتا۔ اس قوم سے یہ کہنا کہ تمہارے ان قبائلی امتیازات کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اس سے تم اپنا تعارف کرا سکو، ورنہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ($\frac{49}{13}$) معیارِ خداوندی کی رُو سے، سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جس کا کردار سب سے بلند ہے، خواہ وہ کسی خاندان میں پیدا ہوا ہو، کوئی سی زبان بولتا ہو، دنیا کے کسی خطہ کا باشندہ ہو، بہت بڑا انقلابی پیغام تھا۔ یہ تھا وہ معیار جس کے مطابق ایک نئی قوم کی تعمیر کی داغ بیل ڈالی گئی۔ ان سے کہا گیا کہ یاد رکھو! دنیا میں قومیں صرف دو ہیں — ایک وہ جو خدا کی متعیّن کردہ، زندگی کی بلند اور غیر متبدّل اقدار کی صداقت پر ایمان رکھے، (انہیں مومن کہا جائے گا۔) اور دوسری وہ جو ان اقدار سے انکار کرے (انہیں کافر یعنی نہ ماننے والے، کہہ کر پکارا جائے گا)۔ ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ خدا نے تم سب کو صرف انسانوں کی حیثیت سے پیدا کیا۔ اس کے بعد فَمِنْکُمْ کَافِرٌ وَّمِنْکُمْ مُّؤْمِنٌ۔ ($\frac{64}{2}$) پھر تم دو قوموں میں تقسیم ہو گئے، ایک جماعتِ مومنین، اور ایک گروہِ کفّار۔ اس کے علاوہ انسانوں کی کوئی اور تقسیم نہیں۔ انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے، اس لئے کوئی ایسی تفریق و تخصیص جس میں اس کے اختیار و ارادہ کو دخل نہ ہو، انسانی عمل نہیں سمجھا جائے گا۔ اگر قومیت کا معیار نسل ہے تو جو شخص کسی ایک نسل میں پیدا ہو گیا وہ اپنی نسل، فلہذا، قومیت بدل نہیں سکتا۔ اگر معیار وطن ہے تو کسی خاص ملک میں پیدا ہو جانا بھی پیدا ہونے والے بچّے کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ لیکن کفر اور ایمان ہر فرد کے اپنے اختیار و انتخاب کی چیز ہے، فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ ($\frac{18}{29}$) جس کا جی چاہے ایمان لا کر، قومِ مومنین میں شامل ہو جائے، جس کا جی چاہے کفر کی روش اختیار کر کے گروہِ کفّار میں شامل ہو جائے۔ راستے یہ دو ہی ہیں، تیسرا راستہ کوئی نہیں۔ لہٰذا قومیں بھی دنیا میں دو ہی ہیں، ایک حزب اللہ ہے (یعنی خدا کی پارٹی) دوسری حزب الشیطان (یعنی غیر از خدا کی پارٹی)۔ ($\frac{58}{19، 22}$)

اس مقام پر میں، عزیزانِ گرامی قدر! ایک نہایت اہم اور بنیادی نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔

آغازِ کار

قومیت بالارادہ

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ایمان اور کفر — یعنی ایک قسم کے نظریۂ حیات، اور دوسری قسم کے نظریہ کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی ہے کہ ان کی رُو سے انسانوں میں ایسی مستقل اور غیر متبدل حدِ فاصل قائم کر دی گئی، جو نہ مٹائی

نظریہ کی اہمیت

جا سکتی ہے اور نہ ہی اس میں مفاہمت کی گنجائش ہے۔ انسانوں کی عملی زندگی پر اس سے، بالآخر، اثر کیا پڑتا ہے۔ چونکہ آج ہمارے سامنے نہ صحیح نظریۂ زندگی ہے نہ اس نظریہ کے مطابق زندگی بسر کرنے والی کوئی قوم، اس لئے یہ بتانا اور سمجھانا واقعی مشکل ہے کہ انسان کی عملی زندگی میں نظریہ کی کیا اہمیت ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ اور ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ جو معاملہ کرتی ہے، وہ اس نظریۂ کے مطابق ہوتا ہے جس کا حامل وہ فرد یا قوم ہوتی ہے۔ جب نظریہ یہ ہو کہ زندگی محض طبیعی زندگی ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں تو اس کی رُو سے، اس قوم کا مسلک "جنگل کا قانون" ہوتا ہے یعنی یہ مسلک کہ ہر طاقتور کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ کمزور کو کھا جائے، ایسا کرنے پر اس سے کوئی بازپرس نہیں کر سکتا، اس کے برعکس قرآنی نظریہ کی حامل قوم کا مسلک یہ ہوتا ہے کہ ہر طاقتور کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ کمزور کی حفاظت اور پرورش کرے، اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس سے اس کی بازپرس ہو گی۔ کفر کا نظریہ یہ ہے کہ اپنی قوم کی منفعت کے لئے جو کچھ کیا جائے وہ سب جائز اور درست ہوتا ہے۔ لیکن ایمان پر مبنی نظریہ یہ ہے کہ مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۱۷) وہی نظریہ، وہی نظام، وہی عمل باقی رہ سکتا ہے جو کسی خاص گروہ یا خاص قوم نہیں، بلکہ پوری کی پوری نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔ مغربی نظریۂ قومیت کا نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص، اپنی قوم کے فائدے کے لئے دوسری قوموں کو جتنا زیادہ لوٹے، وہ اتنا ہی زیادہ محبِّ وطن (RATRIOT) اور واجب التکریم سمجھا جاتا ہے یہی وہ حقیقت ہے، جس کا اعتراف و اظہار، اٹلی کے مدبر (CAVOUR) نے ان الفاظ میں کیا تھا کہ:

> جو کچھ ہم نے اپنی قوم اور مملکت کے لئے کیا ہے اگر وہی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں تو کتنے بڑے شیطان کہلائیں۔

میں اس وقت صرف اتنے اشارے پر اکتفا کرتا ہوں، تفصیل ذرا آگے چل کر پیش خدمت کروں گا۔

مختصراً یہ کہ قرآن کی رُو سے، غلط نظریۂ زندگی کی حامل قوم کی کیفیت یہ ہوتی ہے۔ اس کے برعکس صحیح نظریۂ زندگی کی بنیاد پر تشکیل شدہ قوم کی حالت یہ نہیں ہوتی۔ وہ ان قوموں سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔ سورۃ القلم میں ہے

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ کَالْمُجْرِمِیْنَ (۶۸/۳۵) کیا وہ قوم جو مستقل اقدارِ حیات کی حامل ہو، قومِ مجرمین کے مانند ہو سکتی ہے؟ مَالَکُمْ کَیْفَ تَحْکُمُوْنَ (۶۸/۳۶) جو ایسا سمجھتے ہیں، یعنی یہ خیال کرتے ہیں کہ نظریۂ حیات کا قوموں کی حالت پر کچھ اثر نہیں پڑتا، وہ بہت بُرا فیصلہ کرتے ہیں، یہاں کہا گیا ہے کہ مومن اور مسلم قوم، مجرم قوم جیسی نہیں ہو سکتی، عربی زبان میں جرم کے بنیادی معنی ہیں درخت سے پھل توڑ لینا، بھیڑ کی اون مونڈ لینا۔ قرآن کہتا ہے کہ صحیح نظریۂ حیات کی حامل قوم کی کیفیت یہ نہیں ہوتی کہ وہ دوسری قوموں کے درختوں کے پھل توڑ کر اپنے ہاں لے آئیں اس کی روش یہ نہیں ہوتی کہ وہ کمزور قوموں کی اُون مونڈ کر انہیں سردی میں سسکنے دے اور اپنی قوم کے افراد کے لئے حرارت و آسائش کا سامان فراہم کر لیں، دوسری جگہ ہے اَفَمَنْ کَانَ مُؤْمِنًا کَمَنْ کَانَ فَاسِقًا لَا یَسْتَوٗنَ (۳۲/۱۸) کیا قومِ مومن اور قومِ فاسق ایک جیسی ہو سکتی ہیں؟ قطعاً نہیں وہ کبھی یکساں نہیں ہو سکتیں، سورہ ص میں ہے اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ صحیح نظریۂ حیات پر عمل کرنے والی قوم، اور دُنیا میں فساد برپا کرنے والی قومیں برابر ہیں؟ یہ غلط ہے، اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ کَالْفُجَّارِ (۳۸/۲۸) قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنے والی، اور ان سے الگ ہٹ کر انسانیت میں انتشار پیدا کرنے والی قوم، ایک جیسی نہیں ہو سکتی۔ دوسری جگہ ہے کہ جو لوگ انسانی معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں، کیا وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ان لوگوں جیسے ہو جائیں گے جو ایمان و اعمالِ صالحہ کے حامل ہیں! ان کا ایسا خیال کرنا غلط ہے۔ نہ ان دونوں کی زندگی ایک جیسی ہو سکتی ہے، نہ موت۔ جو ایسا سمجھتا ہے وہ بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ (۴۵/۲۱)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ صحیح نظریۂ حیات پر یقین رکھنے والے لوگوں کو، دوسرے انسانوں سے الگ کر کے، خالص انہی پر مشتمل قوم کی تشکیل کا عملی مفہوم کیا ہے اور اس میں عالمگیر انسانیت کا مفاد کیا؟

دعوتِ نبویؐ

یہ تھا وہ بنیادی مقصد جس کے لئے حضور نبی اکرمؐ نے، خود اپنی قوم، اپنی نسل اور خاندان اپنی زبان بولنے والوں، خود اسی ملک میں رہنے والوں کو پکار کر کہا کہ وَامْتَازُوا الْیَوْمَ اَیُّھَا الْمُجْرِمُوْنَ (۳۶/۵۹) اب وہ دور آگیا ہے جس میں مجرم اور انسانیت دوست افراد ملے جُلے نہیں رہ سکیں گے۔ یہ ایک قوم کے افراد نہیں ہوں گے اب مجرموں کو، انسانیت دوست انسانوں سے متمیّز طور پر الگ ہونا پڑے گا۔ اب اسی ملک میں بسنے والے، اسی نسل سے متعلق یہی زبان بولنے والے انسان دو قوموں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک وہ جو مستقل اقدارِ خداوندی کو اپنا شعارِ زندگی بنا کر، عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود کا عَلَم بلند کر کے اٹھیں اور دوسری قوم وہ جن کا مسلکِ حیات جنگل کا قانون ہو۔ اس آواز پر سعید روحیں اپنی قوم، اپنے

قبیلہ، اپنے خاندان سے چھٹ کر اور کٹ کر، الگ ہوتی گئیں اور اس طرح ایک ہی وطن میں، دو قوموں کی تشکیل کی ابتداء ہو گئی۔

نسل یا وطن کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کے لئے کچھ کرنا ہی نہیں پڑتا، وہ قوم تو بنی بنائی ہوتی ہے لیکن نظریہ کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل بڑا صبر آزما اور استقامت طلب مرحلہ ہوتا ہے اس کے لئے ایک ایک فرد کے قلب و دماغ میں نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، جسے قرآن کی اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں. قومیت سازی کی اس مہم کو قرآن میں عمل تزمیل سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی جہت سے رسول اللہ کو

عملِ تزمیل

اَلْمُزَّمِّلُ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ مُزَّمِّل کے معنی ہیں وہ سالارِ کارواں جو ایسے رفقاء کو تلاش اور منتخب کرے جن میں فکری اور قلبی ہم آہنگی ہو۔ مسلسل تعلیم و تربیت اس کا ذریعہ تھا، اس عملِ تعلیم و تزمیل سے ایک ایک کر کے اس جدید قوم کے افراد میں اضافہ ہوتا چلا گیا، قرآن کے الفاظ میں

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۲/۱۴۳)

اس طرح رفتہ رفتہ بتدریج ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنا دیا جس کا فریضۂ زندگی یہ تھا کہ وہ تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی کرے اور ان کا رسول ان کے اعمال کا نگران ہو، دوسری جگہ ہے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۳/۱۹) تم ایک بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسان کی بہبود و منفعت کے لئے کھڑا کیا گیا ہے. آپ نے ملاحظہ فرما لیا کہ صحیح نظریۂ حیات کی حامل قوم کا مقصدِ زندگی کیا ہوتا ہے؟

ضمناً، قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ تمہارا "رسول تم پر نگران ہو" تو اس میں ایک عظیم حقیقت مضمر ہے. دنیا میں (چند ایک دہریوں کو چھوڑ کر) تمام انسان، کسی نہ کسی شکل میں خدا کو مانتے ہیں، لیکن خدا کے ماننے سے

رسولؐ اور اُمّت

وہ ایک قوم نہیں بنتے، قوم بنتی ہے رسول کی نسبت سے. مثلاً یہودی حضرت عیسٰیؑ سے پہلے کے تمام انبیاءِ بنی اسرائیل پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ عیسائیوں سے الگ قوم قرار پاتے ہیں. جس دن ایک یہودی، حضرت عیسٰیؑ کی رسالت پر ایمان لے آتا ہے وہ اپنی سابقہ قوم سے کٹ کر، عیسائی قوم کا فرد قرار پا جاتا ہے، اسی طرح جس دن ایک عیسائی، حضرت عیسٰیؑ کے بعد ایک اور رسول (یعنی رسول عربیؐ) پر ایمان لے آتا ہے، وہ ملّتِ عیسوی سے کٹ کر، امّتِ محمدیہ کا فرد قرار پا جاتا ہے. اس سے آپ نے دیکھا کہ امت کی تشکیل، رسول کی نسبت سے ہوتی ہے. اسی اصول کی بنا پر جو شخص رسول اللہ کے بعد، کسی اور نبی پر ایمان لے آتا ہے، وہ اُمّتِ محمدیہ سے کٹ کر، اس جدید نبی کی اُمّت

کافر بن جاتا ہے۔ اقبالؒ نے اس حقیقتِ کبریٰ کو بڑے حسین اور بصیرت افروز اسلوب میں بیان کیا ہے جب کہا کہ ؎

حق تعالےٰ پیکرِ ما آفرید — وز رسالت در تنِ ما جاں دمید
حرفِ بے صوت اندریں عالم بُدیم — از رسالت مصرعِ موزوں شدیم
از رسالت ہم نوا گشتیم ما — ہم نفس، ہم مدّعا گشتیم ما
پس خدا بر ما شریعت ختم کرد — بر رسولؐ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایام را
اُو رُسُل را ختم و ما اقوام را

نظریہ کی بنیادوں پر متشکل شدہ اس اُمتِ جدیدہ کی ہیئتِ ترکیبی عجیب تھی۔ حبش کا بلالؓ، فارس کا سلمانؓ، روم کا صہیبؓ، اپنوں میں سے تھا اور خود مکّہ کے رہنے والے وہی زبان بولنے والے، اسی نسل، بلکہ قبیلہ سے وابستہ، خود رسول اللہؐ کے چچا عباس اور بولہب، دوسری قوم کے افراد تھے۔ تیرہ سال کی محنتِ شاقہ اور سعیٔ مسلسل کے بعد، ایک مختصر سی اُمت وجود میں آگئی تو سوال یہ سامنے آیا کہ جس نظریہ کی حامل یہ امّت ہے، اسے ایک عملی نظام میں متشکل کرنے کے لئے ایک آزاد خطۂ زمین کی ضرورت ہے۔ مکّہ کی فضا اس انقلاب کے لئے سازگار نہیں تھی اس لئے کہا گیا کہ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا۔ (۷۳/۱۰) اب ان لوگوں سے کنارہ کش ہو جاؤ، لیکن یہ کنارہ کشی بھی بڑے حسین اور جمیل انداز سے ہونی چاہیئے۔ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ (۴۳/۸۹) ان سے الگ ہو جاؤ اور کہہ دو کہ تمہارا خدا حافظ۔ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ تم اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہو، ہم اپنا کام کریں گے لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ (۴۲/۱۵) تم میں اور ہم میں کوئی جھگڑا نہیں، کوئی پرخاش نہیں۔ سورۂ انعام میں اس انقلابی اعلان کو دو لفظوں میں اس جامعیت کے ساتھ بیان گیا ہے کہ جوں جوں نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، روح وجد میں آجاتی ہے، فرمایا۔ قُلِ اللّٰهُ کہو اللہ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ (۶/۹۲) اور پھر انہیں چھوڑ دو کہ یہ زندگی سے کھیل کھیلتے رہیں۔

ہجرت علیٰحدگی کے اس اعلان کے بعد یہ مختصر سی امّت، مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ کی طرف آگئی۔ اقبالؒ نے کہا ہے کہ اسلام کے نظریۂ قومیت میں ہجرت ایک عظیم حقیقت کو واشگاف کرتی ہے ؎

عقدۂ قومیتِ مسلم کشود — از وطن آقائے ما ہجرت نمود

حکمتش یک ملّتِ گیتی نورد　　براساسِ کلمۂ تعمیر کرد
تاز بخششہائے آں سلطان دیں　　مسجدِ ما شُد ہمہ روئے زمیں

ہجرت کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان کے نزدیک، وطن مقصود بالذات نہیں، ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اگر ایسا وقت آجائے کہ وطن کی کشش اور اس نصب العین کے قیام و استحکام میں تصادم ہوجائے، ان میں (TIE) پڑجائے تو مومن، وطن کی خاک سے دامن فشاں اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور ایسی سرزمین کی طرف راہ نورد ہو جاتا ہے جس کی فضا اس مقصد کے حصول کے لئے سازگار ہو۔ ؎

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است　　ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است
معنیٔ اُو از تنک آبی رم است　　ترکِ شبنم بہر تسخیرِ یَم است

مدینہ میں عام عرب بستے تھے، عیسائی بستے تھے، یہودی بستے تھے۔ جب مہاجرین کا یہ کارواں وہاں پہنچا ہے تو انہوں نے تمام غیر مُسلموں کو چھوڑ کر صرف ان چند مسلمانوں کو اپنوں میں شامل کیا جنہوں نے انہیں یہاں آنے کی دعوت دی تھی اور جو آج تک انصار کے درخشندہ لقب سے متعارف ہیں۔ مکّہ کے قریش اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ یہ نئی اُمت، نسل اور وطن کی تنگ نائے سے نکل کر، عالمگیر نظریۂ اخوت کی بنا پر ایک بحرِ ناپیدا کنار بن جائے اس لئے انہوں نے وہاں بھی ان کا پیچھا کیا اور ۲ھ میں بدر کے میدان میں ان دونوں قوموں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ اس تقابل میں چونکہ اسلامی اور غیر اسلامی نظریۂ قومیت نکھر اور ابھر کر سامنے آگیا، اس لئے قرآن کریم نے اسے "یوم الفرقان" کہہ کر پکارا ہے، یعنی اس طرح نمایاں طور پر الگ الگ ہو کر سامنے آجانے کا دن، جس میں کسی کو کسی قسم کا شک و شبہ یا ابہام و التباس نہ ہو۔ یہ وہ میدان تھا جس میں (جیسا کہ میں نے معراجِ انسانیت میں تفصیل سے لکھا ہے) حضرت ابوبکرؓ ایک طرف تھے اور خود ان کا بیٹا صفِ مقابل میں۔ حضرت حذیفہؓ ادھر تھے اور ان کا باپ عتبہ دوسری طرف۔ حضرت عمرؓ اس طرف تھے تو ان کا ماموں اُس طرف۔ حضرت علیؓ اِدھر تھے اور ان کے بھائی عقیل اُدھر نہیں! حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس طرف تھے اور آپؐ کے چچا عباس اور داماد ابو العاص دشمنوں کی صف میں، یہ تھی وہ تقسیمِ انسانیت، جو وطن، رنگ، نسل، زبان، رشتہ داری کے تمام حدود سے بلند ہو کر، خالص ایمان اور کفر کی بنیادوں پر وجود میں آئی تھی، یہ تھا وہ میدان جس میں اسلام کا نظریۂ قومیت ابھر کر دُنیا کے سامنے آگیا تھا۔

بدر کا میدان

تعمیر و استحکام قومیت کے لئے دو عناصر بنیادی اور لاینفک ہیں یعنی باہمگی (GREGARIOUSNESS اور بے ہمگی (EXCLUSIVENESS)۔ بالفاظِ دیگر، اس قوم کے افراد کی ایک دوسرے کے ساتھ گہری وابستگی اور اپنے جداگانہ تشخّص کو قائم رکھنے کے لئے دوسری اقوام سے علیحدگی۔

استحکامِ خویش

قرآن میں دیکھئے، ان دونوں گوشوں کے لئے واضح ہدایات اس شرح و بسط سے ملتی ہیں کہ اس باب میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ چونکہ اسلامی قومیت کا مدار خارجی اسباب و علائق پر نہیں بلکہ نظریۂ زندگی کے اشتراک پر ہے جس کا تعلق انسانی قلب سے ہے، انہوں سے امتِ مسلمہ کے استحکام کے لئے افرادِ اُمّت میں قلبی یگانگت لاینفک ہے، اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

بادطن وابستہ تقدیرِ امم | برنسب بنیادِ تعمیرِ امم!
ملّتِ مارا اساسِ دیگر است | ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است

یہی وہ اساس ہے جس کے استحکام کے سلسلہ میں قرآنِ کریم نے ان افرادِ امت سے کہا کہ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ، تم اس انعامِ خداوندی کو یاد کرو کہ كُنْتُمْ اَعْدَآءً تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تم ایک ہی جگہ رہتے تھے، ایک ہی زبان بولتے تھے، ایک ہی نسل سے متعلق تھے لیکن اس کے باوجود تم میں بُعد و مغائرت تھی، فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا۔ (۳/۱۰۲) اس نے تمہارے دلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ پیوست کر دیا اور اس طرح اس نے تمہیں بھائی بھائی بنا دیا یہ ہے خدا کا وہ انعام بے بہا جسے تمہیں ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ آپ نے غور کیا کہ قرآنِ کریم نے مختلف افرادِ انسانیہ کو ایک اُمّت بنانے کے لئے بنیاد کیا بتائی ہے؟ دلوں کی ہم آہنگی، نگاہ کی یک رنگی اور ظاہر ہے کہ یہ ہم آہنگی اور یک نگہی، نظریہ حیات کے

قلبی یگانگت

اشتراک ہی سے پیدا ہو سکتی ہے نسل یا وطن کے اشتراک سے تو جو قوم وجود میں آتی ہے، اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّ قُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ط (۵۹/۱۴) وہ ایک جتھہ، ایک گروہ، ایک جماعت تو نظر آتے ہیں، لیکن ان کے دل ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں۔ نظریۂ زندگی کی وحدت سے پیدا شدہ قلوب کی ہم آہنگی وہ متاعِ بے بہا ہے جس کا نہ کوئی بدل ہے اور نہ ہی ایسی اجتماعیت نظریۂ زندگی کی وحدت کے سوا کسی اور طریق سے پیدا ہو سکتی ہے، سورۂ انفال میں نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے کہا گیا کہ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ط خدا نے ان کے دلوں کو ہمدگر پیوست کر دیا ہے۔ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ (۸/۶۳) اگر ان میں یہ وجہِ جامعیت نہ ہوتی تو ان کے قلوب میں اس قسم کی ہم آہنگی کبھی پیدا نہ

ہوسکتی خواہ اس کے لئے ساری دنیا کی دولت بھی کیوں نہ صرف کر دی جاتی۔ یہی وہ وجہ یگانگت اور اساسِ قومیت ہے جس سے ان کی کیفیت یہ ہوگئی ہے کہ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (۹/۷۱) مومن مرد اور عورتیں سب ایک دوسرے کے دوست، غمخوار، بہی خواہ اور شفیق ہیں، انہیں بلکہ اس سے بھی آگے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (۴۹/۱۰) یہ سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں ان میں باہمی رشتہ قومیت کا نہیں اخوت کا ہے۔ اخوت کا ایک رشتہ ہابیل اور قابیل میں تھا، جو ذرا سے اختلاف سے اس طرح ٹوٹا کہ ایک بھائی کا خنجر دوسرے بھائی کے سینے میں پیوست تھا۔ اور اخوت کا ایک رشتہ یہ ہے جس میں کہا گیا کہ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ...... (۴/۹۳) جس نے اپنے مومن بھائی کو عمداً قتل کیا۔ وہ سیدھا جہنم میں جائے گا۔ ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ تم خدا کی وحدانیت پر ایمان رکھتے ہو اس ایمان کا عملی ثبوت، اُمت کی وحدت ہے اس لئے اگر تم میں تفرقہ پیدا ہو گیا تو تم مومن اور مؤحد نہیں رہو گے، مشرک ہو جاؤ گے۔ (۳۰/۳۱) رسول اللہ سے کہا گیا کہ یہ لوگ تمہاری نسبت سے ایک اُمت بنے ہیں، اگر انہوں نے باہمی تفرقہ پیدا کر لیا تو لَسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ (۶/۱۶۰) تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں رہے گا جو تفرقہ اختیار کرے گا، وہ کسی دوسری قوم کا فرد بن جائے گا، اُمتِ محمدیہ کا فرد نہیں رہے گا۔

افرادِ اُمت سے یہ کہا اور دوسری طرف، مرکزِ اُمت، حضور نبی اکرمؐ سے کہا کہ ان افراد کی معیت بڑی گراں بہا ہے جس نظام کے آپ داعی ہیں، اس کا قیام و استحکام انہی کی رفاقت پر موقوف ہے، یاد رکھو يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۸/۶۴) تمہارے مشن کی کامیابی کے لئے خدا کی نصرت اور جماعتِ مومنین کی رفاقت دونوں کی ضرورت ہے، انہیں کم نگہی سے نہ دیکھو (۱۸/۲۸) ان سے اعراض نہ برتو (۶/۵۲) انہیں اپنی عاطفت اور ملاطفت کے سائے کے نیچے رکھو (۱۵/۸۸، ۲۶/۲۱۵) ان سے معاملات میں مشورہ کیا کرو (۳/۱۵۸) دوسری طرف ان افرادِ امت سے تاکید کی کہ تم اس رسول کے دست و بازو بنو (۴۸/۹) اپنے اختلافی معاملات میں اسے حَکَم قرار دو، اور اس کے فیصلے کے سامنے اس طرح سرِ تسلیم خم کر دو کہ اس سے تمہارے دل میں بھی کسی قسم کی گرانی یا کبیدگی پیدا نہ ہو (۴/۶۵) حتیٰ کہ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (۳۳/۶) تم اسے خود اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھو، اس لئے کہ تمہاری ملّی ہستی اسی مرکز سے قائم ہے۔

یہ تو تھی (GREGARIOUSNESS) باخویش پیوستگی کی شکل۔ جہاں تک (EXCLUSIVENESS) یعنی دوسروں سے علیحدگی کا تعلق تھا، قرآن کریم نے نہایت واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ عدل و انصاف اور احسان و

کفار کے ساتھ تعلقات

مروّت کا سلوک تو دنیا کے ہر انسان سے کیا جائے گا لیکن تم اپنی ملت سے باہر کسی سے دوستداری کے تعلقات استوار نہیں کر سکتے۔ لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ (۳/۲۷) جو ایسا کرے گا، اسے خدا سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ وہ اس امت کا فرد ہی نہیں رہے گا۔ وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاِنَّہٗ مِنْھُمْ ؕ (۵/۵۱) جو ان سے دوستانہ تعلقات استوار کرے گا، اس کا شمار انہی میں ہو جائے گا۔ یہی نہیں، بلکہ ان سے یہ بھی کہا گیا کہ تم اپنوں کے سوا کسی اور کو اپنے رازوں میں شریک نہ کرو، وہ تمہارے رازوں سے واقف ہو جائیں گے، تو تمہاری تباہی اور بربادی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے، (۳/۱۱۷) ان افرادِ امت کا اس ارشادِ خداوندی پر کس شدّت سے عمل تھا، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایئے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب مملکت کا کاروبار پھیلا، تو ایک اکوٹنٹنٹ کی ضرورت پڑی۔ عربوں میں اکوٹنٹنٹ کہاں سے مل سکتا تھا۔ جس قوم کی زبان میں ہزار سے اوپر عدد کے لئے کوئی لفظ ہی نہ ہو، اس کے ہاں لاکھوں، کروڑوں کا حساب وکتاب رکھنے والے ماہرین کیسے پیدا ہو سکتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے ہاں وثیق نامی ایک رومی عیسائی غلام تھا، جو اس فن کا ماہر تھا۔ جب بہ تلاشِ بسیار ایسا آدمی مسلمانوں میں نہ مل سکا، تو بعض لوگوں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ آپ وثیق کے سپرد یہ کام کیوں نہیں کر دیتے۔ آپ نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ وہ اس فریضہ کو بہ خوبی سرانجام دے سکتا ہے، لیکن خدا کا ارشاد ہے کہ کسی غیر مسلم کو اپنا رازداں نہ بناؤ، اس لئے میں اسے شریکِ راز کس طرح کر سکتا ہوں، نہ ہی میں اسے اسلام لانے پر مجبور کر سکتا ہوں، اگر وہ بطیبِ خاطر مسلمان ہو جائے تو اور بات ہے، ورنہ اس حالت میں تو اُسے رموزِ مملکت میں شریک نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ نہ وہ بطیبِ خاطر ایمان لایا، نہ اسے اسلام لانے پر مجبور کیا گیا اور نہ اس کے سپرد یہ فریضہ کیا گیا۔

یوں، عزیزانِ من! ایک ایسی امت (قوم) کی تشکیل ہوئی جس کی بنیاد نظریاتی تھی، یعنی جس میں کیفیت یہ تھی کہ ایک شخص دنیا کے کسی ملک کا باشندہ ہو، کسی نسل سے متعلق ہو، کوئی سی زبان بولتا ہو، جونہی اس نے قرآن کے عطا کردہ نظریہ زندگی کی صداقت کو تسلیم کر لیا، وہ اُمت کا فرد بن گیا۔ اس کے برعکس ایک شخص جو اسی ملک بلکہ اسی شہر کا رہنے والا ہو، وہی زبان بولتا ہو، اسی نسل سے وابستہ ہو، لیکن اس نظریہ کا قائل نہ ہو، اسے دوسری قوم کا فرد شمار کیا گیا۔ یوں پوری نوعِ انسان، دو گروہوں یا دو قوموں میں بٹ گئی۔ ساری دُنیا کے مسلمان ایک قوم کے افراد اور غیر مسلم، دوسری قوم کے افراد اور ان کے تعلقات کی نوعیت یہ کہ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ۔ (۴۸/۲۹)

جیسا کہ واضح ہو چکا ہے اس اُمت کی بنیاد نظریۂ زندگی کی وحدت پر تھی، لیکن نظریہ (آئیڈیالوجی) ایک

مرکزِ محسوس

غیر محسوس، غیر مرئی، (ABSTRACT) حقیقت ہوتی ہے اسے ہر وقت پیشِ نظر رکھنے کے لئے کسی محسوس علامت (SYMBOL) کی ضرورت ہوتی ہے، اس مقصد کے لئے کعبہ کو، بطور مرکزی علامت تجویز کیا گیا، اور اسی جہت سے اسے قبلہ قرار دیا گیا۔ قبلہ کے معنی ہیں وہ شے جو آنکھوں کے سامنے رہے ان سے کہا گیا وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا (۲/۱۴۸) ہر قوم نے اپنے لئے ایک نصب العین، ایک: GOAL) تجویز کر رکھا ہوتا ہے جسے وہ اپنی توجہات کا مرکز اور نقطۂ ماسکہ سمجھتی ہے تمہارے لئے اس قسم کا مرکز کعبہ کو مقرر کیا جاتا ہے۔ حَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ (۲/۱۴۴) تم دنیا میں کہیں بھی ہو۔ اپنی توجہات کا مرکز اسی کو قرار دو، اور اپنی نگاہوں کا رُخ اسی کی طرف رکھو، لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ (۲/۱۵۰) اس سے ہوگا یہ کہ تم کہیں بھی ہو گے، ساری دُنیا جان لے گی کہ تم کس قوم کے فرد ہو اور تمہارا مرکزِ اجتماعیت کونسا ہے۔ یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے کعبہ کو قبلہ (مرکزِ توجہاتِ اُمت) وجہ تعارف اور علامتِ انفرادیت مقرر کیا گیا۔ سمجھنے کے لئے یوں سمجھئے کہ آج جب ہم ماسکو یا پیکنگ، یا واشنگٹن کہتے ہیں تو اس سے مراد یہ شہر نہیں ہوتے۔ اس سے مراد وہ آئیڈیالوجی، وہ نظام، وہ پالیسی ہوتی ہے جس کے مراکز یہ شہر ہیں۔ یہی حیثیت اسلام میں کعبہ کی تھی۔

ضمناً غور کیجئے کہ جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس میں کس قدر بنیادی تبدیلی واقع ہو جاتی

اب کعبہ کی حیثیت

ہے۔ اُس وقت، دین کی علامات تو ویسی ہی رہتی ہیں لیکن ان کا مفہوم و مقصود بالکل بدل جاتا ہے۔ آج کعبہ بھی بجنسہٖ موجود ہے (بلکہ اس کی شان و شوکت اور آرائش و زیبائش پہلے سے بھی کہیں زیادہ ہے) اور ہم اسے اپنا قبلہ بھی کہتے ہیں، لیکن اس سے مقصود فقط اتنا رہ گیا ہے کہ مسجدوں کی سمت اس کے مطابق متعیّن کی جائے اور نماز میں اپنا رُخ اس کی طرف کر لیا جائے۔ تشکیل پاکستان کے بعد جب اس مملکت کو اسلامی بنانے کا جذبہ ابھرا تو قوم کی طرف سے پہلا مطالبہ یہ پیش کیا گیا تھا کہ ریلوے اسٹیشنوں پر ایسے نشانات نصب کئے جائیں، جن سے قبلہ کی سمت متعیّن ہو جائے جب وہاں اس قسم کے تیر کے نشانات نصب کر دیئے گئے تو قوم مطمئن ہو گئی کہ تعیینِ قبلہ کا مقصد پورا ہو گیا ہے اور مملکت اسلامی بن گئی ہے۔

اور آگے بڑھیئے۔ قوم اب بھی ہر سال لاکھوں کی تعداد میں کعبہ کے گرد، حج کے لئے جمع ہوتی ہے۔ وہاں

لباس کا امتیاز مٹا دینے کے لئے احرام بھی باندھا جاتا ہے۔ بڑے خشوع وخضوع سے مناسکِ حج ادا کئے جاتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ میدانِ عرفات میں اُمت ایک جگہ جمع ہے لیکن یہ اُمت، اُمتِ واحدہ نہیں۔ یہ مختلف قوموں میں بٹی ہوئی ہے اور ہر قوم، اس جگہ بھی اپنا اپنا الگ قومی امتیاز قائم رکھے ہوئے ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ نتیجہ اس کا یہ کہ حاجی، حج میں مصروف ہوتے ہیں اور ان کی قومیں ایک دوسرے کا گلہ کاٹ رہی ہوتی ہیں! یہ نتیجہ ہوتا ہے دین کے مذہب میں بدل جانے کا۔

بہرحال، حضور نبی اکرمؐ نے نظریہ کی وحدت کی بنا پر ایک اُمت کی تشکیل فرمائی، جس میں دنیا کی ہر نسل اور

یک رنگی اُمت

ہر وطن کے افراد شامل تھے، لیکن ان کے نسلی، خاندانی، لسانی، وطنی سب امتیازات ختم ہو گئے تھے۔ ان پر صبغۃ اللہ، خدا کا رنگ اس طرح غالب آگیا تھا کہ انسانوں کے خود ساختہ رنگوں کا کوئی نشان باقی نہیں رہا تھا۔ ایک نظریۂ زندگی پر ایمان سے یک رنگی کا یہ عالم ہے کہ ؎

چیست ملّت ایکہ گوئی لا الٰہ؟ با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ

اور ایک مرکزِ محسوس کے نقطۂ ماسکہ قرار پا جانے سے یہ حالت کہ اس امّت کا ایک فرد دنیا کے کسی حصے میں ہو، اور زندگی کے کسی شعبے میں، اس کا مرکزِ توجہ وہی نقطہ تھا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، اس امت کے ہر فرد کی کیفیت یہ تھی کہ ؎

پَرَد دَر وُسعتِ گردُوں یگانہ نگاہِ او بہ شاخِ آشیانہ

اس پرندے کی سی کیفیت جو فضا کی پہنائیوں میں اُڑتا چلا جاتا ہے، لیکن آشیانے کی شاخ اس کی نگاہوں سے کبھی اوجھل نہیں ہوتی، وہ ہر شام اس کی طرف لوٹ کر آجاتا ہے۔

اس قوم سے کہا گیا تھا کہ:

(۱) وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ (۳/۱۰۲) خدا کی کتاب، قرآن مجید تمہارے لئے وجہ جامعیت ہے۔ اسے اپنی زندگی کا ضابطہ قرار دینا اور اس سے ذرا ادھر اُدھر نہ ہٹنا۔

(۲) تمہارے نظام کے مرکز کا فیصلہ، ہر معاملہ میں قولِ فیصل اور حرفِ آخر کی حیثیت رکھے گا۔ اگر کسی بات میں کبھی اختلاف ہو جائے تو فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ (۴/۵۹) اسے اس مرکز کی طرف (REFER) کر کے، وہاں سے فیصلہ لے لینا اور اس فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا۔

(۳) کعبہ تمہارا مرکزِ محسوس اور تمہاری نظریاتی وحدت کی علامت ہے اس کی اس حیثیت کو نگاہوں سے

اوجھل نہ ہونے دینا۔

(۴) اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) اپنے معاملات آپس میں مشورہ سے طے کر لیا کرنا اور کسی غیر کو ان میں دخل انداز نہ ہونے دینا۔ کوئی غیر مسلم نہ تمہاری قوم کا فرد قرار پا سکتا ہے، نہ شریکِ حکومت ہو سکتا ہے۔

(۵) امت کی وحدت کو قائم رکھنا اور مختلف فرقوں، پارٹیوں اور قوموں میں نہ بٹ جانا یہ شرک ہوگا (۳۰/۳۱)۔ ہمیشہ اُمت کے ساتھ رہنا، اپنے لئے کوئی الگ راہ تجویز نہ کر لینا (وَمَنْ يَّتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى) جو کسی الگ راستے پر چل نکلے، تو اس کا شمار اُمتِ مسلمہ میں نہیں ہوگا، اس قوم میں ہوگا جس کا راستہ اس نے اختیار کر لیا تھا۔

ان اصولوں کے مطابق جو قوم وجود میں آئی، اس کی عملی شکل آسمان کی آنکھ نے حجۃ الوداع کے اجتماع میں دیکھ لی۔ اُس دن عرفات کے میدان میں، کوئی ایک لاکھ کے قریب ایسے افراد جمع تھے، جن کی نسلیں مختلف قبیلے مختلف زبانیں مختلف وطن مختلف تھے، لیکن ان تمام اختلافات کو مٹا کر، وہ صرف اُمّتِ مسلمہ کے افراد تھے یہی تھی نظریہ کے اشتراک کی بنا پر قائم شدہ وہ بے مثال اُمت، جسے دیکھ کر حضور نبی اکرمؐ نے والہانہ انداز میں فرمایا تھا کہ:۔

رنگ، نسل، زبان، خون، وطن کے تمام اختلافات آج ہمارے قدموں کے نیچے پامال ہیں۔

قطرے کے جذبِ دریا ہو کر عین دریا ہو جانے کی یہی وہ رقص انگیز عشرت[1] تھی جس سے سرشار ہو کر حضرت سلمان ؓ نے اپنا تعارف اپنے والد کی طرف نسبت کرنے کے بجائے، سلمان بن اسلام کہہ کر کرایا تھا۔ اقبالؒ نے اس اُمت کو شہد کے چھتہ سے تشبیہہ دے کر کہا ہے کہ اس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

قطرۂ از لالۂ حمراستے　　　قطرۂ از نرگسِ شہلاستے

لیکن

این نمی گوید کہ من از عبہرم　　　آں نمی گوید من از نیلوفرم

وہاں حالت یہ ہوتی ہے کہ

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

---

[1] عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا۔ (غالبؔ)

اس قسم کی اُمت کی تشکیل کے بعد حضورؐ کا فریضۂ رسالت مکمّل ہو گیا اور آپؐ اس دنیا سے عالمِ بالا کی طرف تشریف لے گئے

بَرُوحِ اعظم دیاکش دَرُودِ لا محدود!

رسُولُ اللہؐ کے بعد

حضورؐ کے بعد اسلام دنیا کے دور دراز گوشوں تک پھیلا، مختلف نسلوں اور قوموں کے افراد اس دین کے حلقہ بگوش ہوئے اور اس کے ساتھ ہی وہ، اپنی سابقہ نسلی، قومی اور وطنی نسبتوں کو مٹا کر، امّتِ مسلمہ کے افراد بن گئے۔ اسی طرح اسلامی مملکت بھی مختلف ممالک تک پھیل گئی۔ انتظامی سہولتوں کے پیشِ نظر، ان ملکوں میں ولایات (صوبے) قائم کئے گئے، لیکن مرکز ایک ہی رہا نہ کسی ولایت کے مسلمانوں نے اپنے آپ کو الگ قوم کہا، اور نہ ہی کسی نے صوبجاتی خود مختاری (پراونشل اٹانومی) کا مطالبہ کیا، صوبجاتی خود مختاری تو ایک طرف حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں، عرب کے ایک قبیلہ نے یہ چاہا کہ مملکتی

مخالفینِ زکوٰۃ

ٹیکس (زکوٰۃ) کا جو روپیہ مرکزی حکومت کو جانا چاہیئے اسے وہ اپنی صوابدید کے مطابق اپنے علاقہ کی فلاح وبہبود کے کاموں پر خرچ کر لیا کریں۔ ان کے اس خیال کو بغاوت قرار دیا گیا اور انہیں الٹی میٹم دے دیا گیا کہ اگر وہ اس خیال سے باز نہ آئے تو ان کے خلاف فوج کشی کی جائے گی۔

اس میں شبہ نہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد، اسلامی نظام میں کمزوری واقع ہو گئی اور مختلف علاقوں میں مختلف مملکتیں بھی قائم ہو گئیں، لیکن اس کے باوجود کسی علاقہ کے مسلمانوں نے اپنے آپ کو اُمتِ مسلمہ سے الگ کوئی قوم قرار نہیں دیا۔ جہاں تک مرکزیت کا تعلق ہے، اس قدیم (اسلامی) تصور کا اتنا اثر باقی تھا کہ بغداد تباہ ہو چکا تھا، عباسی سلطنت (یوں کہیئے کہ) ختم ہو گئی تھی، لیکن اس کے باوجود محمود غزنوی جیسے سلاطین، خلیفہ سے سندِ بادشاہت حاصل کیا کرتے تھے اور ان کی مملکتوں میں خطبہ میں نام بھی خلیفہ ہی کا لیا جاتا تھا۔ ابنِ بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ سلطان محمد تغلق نے کس طرح خلیفہ ابو العبّاس سے (جو اس وقت یوں کہیئے کویا مصر میں ایک پناہ گزین کی حیثیت سے رہتا تھا) اپنے لئے حکمرانی کا اجازت نامہ حاصل کیا اور خلیفہ نے جب سفیر (شیخ الشیوخ رکن الدین) کے ہاتھوں یہ اجازت نامہ بھیجا، بادشاہ نے اسے کس قدر انعام وتحائف سے نوازا۔ مختلف ممالک کے مسلمان بادشاہوں کی یہی عقیدت، خلافتِ عثمانیہ کے ساتھ بھی وابستہ رہی۔ اور جب تک وہ خلافت قائم رہی، مسلمانوں کی (کم از کم) ذہنی وابستگی اس مرکز کے ساتھ علیٰ حالہٖ رہی۔

اب ایک قدم آگے بڑھئے، عیسائیت کی حیثیت اگرچہ ایک مذہب کی تھی، دین کی نہیں تھی، لیکن اس کے باوجود عقیدہ کا اشتراک دُنیائے عیسائیت میں بھی ذہنی ہم آہنگی کا موجب ضرور تھا۔ جب یورپ نے مذہب کو سیاست سے الگ کیا تو انہیں قومیت کے لئے کسی جدید اساس کی تلاش ہوئی۔ ظاہر ہے کہ جب انسانی زندگی سے نظریہ کے اشتراک کو الگ کر دیا جائے تو پھر وجہِ جامعیت نسلی یا وطنی اشتراک ہی رہ جاتا ہے۔ یورپ میں جن علاقوں میں کسی ایک نسل کے لوگ آباد تھے وہاں اشتراکِ نسل، قومیت کی اساس بن گیا، لیکن یہ صورت خال خال تھی۔ بیشتر ممالک ایسے تھے جہاں مختلف نسلوں کے لوگ آباد تھے۔ ان ممالک میں وطن کا اشتراک، قومیت کی اساس قرار پا گیا، یعنی ایک ملک میں بسنے والے تمام لوگ، ایک قوم کے افراد خواہ ان کا مذہب کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اس طرح وطن کی حیثیت محض مرز بوم کی نہ رہی بلکہ یہ ایک مخصوص سیاسی تصوّر کا حامل بن گیا۔ اسی کے ساتھ ہی جمہوریت نظامِ حکومت کے نظریہ کو بھی فروغ حاصل ہوتا چلا گیا، اور وطنیت اور جمہوریت کی یہ وبا، جنگل کی آگ کی طرح ساری دنیا میں پھیل گئی اور مسلمانوں کے ملک بھی اس کی لپیٹ میں آتے چلے گئے۔

نظریۂ وطنیت

اقبال جب یورپ گیا ہے تو وہ ایک تیس سالہ طالب علم تھا لیکن فطرت کی کرم گستری نے اسے ایسی مفکرانہ بصیرت عطا کی تھی کہ اس نے وہاں وطنیت کی اس تحریک کا گہری نظروں سے مطالعہ کیا جس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس سے اسلام اپنی جڑ بنیاد سے اکھڑ جائے گا۔ ایک ملک میں بسنے والے مسلمان اور غیر مسلم، ایک قوم کے افراد، اور دو ہمسایہ ملکوں میں رہنے والے مسلمان، دو الگ الگ قوموں کے افراد! اسلام نہیں کفر تھا، توحید نہیں شرک تھا۔ اسلام نے انسانوں میں وجہ جامعیت خدا (یعنی خدا کے عطا کردہ نظریۂ حیات)، کو قرار دیا تھا، لیکن وطنیت کی اس تحریک کی رُو سے، وجہ جامعیت وطن قرار پا جاتی تھی۔ اس طرح، وطن نے خدا کی پوزیشن حاصل کر لی تھی، چنانچہ جب اقبالؒ وہاں سے واپس آیا تو اس نے اس تصورِ قومیت کے خلاف آواز بلند کی اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ اس سے وہ کس طرح اسلام سے برگشتہ ہو جائیں گے، اس نے مومنانہ فراست، اور قلندرانہ جرأت کے ساتھ للکارا کہ ؎

اقبالؒ کا احتجاج

اس دَور میں مے اور ہے، جام اور ہے جم اور — ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور — تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

آپ ان الفاظ پر دوبارہ غور کیجئے کہ مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور ـــ اور دیکھئے کہ ان میں کس قدر عمیق حقیقت کو کیسے سادہ انداز میں واشگاف کیا گیا ہے۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ کعبہ، اُمّتِ مسلمہ کے لئے مرکزِ محسوس یا ان کی وحدت کی علامت ہے، لیکن جب وطن کو قومیت کی اساس قرار دے دیا جائے تو اس کا عملی مفہوم اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ ہر ملک میں بسنے والے مسلمانوں کا حرم الگ الگ قرار پا جائے گا۔ حضرت علامہؒ نے ارمغانِ حجاز میں کہا ہے کہ

حرم جُز قبلۂ قلب و نظر نیست   طوافِ اُو طوافِ بام و در نیست
میانِ ما و بیت اللہ رمزیست   کہ جبریلِ امیں را ہم خبر نیست

وہ بالِ جبریل میں کہتے ہیں کہ

عرب کے سوز میں سازِ عجم ہے   حرم کا راز توحیدِ اُمم ہے
تہی وحدت سے ہے اندیشۂ غرب   کہ تہذیبِ فرنگی بے حرم ہے

جب عالمگیر انسانیت کو وطنیت کی بنیادوں پر تقسیم کر دیا جائے تو پھر انسانوں میں وحدت پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں رہ جاتا۔ یہ ہے وہ بنیادی وجہ جس کی بنا پر اقبالؒ نے وطن کو مغرب کا تخلیق کردہ خدا قرار دیا اور مسلمانوں سے پکار کر کہا کہ

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے   غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوّت سے قوی ہے   اِسلام ترا دیس ہے تو مصطفویؐ ہے

نظّارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے!
اے مصطفویؐ خاک میں اس بت کو ملا دے

اس لئے کہ

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے!
قومیّتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اقبالؒ نے مسلمانوں کو اس خطرہ سے آگاہ کیا اور ہندو نے اس کی سب سے زیادہ مخالفت کی۔ بظاہر

ہندو کی طرف سے مخالفت

سمجھ میں نہیں آسکتا کہ وطنیت کا یہ نظریہ مغرب کا پیدا کردہ ہے اور اقبالؒ مسلمانوں کو اس کے مضمرات سے آگاہ کر رہا ہے۔ تو ہندو پر کیا

بنی تھی کہ وہ اس کی مخالفت میں سب سے پیش پیش ہوتا ؟ ہندو پر واقعی اس سے کچھ بن گئی تھی جو وہ یوں پیچ وتاب کھا رہا تھا۔ اس سے پیشتر ہندوستان میں جتنی قومیں باہر سے آئیں، ہندو نے انہیں اپنے اندر جذب کر لیا، لیکن مسلمان ایسی سخت ہڈی کا واقع ہوا تھا کہ ہندو کی ہزار کوششوں کے باوجود اس نے اپنا جداگانہ تشخص قائم رکھا۔ ہندو کی "کوٹلیا" سیاست نے اندازہ لگالیا کہ وطنیت کی تحریک میں ایسا سحر ہے جس سے وہ مسلمانوں کو اپنے اندر نہایت آسانی سے جذب کر لیگا۔ ہندوستان کے تمام باشندے، بلالحاظِ مذہب وملت، ایک قوم کے افراد، اور اس قوم کا نظامِ حکومت جمہوریت جس میں ہندو مستقل طور پر اکثریت میں، لہٰذا، اقتدار کا مالک۔ اور مسلمان ابدی طور پر اقلیت میں، فلہٰذا، محکوم یہ تھا ہندو کا وہ خواب، جو اقبالؒ کی للکار سے پریشان ہو رہا تھا۔ اس سے سمجھ میں آجائے گا کہ ہندو، اقبالؒ کے اس پیغام سے وقف اضطراب کیوں تھا بہرحال، ہندو کی اس مخالفت کے باوجود، اقبالؒ نے اپنے پیغام کو جاری رکھا۔ وہ قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو بالخصوص مخاطب کر کے کہتا تھا کہ :-

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر   خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار   قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تاآنکہ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان یہ حقیقت زیادہ وضاحت سے سامنے آنے لگ گئی کہ انگریز ہندوستان سے چلا جائے گا اور یہاں کی حکومت اہلِ ہند کے ہاتھ میں آجائے گی۔ اس سے اقبالؒ نے اپنے پیغام کو اور بھی زیادہ قوت اور شدت سے پیش کرنا شروع کر دیا اور اسی نسبت سے ہندو کی مخالفت بھی تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ ہندو کی مخالفت قابلِ فہم تھی، لیکن جب اقبالؒ نے دیکھا

نیشنلسٹ علماء

کہ خود مسلمانوں کے ایک طبقے نے بھی اس باب میں ہندو کی ہمنوائی شروع کر دی ہے تو اس کا قلبِ حساس خون بن کر آنکھوں سے ٹپک پڑا۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر جب اس نے دیکھا کہ مسلمانوں کے اس طبقہ کی قیادت، خود مسلمانوں کے مذہبی پیشواؤں ــــ نیشنلسٹ علماء ــــ کی طرف سے ہو رہی ہے" تو اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ جب مارچ ۱۹۳۸ء میں، (مولانا) حسین احمد مدنی نے کہا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" تو اقبالؒ بسترِ مرگ پر پڑا تھا۔ اس اعلان سے اس کے قلبِ مضطر سے ایک چیخ ابھری اور ان الفاظ

کی شکل میں فضائے عالم کو چیر گئی کہ

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ ز دیو بند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است

بہ مصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر بہ اُو نرسیدی تمام بولہبی است!

"بمصطفٰے برساں خویش را"، کے الفاظ پر غور کیجئے۔ ایک عظیم حقیقت آپ کے سامنے بے نقاب ہو گی میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسلام کی رُو سے قوم کی تشکیل رسولؐ کی نسبت سے ہوتی ہے۔ اگر قومیّت کی اساس، وطن قرار پا جائے تو رسولؐ سے نسبت ختم ہو جاتی ہے۔ اسی بنا پر وہ (مولانا) مدنی سے کہتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل کیلئے اپنی نسبت وطن کی طرف کرنے کے بجائے رسولِ پاکؐ کی طرف کرو۔۔۔یہی دین کی اصل و اساس ہے۔ اسی بنا پر حضرت علاّمہؒ نے اپنے اس بیان میں، جسے انہوں نے (مولانا) مدنی کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا، اس امر کی تصریح کی تھی کہ وطنیّت کا عقیدہ اور انکارِ ختمِ نبوّت، اپنے نتیجہ کے اعتبار سے ایک ہی سکّہ کے دو رُخ ہیں۔ ان دونوں میں مسلم قومیت کی اساس رسالتِ محمدیہؐ نہیں رہتی اور جب مسلم قومیّت کی اساس رسالتِ محمدیہؐ نہ رہے تو پھر اسلام باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ انہوں نے اس نکتہ کی وضاحت کے لئے لکھا تھا کہ

> اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ "دین" اور "وطن"، بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو بروقت انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلۂ اوّل تو لادینی ہو گی، اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروائی۔

یہ اقبالؒ کے آخری الفاظ تھے۔ اس کے بعد انہوں نے اس شمع کو قائدِاعظمؒ جیسے امیں کے ہاتھوں میں دیا اور خود زندگی کی اگلی وادیوں کی طرف تشریف لے گئے۔

قائدِاعظمؒ

قائدِاعظمؒ کے مدِّمقابل خود (مہاتما) گاندھی تھا کیونکہ انہوں نے نیشنلسٹ علماء کو (SHOW - BOYS OF CONGRESS) کہہ کر جھٹکار دیا تھا۔ گاندھی اور جناح کی اس جنگ کا مرکزی محاذ مسئلہ قومیت ہی تھا کہ یہی مسئلہ درحقیقت بساطِ سیاست پر فیصلہ کن مہرہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ مسٹر گاندھی کا دعویٰ تھا کہ

> میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کریں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔

اگر ہندوستان، اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک ہی قوم رہنا چاہیئے، خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

(جناح کے نام خط، مورخہ ۹/۱۵ ۴۴)

قائدِ اعظمؒ کی طرف سے اس کا جواب یہ تھا کہ:۔

پاکستان کی ابتداء تو اسی دن سے ہو گئی تھی، جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہؤا تھا، کیونکہ اس سے ایک جداگانہ قوم کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ (علی گڑھ کی تقریر۔ مارچ ۱۹۴۴ء)

اور اس حقیقت کو انہوں نے بار بار واضح کر دیا تھا کہ ہمارے اس دعویٰ کا جذبۂ محرکہ کسی سیاسی مقصد کا حصول نہیں یہ اسلام کا بنیادی تقاضا ہے۔ یہ ہمارے دین کا مطالبہ ہے جسے مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑ سکتے۔— دین کی کتنی بڑی بنیادی حقیقت مضمر تھی قائدِ اعظمؒ کے ان الفاظ میں کہ مسلم قومیت کا آغاز تو اسی دن سے ہو جاتا ہے جب کسی ملک میں پہلا غیر مسلم، اسلام قبول کر لیتا ہے۔ وہ شخص اسلام لانے سے اپنی پہلی قوم کا فرد نہیں رہتا، خواہ اس قوم کی بنیاد نسل کا اشتراک ہو اور خواہ وطن کا، وہ ان سب نسبتوں سے کٹ کر، اپنی نسبت رسالتِ محمدیہؐ سے وابستہ کر لیتا ہے اور اسی نسبت سے وہ امتِ محمدیہ کا فرد بن جاتا ہے، یہی تھا ہمارے دین کا وہ تقاضا جس کی بنا پر ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا، یعنی ساری دنیا میں بسنے والے مسلمان، ایک قوم (امت)، کے افراد، اور خود اپنے ملک میں رہنے والے غیر مسلم، دوسری جماعت کے افراد۔

میں، برادرانِ عزیز! پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اگر قومیت کی اساس نسل یا وطن تسلیم کر لی جائے، تو تشکیلِ قومیت کے لئے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی، ہر بچہ، جو اس خاص نسل میں، یا اس وطن کی حدود کے اندر پیدا ہوتا ہے، وہ از خود اس قوم کا فرد بن جاتا ہے، لیکن جب قومیت کی اساس نظریۂ زندگی قرار پائے تو اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ بچوں کے دل میں اس نظریہ کو راسخ کیا جائے۔ اور اس عمل کو مسلسل جاری رکھا جائے، کیونکہ بچوں کی پیدائش کا سلسلہ متواتر جاری رہتا ہے۔ جب قرآن کریم نے حضور نبی اکرمؐ کا فریضۂ زندگی یہ بتایا کہ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ. ۲:۱۲۹ کہ وہ کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے تو اس سے اس حقیقت کا افشا مقصود تھا کہ کوئی بچہ کسی نظریہ کو ساتھ لے کر دنیا میں نہیں آتا۔ آپ جس نظریہ کا حامل اپنی

قوم کو بنانا چاہتے ہیں مسلسل تعلیم و تربیت سے اس نظریہ کو بچوں کے قلب و دماغ کی گہرائیوں میں پیوست کرتے جائیے۔

ہماری غفلت

میں نے، عزیزانِ من! جب تحریکِ پاکستان کے دوران نیشنلسٹ علماء سے مسئلہ قومیت پر جنگ لڑی تو میں نے دیکھا کہ ان لوگوں کو اس میدان میں شکست دے دینا چنداں مشکل نہیں تھا کیونکہ ان سے مقابلہ سند اور دلیل کی رُو سے ہوتا تھا، لیکن (میں نے محسوس کیا) کہ قوم کے نوجوانوں کو دین کی بنیادوں پر، اس نظریہ کا سمجھانا نسبتاً مشکل تھا، کیونکہ دین کی تعلیم انہیں حاصل نہیں تھی اور مغربی نظریۂ قومیت اور جمہوریت ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ یہ تھے وہ اسباب و وجوہ جن کی بنا پر میں نے تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد، اربابِ قوم سے یہ کہنا شروع کیا کہ وہ آنے والی نسلوں کی صحیح تعلیم و تربیت کا انتظام کریں کیونکہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ان نوجوانوں کے سامنے دین کے نظریات آئیں گے نہیں اور مغربی نظریات ان کے دل و دماغ پر چھا جائیں گے اس سے وہ بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی جن پر پاکستان کی جداگانہ مملکت کی عمارت استوار ہوئی ہے میں نے تیئیس سال تک مسلسل اس پکار کو جاری رکھا، لیکن افسوس ہی نہیں انتہائی صدمہ ہے کہ کسی نے اس پر کان نہ دھرا، میں نے بڑے سے بڑے ذمہ دار حلقوں تک اس آواز کو براہِ راست پہنچایا۔ کوئی اس کی افادیت اور اہمیت سے انکار نہیں کرتا تھا لیکن اس کے باوجود کسی نے اس کے لئے کوئی عملی قدم نہ اُٹھایا، نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔ آج آپ جسے پاکستانی قوم کہتے ہیں، یہ درحقیقت وہی بچے ہیں جو یا تو تشکیلِ پاکستان کے وقت دو چار دس برس کے تھے، اور یا اس کے بعد پیدا ہوئے۔ ان میں سے کسی کو آپ نے اسلام کے نظریۂ قومیت کی تعلیم نہیں دی، اور جب آپ نے انہیں اس کی تعلیم نہیں دی تو اس تعلیم کی عدم موجودگی میں یا تو نسلی وابستگی قومیت کی اساس قرار پائے گی اور یا وطنیت کا اشتراک، آپ نے تو انہیں اسلام کے نظریاتِ حیات کی تعلیم نہ دی، لیکن مشرقی

مشرقی پاکستان کا نوجوان

پاکستان میں ہندو[1] اساتذہ نے آپ کے بچوں کو یہ پڑھایا کہ بنگالی ہندو ہو یا مسلمان، وہ مشرقی پاکستان کا رہنے والا ہو یا مغربی بنگال کا، ان سب کی نسل ایک ہے، زبان ایک، کلچر ایک۔ اس تعلیم سے وہ نوجوان جس قسم کی ذہنیت لے کر ابھریں گے، اس کا نمونہ آپ نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایم۔ اے کے طالب علم، عزیز الرحمٰن کے اس خط میں دیکھ لیا ہو

---

[1] حال ہی میں اس کا انکشاف ہوا ہے کہ مشرقی پاکستان کے اسکولوں اور کالجوں میں قریب اسّی فیصد اساتذہ ہندو ہیں۔

گا جو طلوعِ اسلام کی اپریل ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا اس کے دو چار فقرے دہرانے کی اجازت دیجئے۔ اس مسلمان نوجوان نے لکھا تھا کہ غنیمت ہے کہ اب خوابیدہ بنگالیوں میں حرکت کے آثار نمودار ہو رہے ہیں، ورنہ ہماری حالت یہ ہو چکی تھی کہ

> ہم شری چیتنیا، خودی رام بھاش چندربوس، بجائے سنگھ جیسے اپنے قومی ہیروز کو فراموش کر بیٹھے تھے اور ان کی جگہ خالدؓ، طارقؒ، موسیٰؑ اور (حضرت) علیؓ جیسوں کو اپنا ہیرو سمجھنے میں فخر محسوس کرنے لگ گئے تھے۔ ہم نے اپنے دیس کے بھگوان کو بھلا دیا تھا اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی، بدیشی خدا کو اپنا معبود بنا لیا تھا جسے اللہ کہا جاتا ہے، ہم اپنے بچوں کا نام اپنی زبان کے بجائے ایک اجنبی زبان میں رکھنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ ہم نور اللہ اور خلیل اللہ جیسے ناموں پر ریجھ گئے تھے اور ناگنی اور کھاگنی جیسے سیدھے سادے ناموں کو تیاگ بیٹھے تھے۔

یہ خط اس نوجوان نے لکھا تھا بنگالی سال نو کی تقریب منانے کے سلسلہ میں۔ اس ضمن میں اس نے، اس تقریب کے منانے والوں سے کہا تھا کہ،

> قوم آپ سے پوچھنا چاہتی ہے کہ ہم اس تقریب کو اس طریق سے سنائیں جس طریق سے یہ ہزاروں سال سے منائی جاتی رہی ہے یا اسے محفلِ میلاد کی طرح منائیں جسے ایک غیر ملکی آئیڈیالوجی کا معتقد طبقہ مناتا ہے۔

معاذاللہ، صد بار معاذاللہ!۔

اے محمدؐ اگر قیامت را برآری سر زخاک سر برآر و ایں قیامت درمیانِ خلق بیں!

میں سمجھتا ہوں، عزیزانِ من! کہ ان دل خراش اور جگر سوز الفاظ کے سننے سے آپ کا آبگینۂ قلب بھی، میری طرح آنکھوں کے چشموں سے خون بن کر بہ نکلا ہوگا، لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اس کا ذمہ دار کوئی عزیزالرحمٰن نہیں، اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں جنہوں نے اس بنیادی مسئلہ سے اس طرح مجرمانہ تغافل برتا، اور قوم کے بچوں کو عزیزالرحمٰن اور مجیب الرحمٰن بننے کے لئے ناقۂ بے زمام کی طرح آوارہ چھوڑ دیا۔ آج قوم کا ہر سربراہ حالیہ قیامت پر، سینے پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتا دکھائی دیتا ہے لیکن میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ

شکریہ پرسشِ غم کا، مگر اصرار نہ کر
پوچھنے والے یہ تیرا ہی کہیں راز نہ ہو

لیکن ہم مغربی پاکستان والوں کو یہ کہہ کر خود فریبی میں مبتلا نہیں ہو جانا چاہیئے کہ یہ حالات مشرقی پاکستان

مغربی پاکستان کی حالت

تک محدود ہیں، ہمارے ہاں سب خیریت ہے۔ یہ غلط ہے۔ ہمارے ہاں کے نوجوانوں کی تعلیم بھی اسی نہج پر ہوئی ہے، جس کی وجہ سے انہیں بھی یہ معلوم نہیں کہ اسلام کے اصول و مبانی کیا ہیں اور وہ نظریۂ حیات و معیارِ قومیت کیا جس پر مملکتِ پاکستان کی عمارت استوار ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں "خیریت" اس لئے نظر آتی ہے کہ مغربی پاکستان کے تمام باشندے نہ ایک نسل سے متعلق ہیں اور نہ ہی ان سب کی زبان ایک ہے، اس لئے یہاں کے نوجوانوں کے دل کی دھڑکن ملک گیر ہونے کے بجائے مقامی بن کر رہ جاتی ہے۔ عزیز الرحمٰن نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ:۔

> (اب) ہمارا بنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہوتا جا رہا ہے، اس سے اسلامی قومیت کے بند ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے رشتے مضبوط ہو جائیں گے۔ مشرقی پاکستان کی اس روش کے تتبع میں مغربی پاکستان میں ہمارے سندھی بھائی بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے بھی یہ سمجھنا سیکھ لیا ہے کہ ہم راجہ داہر کی اولاد ہیں اور پہلے سندھی اور اس کے بعد کچھ اور ہیں۔

مشرقی پاکستان چونکہ ایک علاقہ تھا، اس لئے وہاں ایک علاقائی قومیت نمودار ہوئی۔ مغربی پاکستان چار پانچ علاقوں پر مشتمل ہے اس لئے یہاں چار پانچ قومیتوں کے جراثیم پرورش پا رہے ہیں۔ اسلامی نظریہ قومیت نہ وہاں تھا نہ یہاں ہے۔

مغربی پاکستان کے نوجوانوں کی ذہنیت کیا ہو چکی ہے، اس کا اندازہ اس ایک خط سے لگائیے جو ہمیں حال ہی میں موصول ہوا ہے (اور اس قسم کے خطوط اکثر موصول ہوتے رہتے ہیں)، یہ لکھنے کے بعد کہ طلوعِ اسلام نیشنلسٹ علماء کے حق میں جو گستاخیاں کرتا ہے، اس سے اسے شرم کرنی چاہیئے، لکھا ہے کہ

> آج آپ کے ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے کیا وہ دو قومی نظریہ کی ذلت ترین (؟) شکست نہیں۔ ون یونٹ کا ختم ہو جانا اور مشرقی پاکستان کی تباہی کے پس پردہ جو کچھ ہوا ہے وہ اس بات کی منہ بولتی ہوئی تصویر ہے کہ قومیں وطن اور زبان سے بنتی ہیں۔۔۔۔۔ ڈاکٹر اقبالؒ اور ان کے ہمنواؤں کی جذباتی باتوں سے جس قدر نقصان مسلمانوں کے اذہان کو پیدا ہوا ہے اس پر تو بیسیوں کتابیں لکھی جا سکتی ہیں، مگر کیا کیا جائے۔ مسلمانوں کے ذہن جب تک مسدود رہیں گے، کہنا اور بتانا لاحاصل ہے۔۔۔۔۔ آخر میں آپ سے گزارش کروں گا کہ آپ ان مومنین کو جنہوں نے متحدہ قومیت کو اپنایا، اپنے قلم کے نشتروں سے بدنام اور معتوب نہ گردانیں وہ جو کچھ کہہ گئے ہیں، اس کی سچائی اب روز روشن کی طرح عیاں ہو رہی ہے۔

یہ ہے ہلکا سا عکس اس ذہنیت کا جو خود مغربی پاکستان کے نوجوانوں میں عام ہو رہی ہے۔

پاکستانی قوم، مسلم اور غیر مسلم

علاوہ ازیں، ایک چیز ایسی ہے جو یہاں اور وہاں، دونوں جگہ، بطور قدرِ مشترک موجود ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، مطالبۂ پاکستان کی بنیاد یہ تھی کہ مسلمان دین کے اشتراک کی بنا پر، ایک الگ قوم ہیں اور کوئی غیر مسلم، اس قوم کا جزو قرار نہیں پا سکتا۔ غیر مسلم، جداگانہ قوم ہیں۔ ہمارا یہ دعویٰ جو عین اسلام کا دعویٰ تھا، واہگہ کی سرحد تک برقرار رہا۔ لیکن جونہی ہم نے اس سرحد کو عبور کر کے، سرزمینِ پاکستان میں قدم رکھا اپنے اس بنیادی دعویٰ کو لپیٹ کر الگ رکھ دیا، اور مسلمانوں اور غیر مسلموں، دونوں کو ملا کر ایک قوم قرار دے دیا۔ چنانچہ یہ اب ایک مسلّمہ حقیقت بن چکی ہے، یعنی ہم نے تسلیم کر لیا ہے کہ قومیت کی بنیاد وطنیت ہے، نظریۂ حیات نہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ آپ جب کسی نوجوان سے اس نظریہ کے متعلق بات کریں، تو وہ بلا ساختہ کہہ دیتا ہے کہ یہ معیار نہ اسلام کا تقاضا تھا نہ دین کا مطالبہ۔ اسے آپ لوگوں نے اپنا مقدمہ جیتنے کے لئے ایک وکیلانہ حربہ کے طور پر اختیار و استعمال کیا تھا۔ مقدمہ جیت لیا، اور حربہ بے کار سمجھ کر الگ کر دیا۔

میں پوچھتا ہوں ملک کے اربابِ دانش و بینش اور اعیانِ سیاست و حکمت سے کہ ان کے پاس نوجوانانِ ملّت کے اس اعتراض کا کوئی جواب ہے؟ اتنا ہی نہیں، ان کے اس اعتراض کے بعد، بانیانِ پاکستان بالخصوص قائدِ اعظمؒ کے کردار کے متعلق جو تصور ذہنوں میں ابھرتا ہے، اس کا کوئی مداوا بھی ہے؟ اور علمی اعتبار سے دیکھئے تو مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا ہے کیا اس کی ایک بنیادی وجہ یہ نہیں کہ ہم نے وہاں کے ڈیڑھ کروڑ ہندوؤں کو بھی مسلمان قوم کا جزو قرار دے رکھا ہے! آپ کچھ بھی کہیئے، میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہم نے جو دو قومی نظریہ کی عملی تکذیب سے اسلام کا مذاق اڑایا ہے، یہ سب اس کی سزا ہے۔

حذر! اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

محکوم قوموں کی مصیبت یہ ہوتی ہے کہ وہ حاکم اقوام کی ہر ادا میں دلکشی اور جاذبیت محسوس کرتی ہیں، وہ ان کے مسلک و مشرب پر تنقیدی نگاہ نہیں ڈالتیں، بلکہ انہیں آنکھیں بند کئے تقلیداً اختیار کئے رہتی ہیں۔ اپنی آزاد مملکت کے قیام سے ہم جسمانی طور پر تو بے شک آزاد ہو گئے ہیں، لیکن اپنے نظریاتِ زندگی سے بے خبری کی وجہ سے، ہم ذہنی طور پر اقوامِ مغرب کے بدستور غلام ہیں اور اس غلامی کی بھی یہ حالت ہے

کہ جو نظریہ ان کے ہاں مردود و مطرود قرار پا جاتا ہے، ہمارے ہاں بدستور مقبول و محبوب رہتا ہے۔ وطن یا نسل

نیشنلزم اور مغربی مفکرین

کی بنیادوں پر قومیت کی تشکیل کے نظریہ کے جو تباہ کن نتائج دنیا کے سامنے آئے ہیں ان کے پیشِ نظر اب خود مغرب کے مفکرین اس سے سخت نالاں ہیں میں اس موضوع پر بھی بہت کچھ لکھ چکا ہوں، اس وقت صرف دو ایک آراء پر اکتفا کروں گا۔ لندن یونیورسٹی کا پروفیسر کوبن لکھتا ہے کہ "قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور عداوت پر پرورش پاتا ہے"۔ رسل نے کہا ہے کہ نیشنلزم نوعِ انسان کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔ پھر تماشا یہ ہے کہ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے لیکن وہ اپنے ملک کی نیشنلزم کے حق میں قصیدے پڑھتا ہے"۔ ہکسلے کہتا ہے کہ نیشنلزم ایک بت پرستانہ مذہب ہے جو تفریق اور فسادِ انسانیت کے لئے ایسا طاقت ور ہے جس کا مقابلہ کوئی اور مذہب نہیں کر سکتا"۔ اہلِ مغرب جنہوں نے اس نظریہ کو جنم دیا تھا اس کے ہاتھوں اس قدر نالاں ہیں لیکن ہم کہ جن کے دین نے چودہ سو سال پہلے اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تھا، اسے سینے سے لگائے پھر رہے ہیں۔

وطنیت کے نظریۂ قومیت سے آگے بڑھ کر اب ایک اور نظریہ ہمارے عناں شکن نوجوانوں کے لئے وجۂ جاذبیت بن رہا ہے اور وہ ہے سوشلزم کا نظریۂ قومیت۔ قرآن کی طرح، یہ نظریہ بھی تمام انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کرتا ہے لیکن دونوں کے معیارِ تقسیم و تفریق میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ قرآن کا معیار یہ

سوشلزم کا نظریۂ قومیت

ہے کہ دنیا کے جو انسان زندگی کی بلند اقدارِ انسانیت کو صحیح تسلیم کریں، وہ ایک قوم کے افراد، جو ان اقدار سے انکار کر کے، زندگی کو محض حیوانی سطح پر دیکھیں، وہ دوسری قوم کے ارکان لیکن سوشلزم کا نظریہ یہ ہے کہ زندگی تو صرف حیوانی سطح کی ہے، یعنی طبیعی زندگی اور بس۔ لیکن اس سطح پر دو گروہ پائے جاتے ہیں، ایک گروہ محنت کشوں اور کاشت کاروں کا ہے اور دوسرا گروہ سرمایہ داروں اور زمینداروں کا۔ بالفاظِ دیگر ایک گروہ لوٹنے والوں (EXPLOITERS) کا ہے اور دوسرا گروہ لٹنے والوں (EXPLOITED) کا، ان دونوں گروہوں میں شروع ہی سے باہمی تنازعہ اور جنگ جاری ہے اور انسانی تاریخ اسی جدل و پیکار کی داستان ہے، جو لوگ جدل و پیکار اور فساد و انتشار برپا کر کے، ذرائع پیداوار استحصال پسندوں کے ہاتھ سے چھین کر، لٹنے والوں کو دے دیں وہ انقلاب پسند کہلاتے ہیں یہ انقلاب

پسند کسی ملک میں ہوں اور کسی نسل سے متعلق، سب ایک قوم کے افراد ہیں۔ مذہب کا اس میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ جب زندگی کو محض طبیعی تسلیم کر لیا جائے تو پھر خدا کا وجود (ان کے الفاظ میں) استحصال پسندوں کے تراشیدہ حربے سے زیادہ کچھ نہیں رہتا۔ لیکن آپ سوچئے کہ ارفع نظریاتِ زندگی، اور بلند اقدارِ انسانیت سب کو غرقِ مئے ناب کر کے، صرف پیٹ کے مسئلہ کو واحد انسانی مسئلہ قرار دے دینا کس قدر وجۂ تذلیلِ انسانیت ہے۔ اقبالؒ نے اسی بنا پر کارل مارکس کے متعلق کہا ہے کہ

دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس   بر مساواتِ شکم دارد اساس

میں چونکہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکا ہوں، اس لئے اس مقام پر اس کی وضاحت میں جانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں میں صرف اتنا کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ خود روٹی کا مسئلہ بھی حیوانی سطحِ زندگی پر حل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ایک محکم اساس کی ضرورت ہے، اور محکم اساس، قرآن کا عطا کردہ نظریۂ زندگی ہے جو اسلامی قومیت کا مدار قرار پاتا ہے۔

چونکہ ہمارے نوجوانوں کے ذہن میں، نہ خدا کا صحیح تصور ہے نہ دین کا۔ وہ نہ بلند اقدارِ حیات سے واقف ہیں نہ انسانی زندگی کی ممکنات سے اور ملک کے غلط معاشی نظام کی وجہ سے روزگار کے دروازے ان پر بند ہوتے ہیں، اس لئے یہ سوشلزم کے اس نعرے میں بڑی دلکشی محسوس کرتے ہیں اور کشاں کشاں اس کی طرف بہے چلے جاتے ہیں۔ مذہب پرست طبقہ جو اسلام ان کے سامنے پیش کرتا ہے، وہ نظامِ سرمایہ داری کا نقیب ہوتا ہے، اس لئے وہ ان نوجوانوں کی عناں تابی کے ساتھ تازیانہ کا کام دیتا ہے۔ یاد رکھئیے! جتنی کوئی قوم مذہب پرست ہو گی، (دین کی حامل نہیں بلکہ مذہب پرست) اس کی فضا، اتنی ہی وطنیت، دہریت، سوشلزم وغیرہ کے لئے زیادہ سازگار ہو گی۔ پاکستان میں دین کی تعلیم کو نظرانداز کر کے مذہب کے فروغ کے لئے جو مسلسل تگ و تاز ہوتی ہے، ہمارے نوجوانوں کی بے راہ روی اس کا منطقی نتیجہ ہے۔

اس مقام پر، عزیزانِ من! مجھ سے پوچھا جائے گا کہ — کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں — اس سوال کا میرا جواب اب بھی وہی ہے جو میں تئیس برس سے دیئے چلا آ رہا ہوں۔ پھر اسی جواب پر اعتراض بھی وہی جو پہلے دن سے وارد کیا جا رہا ہے اور اس اعتراض کا بھی میرا وہی پرانا جواب۔

علاج اس کا

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ آپ کو قوم کا نظامِ تعلیم بدلنا ہوگا، جس سے قوم کے بچوں کے ذہن نشین بلکہ دلنشین ہو جائے کہ قرآنی تصورِ حیات کیا ہے. بلند اقدارِ سماوی کا انسانی زندگی سے تعلق کیا ہے. زندگی کے مسائل کیا ہیں اور قرآن ان کا حل کیا بتاتا ہے. یہیں سے یہ واضح ہوگا کہ اسلام کا نظریہ قومیت کیا ہے. اور یہ نظریہ کس طرح اسلامی مملکت کی بنیاد قرار پاتا ہے. ان نظریات کو چھوڑ کر نہ کوئی فرد مسلمان ہو سکتا ہے اور نہ کوئی مملکت اسلامی کہلانے کی مستحق. ہمارے جو بچے ان تصورات کو لے کر برومند ہوں گے وہ اس قابل ہوں گے کہ نسلی، لسانی، علاقائی، وطنی حدود سے بلند ہو کر خالص اسلامی نظریہ کی بنیاد پر ایک قوم متشکل کر سکیں. یہی نوجوان مملکتِ پاکستان کے جداگانہ وجود کی اہمیت کو سمجھیں گے اور یہی اس کے استحکام وبقا کے لئے ہر قربانی دینے کے لئے ہر وقت آمادہ. انہیں نہ کوئی ہندو خرید سکے گا. اور نہ ہی کوئی اِزم ورغلا سکے گی۔

ہندو کے ساتھ مل کر ایک قوم بننا تو ایک طرف، جو قوم اسلام، مسلمان اور پاکستان کی ایسی دشمن ہو، اس کے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی، اس کے لئے مجھے ایک واقعہ یاد آگیا. اسٹیٹس مین (انڈیا) کے ایڈیٹر مسٹر کلدیپ نیّر نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (INDIA; THE CRITICAL YEARS) اس میں وہ لکھتا ہے کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران فیروز پور سیکٹر میں ایک نوجوان پاکستانی افسر گرفتار ہوگیا. وہ سخت زخمی تھا اور اسے خون دینے کی ضرورت تھی، لیکن اس نے یہ کہہ کر خون لینے سے انکار کر دیا کہ میں اسلام اور پاکستان کے دشمن کا خون اپنی رگوں میں داخل کر کے، جینے کے مقابلہ میں موت کو ترجیح دوں گا —— اور اس نے اسی طرح جان دے دی۔

ہم ہر روز دنیا کے کاروبار سے فارغ ہو کر، عشاء کی نمازمیں، وتروں کی آخری رکعت میں خدا کے حضور اقرار کرتے ہیں کہ وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ ۔ جو تجھ سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتا ہے، ہم اس سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے. ہم ہر رات سونے سے پہلے فقط زبان سے یہ اقرار کر لیتے ہیں اور اس کے باوجود اپنے تمام تعلقات ان سے وابستہ رکھتے ہیں اور دوسری طرف یہ مردِ مجاہد ہے جو جان دے دیتا ہے، لیکن ایسے لوگوں سے پیوند سازی نہیں کرتا. ہیچ ہے۔

ملا کی اذاں اور ، مجاہد کی اذاں اور

لمبا پروگرام

میرے اس جواب پر اعتراض یہ کیا جاتا ہے —— اور یہ اعتراض بھی اتنا ہی پرانا ہے

جتنا پُرانا میرا یہ جواب ہے ـــ کہ یہ تو بڑا لمبا پروگرام ہے ؎ کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک ـــ زمانے کے حالات برق رفتاری کے ساتھ بدل رہے ہیں، اور آپ ایسا سُست خرام علاج تجویز کر رہے ہیں ؎ خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک ـــ

اور اس اعتراض کا میرا جواب بھی وہی ہے کہ اگر آپ اس کے لئے کوئی (SHORT - CUT) تجویز کر سکتے ہیں تو فرمائیے۔ آپ نے شارٹ کٹس آزما کر دیکھ لئے ہیں ان کا نتیجہ ہنگامہ آرائیوں اور فساد انگیزیوں کے سوا اور کیا برآمد ہوا ہے۔ یاد رکھئے! آپ فطرت کے قاعدوں کو نہیں بدل سکتے۔ انسانی بچّے نے جو کچھ تعلیم و تربیت سے سیکھنا ہے، دنیا میں ابھی تک کوئی ایسا انجکشن ایجاد نہیں ہوا، جس کے ذریعے وہ سب کچھ اس کے دل و دماغ میں جذب کر دیا جائے۔ مریضِ غم کی ہزار بے چینی اور لاکھ بیتابی، درازیٔ شب میں ایک لمحہ کی بھی کمی نہیں کر سکتی۔ نوجوانوں کے قلب و دماغ کو ایک خاص قالب میں ڈھالنے کے لئے وقت درکار ہو گا۔ آپ نے یہی اعتراض آج سے تیئس سال پہلے کیا تھا، اگر آپ اس وقت اس پروگرام کی طوالت اور سُست رفتاری سے گھبرا کر اس سے اعراض نہ برتتے اور اس پر عمل شروع کر دیتے، تو آپ اپنی موجودہ قوم کا یہ رونا نہ روتے۔ اسے پھر سُن لیجئے کہ اس طریق کار کا نہ کوئی بدل ہے نہ کوئی شارٹ کٹ۔ آپ نے جب بھی اپنے آپ کو سنبھالنا چاہا، اسی پروگرام کو اختیار کرنا ہوگا۔ یاد رکھیئے! ؎

جنہیں حقیر سمجھ کر بجُھا دیا تم نے وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہو گی۔

اور یہ چراغ، اُسی ذاتِ اقدسؐ و اکرم کے نقوشِ قدم کے سوا اور کہیں نہیں ملیں گے جسے اس کے بھیجنے والے نے سراجاً منیراً (جگمگاتی ہوئی قندیل) کہہ کر پکارا ہے اور جس سے کسبِ ضیا کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں۔

اس قندیلِ آسمانی سے کسبِ ضیاء کے ہم ہی محتاج نہیں، آج تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی ساری دُنیا اس کی راہنمائی کے لئے تڑپ رہی ہے۔ مشہور امریکی مفکر ممفورڈ (LEWIS MUMFORD) اس باب میں لکھتا ہے ۔

تہذیب، درحقیقت اس عملِ پیہم اور غیر مختتم کا نام ہے جو ایک دنیا اور ایک انسانی برادری کی تشکیل کرے۔ اگر ہم نے اس عملی وحدت کو مزید التوا میں رکھا تو اس کا نتیجہ عالمگیر تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا، مغربی اندازِ معاشرت کا کھیل کھیلا جا چکا ہے اور یہ تمدن بُری طرح ناکام ثابت ہوا ہے...... اب دُنیا کو

ایک ایسے بطلِ جلیل کی ضرورت ہے جو اس کلچر اور تاریخ کی تمام حدود کو توڑ دے جس نے انسانوں کو اپنے اندر قید کر رکھا ہے اور اس طرح ان کی نشو ونما کے راستے میں بری طرح حائل ہو رہی ہے — اُس بطلِ جلیل کی ضرورت جو کاروانِ انسانیت کو موجودہ تباہی کے ویرانوں سے نکال کر، وحدتِ انسانیت کے عالمگیر نظام کی طرف لے جائے۔ (TRANSFORMATION OF MAN)

اور ظاہر ہے کہ یہ بطلِ جلیل، یہ سالارِ کاروانِ انسانیت، اس پیغامبرِ انقلابؐ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے جس نے آج سے چودہ سو سال پہلے، رنگ، نسل، زبان، وطن کی تمام حدود وقیود سے بالاتر ہو کر اعلان کیا تھا کہ

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (۷/۱۵۹) اے نوعِ انسان! میں کسی خاص قوم، خاص ملک کی طرف نہیں، بلکہ عالمگیر انسانیت کی طرف پیغامِ وحدت لے کر آیا ہوں۔

میرا پیغام، ان تمام نظریات، ان تمام آئین ودساتیر، اور ان تمام قوموں اور قوتوں کے خلاف اعلانِ جنگ ہے جو يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ (۲/۲۷) جنہوں نے اس انسانی برادری کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے جسے جوڑنے کا حکم خدا نے دیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۳۳/۵۶)

قائدِاعظمؒ اور دو قومی نظریہ

(فروری ۱۹۷۱ء)

مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اس دعوے پر تھی کہ اسلام کی رُو سے قومیت کا معیار اشتراکِ وطن نہیں بلکہ ایمان کا اشتراک ہے اور اس بنا پر ہندوستان میں بسنے والے مسلمان، ہندوؤں سے الگ، ایک مستقل قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی مسئلہ ہندوؤں اور مسلمانوں (بلکہ یوں کہیئے کہ مطالبۂ پاکستان کے حامیوں اور مخالفوں) میں مابہ النزاع تھا۔ یہ سوال کہ جب اس طرح مسلمانوں کی اپنی الگ مملکت قائم ہوگئی، تو اس کا نقشہ کیا ہوگا، مابہ النزاع نہیں تھا۔ ہندوؤں کو اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی کہ مسلمان اپنی مملکت کس نقشہ کے مطابق قائم کریں گے۔ وہ دو قومی نظریہ کے خلاف تھے جو مطالبۂ پاکستان کی بنیاد تھا۔ اور یہی وہ مسئلہ تھا جس پر قائدِاعظمؒ نے ہندو اور انگریز، دونوں سے دس سال تک لڑائی لڑی تھی۔ اس باب میں قائدِاعظمؒ کا ذہن اس قدر صاف تھا کہ انہیں نہ اُس کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش آئی اور نہ ہی اس کے پیش کرنے میں کسی قسم کا الجھاؤ پیدا ہوا۔ اُن کے اُن چند الفاظ کو سامنے لایئے جو انہوں نے (۸، مارچ ۱۹۴۴ء کو) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اپنی ایک تقریر کے دوران میں کہے تھے — یعنی

> پاکستان اُس دن وجود میں آگیا تھا، جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے، جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔

اور سوچیئے کہ دو قومی نظریہ کے متعلق ان کی نگاہ کتنی گہرائیوں تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس تقریر کے قریب دو ہفتہ بعد، انہوں نے (۲۱ مارچ ۱۹۴۴ء کو) پنجاب سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

> میں نہیں سمجھتا کہ کوئی دیانتدار آدمی اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ مسلمان بجائے خویش

ہندوؤں سے الگ مستقل قوم ہیں۔

انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا۔

ہم دونوں فرقوں میں صرف مذہب کا فرق نہیں، ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین، ہمیں ایک ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

(ایڈورڈس کالج، پشاور کی تقریر، ۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء)

جداگانہ قومیت کا یہی وہ تصور تھا جس کی مخالفت ہندوؤں کی طرف سے اس شدّومد کے ساتھ ہوئی تھی۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے، آل انڈیا نیشنل کنونیشن کے خطبۂ صدارت میں (مارچ ۱۹۳۷ء میں) کہا تھا کہ

ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو، مسلمان کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں، گویا دو ملکوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں۔

انہوں نے اپنی سوانح عمری میں لکھا تھا۔

مسلم قومیت کا تخیل صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پروازِ خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے۔

گاندھی کی طرف سے مخالفت

جب قائدِ اعظمؒ نے اس تصورِ قومیت پر بار بار زور دیا تو مسٹر گاندھی نے انہیں (مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۴ء کو) ایک خط میں لکھا۔

میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کریں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان، اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم ہی رہنا چاہیے خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

مسٹر گاندھی کا یہ خط، یوں سمجھئے کہ قائدِ اعظمؒ کے اس خط کے جواب میں تھا۔ جس میں انہوں نے، مسٹر گاندھی کو لکھا تھا کہ

اس باب میں مجھے نہ کسی قسم کا دھوکا ہے، نہ شک و شبہ کہ نہ ہندوستان میں ایک قوم بستی ہے اور نہ ہی یہ ملک ایک ہے۔ یہ برِّصغیر مختلف اقوام کا مجموعہ ہے، جن میں ہندو اور مسلمان دو بڑی بڑی

قومیں ہیں۔ آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے، لیکن آپ سے جب یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کون سی قوتِ محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے؟ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست، یا عمرانی اصلاح ہے، تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے...... لہٰذا مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے نہیں ہیں۔ آج انسانی سعی و کاوش کا دائرہ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت بن چکا ہے۔ آپ تمدنی، معاشی، سیاسی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے، جس مذہب کو نوعِ انسانی کے معاملات سے واسطہ نہیں، میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں محض غوغا آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔

(جناح کا خط بنام گاندھی، جنوری ۱۹۴۰ء)

مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۱۹۴۰ء تحریکِ پاکستان کی تاریخ میں نشانِ منزل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں پاکستان کا ریزولیوشن پاس ہوا تھا۔ اس اجلاس کے خطبۂ صدارت میں قائدِاعظمؒ نے فرمایا تھا۔

میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں "مذہب" نہیں، بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں۔ اور اس بنا پر متحدہ قومیت کا تخیل ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے! ہندو اور مسلمان مذہب کے ہر معاملہ میں دو جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں، جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر ہیں۔ دو ایسی قوموں کو ایک نظامِ مملکت میں یکجا کر دینا باہمی مناقشت کو بڑھا دے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا جو اس ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا گیا ہو۔

اس کے ایک سال بعد، انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاسِ مدراس کے خطبۂ صدارت میں اپنے اس دعویٰ کا اعادہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ انہیں کسی دوسری قوم میں جذب کرنے یا ان کے نظریات اور ملی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش بھی کی جائے گی، اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ حکومت کو قائم کر کے رہیں گے۔

قائداعظمؒ نے اس دعویٰ کو اس شدومد سے دہرایا کہ ان کے مخالفین تک کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں، چنانچہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ایک ممتاز رکن مسٹر این۔ سی۔ دت، نے اپنے ابنائے قوم کے نام ایک کھلی چٹھی میں جو اخبار مدینہ، بجنور کی یکم فروری ۱۹۴۰ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی، لکھا تھا۔

ہندوؤں کا اعتراف

ان حالات میں، میرا خیال ہے کہ ہندو مسلم قضیہ کا حل یہی ہو گا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کو دو قومیں سمجھ لیا جائے اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے متعلق ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا جائے۔ مسٹر جناح نے حال ہی میں گاندھی جی کو جواب دیتے ہوئے متحدہ قومیت کے تصور کو سراب کے لفظ سے تعبیر کر کے اس خیال کا اظہار کیا ہے یہ میرے خیال میں، اب نہیں تو کل حقیقت ہو کر رہے گا ...... میرا خیال ہے کہ اب ہمیں پاکستان کے خیال سے ڈرنا نہیں چاہیئے، البتہ اس میں مناسب ترمیم واصلاح کر کے، اسے اپنے حسب حال بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

اور اس حقیقت کو، بالآخر، ہندو اور انگریز دونوں کو تسلیم کرنا پڑا اور دو قومی نظریہ کی بنا پر پاکستان وجود میں آگیا اس موضوع پر قائداعظمؒ کی تقاریر اور بیانات سے اور بھی بہت کچھ پیش کیا جا سکتا ہے، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ انہی اقتباسات سے واضح ہو گیا ہو گا کہ دو قومی نظریہ کے متعلق ان کے خیالات اس قدر صاف اور واضح تھے کہ اس باب میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ لیکن ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ تشکیل پاکستان کے بعد، اس مملکت کی اس اصل و بنیاد کو اس طرح نظرانداز کیا گیا ہے گویا یہ ریلوے کا ٹکٹ تھا، جسے سفر کے خاتمہ پر ٹکٹ کلکٹر کے حوالے کر دیا گیا ہو کہ جس مقصد کے لئے وہ ٹکٹ خرید اگیا تھا، وہ حاصل ہو گیا اور اس کے بعد اس کی کوئی حیثیت اور ضرورت باقی نہیں رہی۔ پھر اس باب میں بھی، قوم کی دو رخی بڑی تعجب انگیز ہے۔ جب یہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے دو بازوؤں کا ذکر کرتے ہیں تو بڑے زور و شور

سے کہتے ہیں کہ دیکھئے! اس قدر بُعدِ مسافت کے باوجود اسلام ہی وہ رشتہ ہے جس نے ان علاقوں کے مسلمانوں کو ایک قوم کے رشتہ میں منسلک کر رکھا ہے۔ اگر مذہب کا رشتہ درمیان میں نہ رہے تو ان میں کوئی وجہِ جامعیت باقی نہیں رہتی۔ ایک طرف یہ کہا جاتا ہے اور دوسری طرف، پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں

قائدِ اعظم کی اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر

کو ملا کر ایک قوم بھی قرار دیا جاتا ہے۔ اور ستم بالائے ستم کہ اس باب میں سہارا لیا جاتا ہے خود قائدِ اعظمؒ ہی کی ایک تقریر کا جو انہوں نے پاکستان کی پہلی مجلسِ آئین ساز سے خطاب کرتے ہوئے ۱۱/ اگست ۱۹۴۷ء کو ارشاد فرمائی تھی آیئے ہم ذرا اس تقریر کا بھی جائزہ لیتے چلیں۔ انہوں نے مملکتِ پاکستان کے باشندوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔

> تم آزاد ہو۔ تمہیں اس امر کی کامل آزادی ہے کہ تم اپنے مندروں میں جاؤ یا مسجدوں میں، یا مملکتِ پاکستان میں کسی اور پرستش گاہ میں۔ تمہاری ذات یا مشرب کچھ بھی ہو، امورِ مملکت کو اس سے کچھ واسطہ نہیں ہو گا۔۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنے سامنے یہ نصب العین رکھنا چاہیئے کہ ایک وقت کے بعد نہ ہندو، ہندو رہے گا، نہ مسلمان مسلمان ـــــ مذہبی نقطۂ نگاہ سے نہیں کیونکہ وہ تو ہر فرد کے ذاتی عقیدہ کا سوال ہے ـــــ ایسا پاکستان کے شہری ہونے کی حیثیت سے سیاسی نقطۂ نگاہ سے ہو گا۔

قائدِ اعظمؒ کے ان الفاظ کو وحیٔ خداوندی کی طرح پیش کر کے کہا جاتا ہے کہ دیکھئے، اسلام میں قومیت کا معیار ایمان کا اشتراک نہیں بلکہ وطن کا اشتراک ہے اس لئے دو قومی نظریہ کی کوئی حقیقت نہیں۔ بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر کہا جاتا ہے کہ مذہب کو سیاست سے کوئی واسطہ نہیں، یعنی قائدِ اعظمؒ کو سند قرار دے کر، ان دونوں ستونوں کو گرا دیا جاتا ہے، جن پر مملکتِ پاکستان کی عمارت استوار ہوئی ہے۔

آیئے ذرا دیکھیں کہ اس سے صورتِ حال کیا سامنے آتی ہے۔

(۱) اگر مندرجہ بالا الفاظ کسی ایسے شخص کی زبان سے نکلیں جس نے نظریۂ قومیّت کے متعلق اس سے پہلے کچھ نہ کہا ہو یا وہ متحدہ قومیّت کا قائل رہا ہو تو ان الفاظ سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ کہنے والے کا مسلک یہ ہے کہ مذہب کو سیاست سے کوئی واسطہ نہیں اور قومیّت کا معیار مذہب نہیں، وطن ہے۔ لیکن جب اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ الفاظ اُس شخص کی زبان سے نکلے ہیں جو دس برس تک

انہی دو بنیادوں پر تمام دنیا کے خلاف نبرد آزما رہا تھا تو ان سے اس قسم کے نتائج مستنبط کرنے کے لئے جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیئے، ذرا تأمّل برتنا چاہیئے۔

(۲) ہم نے بعض لوگوں کو یہاں تک کہتے بھی سُنا ہے کہ بے شک قائدِ اعظمؒ دس برس تک یہ دعویٰ کرتے رہے، لیکن یہ درحقیقت ایک وکیلانہ حربہ تھا جسے انہوں نے اپنا مقدّمہ جیتنے کے لئے اختیار کیا تھا، جب کیس کا فیصلہ ان کے حق میں ہوگیا تو اس حربہ کی ضرورت نہ رہی۔

ایسا کہنے والے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ یہ کچھ ہم کس شخص کے متعلق کہہ رہے ہیں۔ ہم بربنائے عقیدت نہیں کہتے بلکہ یہ حقیقت ہے کہ جو شخص قائدِ اعظمؒ کے کیریکٹر کے متعلق کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے، وہ ان کے خلاف اس قسم کا الزام عائد کرنے کی کبھی جرأت نہیں کرے گا۔ حق گوئی و بے باکی، ان کے کردار کی ایسی خصوصیت تھی، جس کا اعتراف ان کے دشمنوں تک کو تھا۔ لنڈن ٹائمز، ان کے دوستوں کا نہیں، بہرحال دشمن قوم کا ترجمان تھا۔ اس نے قائدِ اعظمؒ کی وفات پر لکھا تھا۔

> قائدِ اعظمؒ نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ ذہنی لچک نہیں تھی جو انگریز کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصّہ ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت، واضح اور شفّاف ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہیں تھی۔

لہٰذا، یہ کہنا کہ قائدِ اعظمؒ دس سال تک ایسے نظریات کو (بطور حیلہ سازی) پیش کرتے رہے، جن پر انہیں ایمان نہیں تھا، حقیقت کو جھٹلانا ہے۔ ان کا کردار اس سے بہت بلند تھا جس شخص نے اپنے عمر بھر کے نیشنلزم کے عقیدہ کو جھٹک کر الگ کر دیا اور اس میں نہ مداہنت کو بار پانے دیا نہ کسی مصلحت کو، وہ اس قسم کی منافقانہ روش کبھی اختیار نہیں کر سکتا۔

(۳) ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ قائدِ اعظمؒ نے جب مجلسِ آئین ساز سے خطاب کیا تھا تو ملک کے حالات کیا تھے؟

تقسیمِ ہند کے ساتھ ہی ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہوگیا۔ اس لئے مسلمانوں کے دل میں خوف اور دہشت کے ایسے جذبات ابھرے کہ انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ، پاکستان میں آکر

اس کا پس منظر

پناہ لے لیں۔ لیکن ان وحشی درندوں نے ان نہتے قافلوں کو بھی نہ چھوڑا۔ راستہ بھر قتل و غارت گری کی وارداتیں ہوتی رہیں۔ ان کی نوجوان لڑکیوں کو ہزاروں کی تعداد میں چھین جھپٹ کر لے گئے۔ ان کے معصوم بچّوں کو نیزوں کی انیوں پر اچھالا گیا۔ اور تو اور، دلّی سے جو گاڑیاں خود حکومت کے عملہ کو لے کر روانہ ہوئیں یہاں پہنچنے پر ان میں سے زندہ انسانوں کے بجائے لاشوں کے ٹکڑے برآمد ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ان وحشیانہ مظالم کا ردِعمل پاکستان کے بعض حصّوں میں بھی ہوا۔ اور اس سے یہاں کے غیر مسلم باشندوں کے دل میں خوف و ہراس، بے اعتمادی اور بے یقینی کے وساوس پیدا ہوئے۔ آپ سوچئے کہ ایک مملکت، جس کی عمر ابھی ایک دن کی بھی نہ ہوئی ہو، اس قسم کے لرزہ انگیز حالات سے دوچار ہو پھر اس کی کیفیت یہ ہو کہ نہ اس کے پاس ابھی اپنی فوج ہو، نہ اسلحہ، نہ سامان ہو نہ پیسہ، تو اس کے سربراہ کے دل پر اس سے کیا نہ گزرتی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی اسے بھی ذہن میں رکھیئے کہ پاکستان کے اندر ایسے عناصر موجود تھے جو ایک طرف یہاں کے غیر مسلموں کے دل میں خوف و ہراس پیدا کر رہے تھے، اور دوسری طرف انہیں اشتعال بھی دلا رہے تھے۔ ہندوستان کے اخبارات یہاں کی غیر مسلم اقلیتوں کے خلاف مظالم کی فرضی داستانیں بیان کر کے وہاں کے مسلمانوں سے انتقام کی آگ کو تیز سے تیز تر کرتے چلے جا رہے تھے اس کے لئے نہایت ضروری تھا کہ یہاں کی غیر مسلم اقلیتوں کو پورا پورا یقین دلایا جائے کہ وہ یہاں ہر طرح سے محفوظ رہیں گی۔ اور مذہب کی بنا پر ان سے کوئی ناروا سلوک نہیں کیا جائے گا یہ تھے وہ حالات جن میں قائدِ اعظمؒ کو پاکستان میں اپنی پہلی تقریر کرنی پڑی۔ قائدِ اعظمؒ بڑی متوازن شخصیت کے حامل تھے۔ وہ کبھی جذبات سے مغلوب نہیں ہوا کرتے تھے لیکن جن حالات سے اُس وقت ملک دوچار تھا اور اتنی عظیم ذمّہ داریوں کا جو بوجھ اس مملکت پر آ پڑا تھا، اس کے سربراہ کا ان سے متاثر ہو جانا کوئی غیر فطری امر نہیں تھا۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، وہ غیر مسلموں کو یقین دلانا چاہتے تھے کہ انہیں یہاں اسی قسم کی حفاظت ملے گی جیسی مسلمانوں کو۔ انہوں نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا تھا اس سے ان کا مقصد یہی تھا لیکن شدّتِ جذبات میں وہ الفاظ کے انتخاب میں توازن نہ رکھ سکے۔ ان الفاظ سے یہ مستنبط کرنا کہ جس نظریہ کی رُو سے انہوں نے دس سال تک ہندو اور انگریز سے جنگ کر کے پاکستان حاصل کیا تھا، وہ اس نظریہ کو پہلے ہی دن اس طرح نذرِ آتش کر دیں گے، بڑی زیادتی ہے۔ کوئی باہوش انسان اسے باور نہیں کرے گا۔

ہم نے جو اوپر کہا ہے کہ قائدِاعظمؒ کی اس تقریر کا مقصد غیر مسلم اقلیتوں کو یقین دلانا تھا کہ ان سے رواداری اور حسنِ سلوک کا برتاؤ کیا جائے گا تو یہ ہماری اپنی تعبیر نہیں۔ اس کی تشریح خود قائدِاعظمؒ نے تین ہی دن بعد

۱۴۔ اگست کی تقریر

اپنی دوسری تقریر میں کر دی۔ مذکورہ بالا تقریر ۱۱۔ اگست کو کی گئی تھی اور ۱۴۔ اگست کو انہوں نے پاکستان کی مجلسِ آئین ساز کا افتتاح کرتے ہوئے اپنے خطاب میں اس کی وضاحت اِن الفاظ میں کر دی۔

> شہنشاہِ اکبر نے غیر مسلموں کے ساتھ جس مذہبی رواداری اور حسنِ سلوک کا ثبوت دیا وہ ہمارے ہاں کوئی بعد کا وضع کردہ مسلک نہیں تھا۔ وہ مسلک ہمارے ہاں تیرہ سو سال پہلے سے چلا آرہا تھا۔ جب حضورؐ نبی اکرم نے یہودیوں اور عیسائیوں پر فتح حاصل کر لینے کے بعد ان سے لفظاً ہی نہیں، بلکہ عملاً انتہائی رواداری برتی۔ اور ان کے مذہب اور عقائد کو عزّت اور احترام کی نظروں سے دیکھا۔ مسلمانوں کی تمام تاریخ اس کی شاہد ہے کہ انہوں نے جہاں جہاں بھی حکومت کی (غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور حسنِ سلوک سے) انہی عظیم انسانیت ساز اصولوں پر عمل کیا۔ اور انہی پر ہمیں بھی عمل کرنا چاہیئے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قائدِاعظمؒ نے خود ہی واضح کر دیا کہ غیر مسلم اقلیتوں کی یہاں پوزیشن کیا ہو گی۔

اس کے بعد قائدِاعظمؒ قریب ایک سال تک زندہ رہے اور اس دوران میں انہوں نے بہت سے مواقع پر تقاریر کیں اور بیانات دیئے، جہاں جہاں بھی موقع ملا، انہوں نے غیر مسلموں کو ہمیشہ اقلیت

اقلیتوں کے ساتھ حسنِ سلوک

کہہ کر پکارا اور انہیں یقین دلایا کہ یہاں اُن سے رواداری کا برتاؤ کیا جائے گا مثلاً انہوں نے ۱۱ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو خالق دینا ہال کراچی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

> ایک اور سوال جو میرے دل میں بار بار ابھرتا ہے، اقلیتوں کا مسئلہ ہے میں نے خلوت اور جلوت میں بار بار اس امر پر زور دیا ہے کہ ہمیں اقلیتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا ثبوت دینا چاہیئے۔ تقسیمِ ہند کے وقت، اس امر کی ضمانت دی گئی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ لہٰذا، جب تک اقلیتیں مملکت کی وفادار رہیں گی انہیں یہاں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہو گا۔

پھر انہوں نے ۳۰ اکتوبر کو یونیورسٹی سٹیڈیم لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

اسلام ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں اور اقلیتوں کی پوری پوری حفاظت کرے خواہ ان کا عقیدہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے اس کے باوجود ہمیں یہاں کی اقلیتوں کا پورا پورا تحفظ کرنا چاہیئے اور ان کے دل میں اس حفاظت کی طرف سے کامل اعتماد پیدا کرنا چاہیے۔ ہمارا یہی رویّہ ہمارے لئے باعثِ عزّت اور وجۂ افتخار ہونا چاہیئے۔

۲ فروری ۱۹۴۸ء کو سندھ کے پارسیوں نے قائداعظمؒ کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ "حکومت اس امر کا خاص اہتمام کر رہی ہے کہ اقلیتوں کے دل سے خوف اور بداعتمادی کے تمام شبہات کا ازالہ کر دے"۔ انہوں نے ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں کہا۔

اسلام ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم دوسرے اہلِ مذاہب کے ساتھ رواداری کا ثبوت دیں، جو لوگ بھی یہاں برضا و رغبت ہم سے تعاون کریں گے، ہم ان کے اس تعاون کا گرمجوشی سے استقبال کریں گے۔

انہوں نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ

ہر غیر جانبدار مبصر اس سے اتفاق کرے گا کہ ہم نے اپنی انتہائی مشکلات کے اس زمانے میں، اپنی اقلیتوں کی جس قدر حفاظت کی ہے اور ان کا جتنا خیال رکھا ہے، ہندوستان میں اس کی کہیں مثال نہیں مل سکتی۔ میں اس موقع پر ایک بار پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستان کی اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کریں گے، پاکستان میں ان کی جان اور مال کی حفاظت ہندوستانی اقلیتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہو رہی ہے۔ پاکستان کے ہر شہری کی جان و مال کی حفاظت ہمارا ذمّہ ہے، اور ہم اس ذمّہ داری کو مذہب و ملّت کی تمیز سے بلند ہو کر پورا کرتے رہیں گے۔

انہوں نے ۲۶ مارچ کو چٹا گانگ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ "ایک جانبدار مبصر اس سے اتفاق کرے گا کہ ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان نے اپنی اقلیتوں کے ساتھ کہیں بہتر سلوک کیا ہے۔ وہ یہاں ہمارے درمیان نہ صرف امن و اطمینان سے رہ رہی ہیں بلکہ انہیں اپنے قدم جمانے کی بھی پوری

پوری آزادی حاصل ہے۔"

۱۳؍ جون ۱۹۴۸ء کو کوئٹہ کے پارسیوں کے ایک وفد نے قائدِ اعظمؒ کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا تو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ:

آپ کو معلوم ہے کہ میری اور میری حکومت کی یہ پالیسی ہے کہ پاکستان میں بلاتمیزِ مذہب وملّت اور بلالحاظِ رنگ ونسل ہر شخص کی جان، مال اور عزّت کی پوری پوری حفاظت کی جائے گی اقلیتوں کو اس باب میں بالکل مطمئن رہنا چاہیئے۔

آپ نے دیکھا کہ قائدِ اعظمؒ اس تمام دوران میں پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو اقلیّت کہہ کر پکارتے رہے اور انہیں ان کی جان مال اور عزّت آبرو کی حفاظت کا یقین دلاتے رہے۔ انہوں نے کہیں ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ یہاں مسلم اور غیر مسلم دونوں مل کر ایک قوم بن چکے ہیں، اس لئے اب ان میں کسی قسم کی تفریق وتمیز باقی نہیں رہی۔ اس کے برعکس وہ اس حقیقت کا اعادہ کرتے رہے کہ مسلمان اپنے مخصوص نظریۂ زندگی کی بنا پر ایک الگ قوم بنتے ہیں۔ انہوں نے ۱۹؍ فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے اُس براڈ کاسٹ میں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے کہا کہ

الگ قومیّت

یہاں کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمدؐ رسول اللہ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اُس اسلامی برادری کے افراد ہیں، جس میں حقوق، شرف واحترام اور تکریم ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں، بنا بریں ہم میں وحدت اور اخوّت کا بڑا گہرا اور خاص جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم وروایات، ہم اپنے نظریاتِ زندگی، نقطۂ نگاہ اور احساس دروں کے مالک ہیں جو قومیّت کی تشکیل کا مدار بنتا ہے۔

انہوں نے ۱۴؍ اگست ۱۹۴۸ء کو مملکتِ پاکستان کی پہلی سالگرہ کے موقع پر اپنے اُس پیغام میں جو ان کی زندگی کا آخری پیغام تھا، پاکستان کو "دنیا کی سب سے بڑی مسلم سٹیٹ" کہہ کر پکارا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ انہوں نے اسے "مسلم سٹیٹ" کہا ہو، اس سے پہلے بھی انہوں نے اسے، ہر موقع پر مسلم سٹیٹ ہی قرار دیا تھا۔

ہم پوچھتے ہیں دنیا بھر کے ماہرینِ سیاست سے کہ جو مملکت محض وطنیّت کی بنیادوں پر استوار ہوئی ہو اسے کبھی بھی، مسلم سٹیٹ، ہندو سٹیٹ یا عیسائی سٹیٹ کہا جا سکتا ہے؟ یاد رہے کہ وطنیّت کی

بنیادوں پر مختلف آئیڈیالوجی رکھنے والوں کے امتزاج سے جو قوم متشکّل ہوئی ہو، اس کی مملکت ہمیشہ سیکولر ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کی زندگی کے آخری ایام میں متحدہ قومیت کے مؤید د مولانا حسین احمد مدنی مرحوم نے کہا تھا کہ "قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ اس سے حضرتِ علامہؒ کے ساتھ ان کی بحث چل نکلی۔ اس بحث کے دوران علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ:۔

اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ، اوّل تو لادینی ہوگا اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پرواہی۔

لہٰذا، قائدِ اعظمؒ کا مملکتِ پاکستان کو مسلم سٹیٹ کہنا، خود اس امر کی شہادت ہے کہ وہ متحدہ قومیت کے قائل نہیں تھے۔

آخر میں؛ آیئے ہم دیکھیں کہ قائدِ اعظمؒ کی گیارہ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کا مفہوم خود غیر مسلم اقلیتیں کیا سمجھتی تھیں۔ کیا انہوں نے یہ سمجھا تھا کہ اس سے قائدِ اعظمؒ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی متحدہ قومیت کا اعلان کر رہے ہیں، یا یہ کہ اس سے مقصود غیر مسلم اقلیتوں کا تحفظ ہے؟ مسٹر جوشوا فضل الدین ایک

مسٹر جوشوا فضل دین کا اعتراف

مشہور مسیحی لیڈر ہیں جب صدر ایوب نے لاء کمیشن کا تقرر کیا تو مسٹر جوشوا نے اس سوال پر بحث کی تھی کہ مجوزہ آئین کی بنیاد کیا ہونی چاہیے۔ اس سلسلہ میں؛ انہوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا (RATIONALE OF PAKISTAN CONSTITUTION) ۔۔۔ (یہ پمفلٹ ہمارے سامنے ہے) اس میں انہوں نے پہلے یہ واضح کیا تھا کہ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان کی رُو سے مملکتِ پاکستان کے دو بنیادی ستون تھے یعنی

(۱) مملکتِ پاکستان کی بنیاد مذہب پر ہوگی، یہی وہ قدرِ مشترک ہے، جو مشرقی اور مغربی بازوؤں میں وحدت پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہے اور

(۲) اقلیتوں کے لئے تحفظات۔

انہوں نے کہا تھا کہ مجوزہ آئین کو یہ دونوں شرائط پوری کرنی چاہئیں۔ اس کے بعد انہوں نے قائدِ اعظمؒ

کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء اور اس کے ساتھ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کے اقتباسات دے کر یہ کہا تھا کہ ان کی تعبیر میں انتہا پسندانہ رویہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قائدِ اعظمؒ کا مقصد یہ تھا کہ یہاں نہ ہندو، ہندو رہے، نہ مسلمان، مسلمان بلکہ دونوں کے امتزاج سے ایک متحدہ قوم تشکیل ہو جس کا لازمی نتیجہ سیکولر اندازِ حکومت ہو جائے، وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ مسٹر جوشوا نے ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا ۔

یہ کہنا کہ تخلیقِ پاکستان کے بعد قائدِ اعظمؒ نے ـــــ جو خود اس پاکستان کا خالق تھا ـــــ اپنی پہلی ہی تقریر میں کوئی ایسی بات کہہ دی ہے، جس سے اس بات کا دُور کا بھی امکان ہے کہ اُس سے پاکستان کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی، بالکل پاگل پن ہے۔ قائدِ اعظمؒ نے اتنا ہی کہا تھا کہ پاکستان میں بلالحاظِ مذہب و ملت ہر ایک کو مساوی حقوقِ شہریت حاصل ہوں گے۔

اس کے بعد انہوں نے بڑے پتے کی بات کہی تھی اور وہ یہ کہ چونکہ پاکستان کو لامحالہ ایک مذہبی مملکت بننا ہے اس لئے اس امر کا فیصلہ کہ غیر مسلم اقلیتوں کو کس قسم کے حقوق اور تحفظات حاصل ہوں گے اسلامی فقہ کی رُو سے ہی ہو سکے گا۔ اور اس کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں اُمید ہے کہ اس ضمن میں اسلامی فقہ کی تعبیر مذہبی تعصب اور جنون کی رُو سے نہیں کی جائے گی، عقل و فکر کی رُو سے کی جائے گی۔

حیرت ہے کہ قائدِ اعظمؒ کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کا صحیح مفہوم غیر مسلموں نے تو سمجھ لیا لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آئی تو ان مسلمانوں کی جو ہندوستان میں بھی متحدہ قومیت کے علمبردار تھے، اور جو اب چپکے چپکے یہاں بھی ان جراثیم کو پھیلا رہے ہیں۔ ہم علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ایک بار پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ اگر پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک قوم کے افراد تسلیم کر لیا گیا تو یہ مملکت اسلامی نہیں کہلا سکے گی خواہ اس کے ساتھ "اسلامک" کا لفظ ہزار بار بھی چسپاں کیوں نہ کر دیا جائے۔ اسلامی مملکت صرف اس قوم کے ہاتھوں وجود پذیر ہو سکتی ہے جو اسلامک آئیڈیالوجی (یعنی قرآن) پر ایمان رکھے۔ اگر کوئی شخص اس کے خلاف کچھ کہتا ہے تو اس کی بات اسلام کے بنیادی تصورِ مملکت کے خلاف ہے، خواہ ایسی بات کہنے والا کتنی ہی بڑی شخصیت کا مالک کیوں نہ ہو۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

۱۰ اپریل ۱۹۷۰ء کی شام، بزمِ طلوعِ اسلام لائلپور کے زیرِ اہتمام میونسپل ہال لائلپور کے ایک جلسۂ عام کی ایک برجستہ تقریر

صدرِ محترم، میری عزیز بہنو اور بھائیو! سلام و رحمت۔

آپ ہندی مسلمانوں کی سیاسی زندگی پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لیجئے۔ اگر آپ اس مطالعہ کا آغاز سنہ ۱۳-۱۹۱۲ء کی جنگِ بلقان سے کر کے اس کے ساتھ ساتھ (مثلاً) سنہ ۳۶-۱۹۳۵ء تک بھی چلتے آئیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ ایک قوم نہیں تھی، شعلۂ جوّالہ تھی جو ذرا ذرا سے اشتعال پر یوں بھڑک اٹھتی تھی کہ سارا ماحول اس کی لپیٹ میں آجاتا تھا لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد، اس کی شعلہ فشانیاں ختم ہو جاتی تھیں اور دیکھنے والی آنکھیں دیکھتی تھیں کہ اس کی ان شرر باریوں سے ماحول میں تو کم تبدیلی آئی ہے لیکن یہ خود راکھ کا ڈھیر بن گئی ہے لیکن کچھ عرصہ کے بعد، یہی راکھ کا ڈھیر، ایک جھکڑ بن کر اٹھتا اور ساری فضا میں طوفان برپا کر دیتا۔ اس طوفانِ بلا کی تیزیوں اور برق رفتاریوں سے یوں نظر آتا جیسے وہ اس جہانِ ناسازگار کے محکم ترین حصاروں کی بنیادوں تک کو ہلا کر انہیں خس و خاشاک کی طرح نذرِ باد کر دیں گی۔ لیکن اس کے بعد دکھائی یہ دیتا کہ یہ طوفان

شورش انگیزیاں

انگیزیاں بس ایک بگولے کا رقص تھا جو اپنے ہی گرد گھوما اور خود ہی تھک کر خاموش ہو گیا لیکن اس کے بعد اس کی خاموشی، وہ سکوت ثابت ہوتی جو سمندر میں تلاطم خیزیوں کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اس کے بحرِ موّاج سے بلا انگیز موجیں اٹھتیں اور یوں نظر آتا گویا اس جہان پر

کی موت قریب آگئی ہے اور اس سیلِ بے پناہ کے سامنے اس کی حیثیت حباب سے زیادہ کچھ نہیں ہو گی لیکن تھوڑی دیر بعد یہ آسماں بوس موجیں باہمد گر ٹکرا کر غرقِ دریا ہو جاتیں اور سطح آب پر ان کا نقش تک نظر نہ آتا۔ اس قوم کی یہ سیمابی کیفیت اس لئے تھی کہ اس کی رگوں میں خون نہیں جذبات کی بجلیاں دوڑ رہی تھیں۔ لیکن اس کے سامنے نہ کوئی واضح نصب العین تھا، نہ متعین مطمحِ نگاہ۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ان کے پاؤں چلتے تھے لیکن منزل قریب نہیں آتی تھی (اس لئے کہ ان کے سامنے منزل تھی ہی نہیں) ان کے ہاتھ اٹھتے تھے لیکن کسی محمل تک ان کی رسائی نہیں ہوتی تھی (کہ محمل کا انہوں نے تعین ہی نہیں کیا تھا)۔ اقبالؒ نے ان کی ان بے منزل صحرا نوردیوں اور بلامقصد دشت پیمائیوں کا نقشہ ان چار الفاظ میں کھینچ کر رکھ دیا تھا، جب کہا تھا کہ — دِلے دارند محبوبے ندارند — اس احساس کے ماتحت اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں، الٰہ آباد کے مقام پر، اپنے عدیم النظیر خطبہ میں، پہلی بار اس آہوئے رم خوردہ کے لئے منزل کا تعین کیا۔ لیکن قوم جذبات کے ہجوم میں اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ کسی نے اس رازدانِ راہِ حیات کی اس پکار کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور اسے ایک شاعر کا تخیل یا دیوانے کا خواب کہہ کر، حوالۂ طنز و مزاح کر دیا اور خود پھر انہی ہنگامہ خیزیوں اور شورانگیزیوں میں مصروف ہو گئی۔

علامہ اقبالؒ کا پیغام

۱۹۳۲ء میں جب علامہ اقبالؒ کو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس (منعقدہ لاہور) کا صدر منتخب کیا گیا تو انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت کے آغاز میں، قوم کی اس ہنگامہ خیز جذباتیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ملک کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ ایک طرف سے ہمارے کان میں یہ آواز آتی ہے کہ:۔

> اگر ان حالات میں، ہمارے لیڈروں نے قوم کے لئے کوئی متعین راہِ عمل تجویز نہ کی تو اس وقت دوسروں کی نقالی سے جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ رنگ لا کر رہے گا جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ قوم کا نوجوان طبقہ حوادث کے سیلِ بے پناہ میں بلاسوچے سمجھے کود جائیگا۔

اور دوسری طرف سے ایک نوجوان، انتہائے جوش و خروش میں یہ پکارتا ہوا آگے بڑھتا ہے کہ:۔

> عمل کے لئے کسی متعین راستے اور سوچے سمجھے منصوبے کی ضرورت نہیں۔ یہ سبق درسگاہوں کی منطق میں نہیں پڑھایا جا سکتا۔ یہ جذبہ جب دل کی گہرائیوں سے ابھر کر فضا میں پھیل جاتا ہے تو اپنی منطق آپ مرتب کر لیتا ہے۔

اس کے بعد حضرت علامہ نے فرمایا کہ:۔

ان شورانگیزیوں میں آپ نے اس اجتماع کی صدارت کے لئے ایک مفکر کا انتخاب کیا ہے میرا خیال ہے کہ آپ نے ایسا اس لئے کیا ہے کہ آپ کو اس امر کا احساس ہوا ہے کہ ایسے وقت میں قوم کو ایک مفکر کی ضرورت ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ جس قوم میں فکر کی صلاحیت نہیں رہتی وہ تباہ ہو جاتی ہے۔

یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے علامہ اقبالؒ نے اپنے مخصوص تیکھے ہوئے انداز میں چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ قومیں نہ افراد کی قلت سے تباہ ہوتی ہیں، نہ ساز و سامان کی کمی سے۔ قومیں اس وقت تباہ ہوتی ہیں جب ان کی قوتِ فکر پر جذبات غالب آجاتے ہیں اور وہ ایک متعین مقصد کے لئے ایک سوچے سمجھے لائحہ عمل کے مطابق، ایک طے شدہ منزل کی طرف گامزن ہونے کے بجائے، ہنگامہ خیزیوں میں مصروف ہو جاتی ہیں اور اپنے وقت، دولت اور توانائی کے اس قدر بے محابا ضیاع کا نام عمل رکھ کر اس فریب میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ ہم بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے رہی ہیں۔

عزیزانِ گرامی قدر! علامہ اقبالؒ نے جن حالات میں اس عظیم حقیقت کو قوم کے سامنے واشگاف کیا تھا آج ہماری فضا اس سے کہیں زیادہ آتش خیز اور شعلہ بار ہو رہی ہے۔ اس وقت قوم کے جذبات کو اس حد تک مشتعل کر دیا گیا ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کے لئے بھی آمادہ نہیں جو اس سے یہ کہے کہ ذرا رک کر میری بات سن لو لیکن عزیزانِ من! میں قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں اور قرآن مجھ سے پکار پکار کر یہ کہتا ہے کہ ان حالات میں قرآن کی طرف دعوت دینے والوں پر یہ فریضہ اور بھی زیادہ شدت سے عاید ہو جاتا ہے کہ وہ اس فکر کو زیادہ بلند آواز سے عام کریں۔ ایسے ہی تھے وہ حالات جن میں بلند ترین فکر کی طرف، دعوت دینے والی کائنات کی بلند ترین ہستی ــــ حضور خاتم النبیینؐ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا تھا کہ (قُلْ)، ان سے کہہ دو کہ ـــ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ؟ ـــ میں تمہیں کوئی لمبی چوڑی نصیحتیں نہیں کرنا چاہتا۔ تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں، فقط ایک بات ــــ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى۔ وہ بات ایسی نہیں کہ تم اسے یونہی چلتے چلتے سن لو۔ وہ بڑی اہم بات ہے اسے کھڑے ہو کر سننا ہوگا، خواہ تم میں سے ایک ایک، دو دو ہی کھڑے کیوں نہ ہو جائیں۔ بس کھڑے ہو کر میری بات گوش ہوش سے سن لو ـــ اور آپ کو معلوم ہے عزیزانِ من! کہ وہ ایک بات کیا تھی جسے اس قدر سکون اور سکوت کے ساتھ سننے کی دعوت دی گئی اور تاکید کی گئی

تَتَفَكَّرُوْا

تھی۔ سنیئے اور نہایت غور سے سنیئے۔ وہ بات یہ تھی کہ۔ تَتَفَكَّرُوا (۳۴/۴۶)۔ تم سوچا کرو، یوں ہی جذبات کی رَو میں نہ بہے چلے جایا کرو۔ سوچ سمجھ کر اپنے لئے منزل کا تعیّن کرو اور پھر نہایت غور و خوض سے اس منزل تک پہنچنے کا پروگرام مرتّب کرو اور اس کے مطابق نہایت سکون و ثبات سے قدم بڑھاتے، جانبِ منزل، رواں دواں چلتے جاؤ۔ طوبیٰ لکم و حسن مآب خوشگواریاں آگے بڑھ کر تمہارے قدم چومیں گی اور عروسِ منزل، آغوش وا کئے، تمہارے استقبال کے لئے دیدہ و دل فرش راہ کئے ہوگی۔ عزیزانِ من! میں آپ کی خدمت میں قرآن کریم کا یہی پیغام پہنچانے کے لئے حاضر ہوا ہوں کہ تَتَفَكَّرُوا۔ آپ حالات کی گرم جوشیوں اور ہنگامہ خیزیوں سے الگ ہو کر، نہایت سکون و سکوت سے سوچیں کہ ہماری منزل کیا ہے اور مقصود کیا جس کے لئے ہم اس طرح دیوانہ وار مصروفِ تگ و تاز ہیں۔ اگر آپ نے سوچنے کے لئے تھوڑا سا وقت بھی نکال لیا تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری کاوشوں کا صلہ مل گیا۔ علامہ اقبالؒ نے ہنگامہ خیزیوں کی انہی آندھیوں میں کھڑے ہو کر اپنے متعلق کہا تھا کہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ!

اس کے بعد اقبالؒ نے اس چراغ کو اُس رہبرِ فرزانہ کے ہاتھوں میں دے دیا جس کی ناخدائی میں کشتیٔ ملت، ایک حسین بط کی طرح نہایت سکوت اور اطمینان سے تیرتی ہوئی ساحلِ مراد تک جا پہنچی۔

میرا پیام

مجھے نہ اقبالؒ کا سا مفکر ہونے کا دعویٰ ہے اور نہ ہی قائدِ اعظمؒ جیسا مدبّر ہونے کا ادعا۔ لیکن قرآن کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اتنا کہنے کی جرأت ضرور کروں گا کہ جن حالات سے اس وقت قوم گزر رہی ہے ان میں

اوروں کا ہے پیام اور، میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

امید ہے آپ عشق کے اس دردمند کی صدائے دلسوز کو سکوت و سکون سے سننے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔

اس مقام پر میں اتنا اور واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرا تعلق نہ کسی مذہبی فرقہ سے ہے اور نہ ہی کسی سیاسی پارٹی سے حتیٰ کہ میں عملی سیاسیات میں بھی حصّہ نہیں لیتا۔ میں نے اپنی عمر قرآن مجید پر

غور و فکر میں بسر کی ہے۔ میں زندگی کے ہر معاملہ کا جائزہ اسی کی روشنی میں لیتا ہوں اور جو کچھ اپنی بصیرت کے مطابق صحیح سمجھتا ہوں، اُسے قوم کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔ اس لئے میں جو کچھ عرض کروں گا، اگر وہ کسی کے مسلک کے خلاف جائے تو اسے ذاتی تنقید یا پارٹی بازی کی تنقیص پر محمول نہ کیا جائے۔ قرآنی بصیرت پر مبنی بے لاگ تبصرہ سمجھا جائے۔

عزیزانِ من! آپ نے اشتہار میں لکھا دیکھا کہ آج شام میونسپل ہال میں جلسہ ہوگا، چونکہ میونسپل ہال کا مفہوم آپ کے ذہن میں متعیّن تھا اس لئے آپ میں سے ہر ایک کا قدم سیدھا اس کی طرف اٹھتا چلا آیا اور اس میں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوئی۔ لیکن اگر اعلان میں صرف اتنا ہی کہا گیا ہوتا کہ آج شام ہال میں جلسہ ہوگا تو سوچئے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔ سارے شہر میں بحث و تکرار شروع ہو جاتی کہ جلسہ کہاں ہوگا۔ کوئی کچھ کہتا اور کوئی کچھ۔ کسی کا قدم ایک طرف کو اٹھتا کسی کا دوسری طرف کو اور اس سے خود جلسہ کا بھی جو حشر ہوتا وہ ظاہر ہے۔ آپ اس مثال کو ذرا آگے بڑھائیے۔ آج پاکستان کی ہر پارٹی، ہر گروہ ہر فرد کی زبان پر ہے کہ اس مملکت کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اس لئے یہاں اسلامی نظام قائم ہوگا۔ ہر پارٹی کا دعویٰ ہے کہ وہ اسلامی نظام کے قیام کے لئے میدانِ سیاست میں اتری ہے۔ ہر ایک کے منشور میں اس کا ذکر موجود ہے ہر لیڈر کی تقریر میں اسے دہرایا جاتا ہے۔ ہر اخبار میں شہ سرخیوں کے ساتھ اسے چھاپا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ ملک کے ہر فرقہ، ہر پارٹی، ہر گروہ، ہر لیڈر بلکہ ہر فرد کا مطمحِ نگاہ ایک ہے، مقصود و مطلوب ایک ہے، منتہیٰ ایک ہے، منزل ایک ہے، یعنی اسلامی نظام کا قیام۔ اور اس کے بعد حالت یہ ہے کہ ہر فرقہ دوسرے فرقہ کے ساتھ دست و گریباں ہے۔ ہر پارٹی دوسری پارٹی کے خلاف نبرد آزما ہے۔ ہر لیڈر دوسرے لیڈر سے برسرِ پیکار ہے۔ ہر فرد دوسرے فرد سے اُلجھ رہا ہے۔ سارا ملک تشتّت و انتشار کی آماجگاہ بن رہا ہے۔ ساری قوم گویا میدانِ کارزار میں اتری ہوئی ہے۔ آپ سوچئے کہ کیا اس بات کا کبھی تصوّر تک بھی کیا جا سکتا ہے کہ کسی قوم کے سامنے نصب العین ایک ہو، مقصود و مطلوب ایک ہو اور پھر ساری قوم ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہو! ایسا کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ قوم نے سوچنا چھوڑ دیا ہے اگر قوم سوچتی تو وہ ہر دعویٰ کرنے والے سے پوچھتی کہ ہمیں

اسلامی نظام کا دعویٰ

مفہوم متعین نہیں

متعین طور پر بتایئے کہ اسلامی نظام سے آپ کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مفہوم کیا ہے۔ اس کا واضح اور متعین نقشہ کیا ہے۔ اس کے حدود کیا ہیں۔ اس کے نقوش کیا ہیں۔ اور پھر سوچئے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس کی سند کیا ہے، اس کی اتھارٹی کیا ہے۔ اس کے صحیح ہونے کی دلیل کیا ہے۔ اگر آپ ان حضرات سے یہ سوال کرتے تو یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی کہ یہ الفاظ جنہیں اس طرح اٹھتے بیٹھتے دہرایا جاتا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ (۵۳/۲۳) بس چند الفاظ ہیں جنہیں یا تو یہ اپنے آباؤاجداد سے سنتے چلے آرہے ہیں اور یا خود وضع کر لئے ہیں۔ ان کا کوئی متعین مفہوم کسی کے ذہن میں نہیں اور جو مفہوم یہ پیش کرتے ہیں وہ ایک دوسرے سے ملتا نہیں۔ اسلامی نظام تو خیر بعد کی بات ہے، آپ کو یاد

مسلمان کسے کہتے ہیں؟

ہوگا کہ ۱۹۵۳ء کے فسادات پنجاب کی تحقیقاتی کمیٹی نے (جسے عرفِ عام میں منیر کمیٹی کہا جاتا تھا) ملک بھر کے چیدہ چیدہ حضرات علماء کرام سے یہ پوچھا تھا کہ "مسلمان کسے کہتے ہیں"؟ اور اس سوال کے جو جوابات ان کی طرف سے دیئے گئے تھے، ان میں سے کسی ایک کا جواب دوسرے سے نہیں ملتا تھا۔ ان جوابات کا تجزیہ کرنے کے بعد ارکان کمیٹی نے لکھا تھا کہ:

> اس سوال کے جواب میں جو کچھ کہا گیا ہے اس پر اس سے زیادہ کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں کہ ان میں سے کسی دو عالموں کا جواب بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتا۔ اگر ہم اس سوال کا جواب اپنی طرف سے دے دیں اور وہ جواب حضرت علماء کرام کی طرف سے دیئے گئے جوابات کے خلاف ہو، تو ہمیں فوراً دائرہ اسلام سے خارج کر دیا جائے اور اگر ہم ان حضرات میں سے کسی ایک کے جواب کو صحیح تسلیم کر لیں تو ہم اس کے نزدیک تو مسلمان ضرور قرار پا جائیں لیکن اس کے علاوہ، باقی حضرات کے جوابات کی رُو سے کافر گردانے جائیں۔

آپ سوچئے کہ جب ہم متفق طور پر اتنا بھی نہیں بتا سکتے کہ "مسلمان کسے کہتے ہیں"، تو یہ کون متعین کرے گا کہ "اسلامی نظام" کیا ہے، اور اس کی سند کیا ہوگی کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ فی الواقع اسلامی نظام ہے۔ سوچئے کہ یہ بات بڑی گہری سوچ کی متقاضی ہے۔

نظریۂ پاکستان

اب ایک قدم آگے بڑھیئے۔ پہلے تو بات "اسلامی نظام" تک محدود تھی اب ہماری سیاسی لغت میں ایک اور اصطلاح کا بھی اضافہ ہوا ہے اور وہ اصطلاح ہے "نظریۂ پاکستان"۔ ملک کی ہر جماعت اور ہر پارٹی نظریہ پاکستان کی مدعی ہے۔ اور اس کا تحفظ، اپنی سیاسی جدوجہد کا مقصود بتاتی ہے۔ یہ اصطلاح بھی آجکل اس شدّومد سے دہرائی جاتی ہے کہ باید و شاید، لیکن جو پریشانیٔ فکر و نظر، اسلامی نظام کے مفہوم کے سلسلہ میں سامنے آتی ہے اس سے کہیں زیادہ تشتتِ قلب و نگاہ، نظریہ پاکستان کے ضمن میں سامنے آرہا ہے۔ ہر ایک اس کا مدعی بھی ہے اور ہر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار بھی۔ یہ اسے جھوٹا کہہ رہا ہے وہ اسے۔ یہ اِسے گالیاں دے رہا ہے وہ اُسے۔ حتیٰ کہ اب طعن و تشنیع، طنز و استہزاء، گالی گلوچ سے معاملہ آگے بڑھ کر نوبت سرپھٹول تک آپہنچی ہے اور اگلا قدم ملک میں گوریلا جنگ اور ان کے مقابلہ کے لئے رضاکارانہ تنظیموں کا بتایا جا رہا ہے اور یہ سب، اسلامی نظام کے قیام اور نظریہ پاکستان کے تحفظ کے دعوے داروں کی طرف سے ہو رہا ہے۔ اسلامی نظام کے قیام کے ایک دعوے دار وہ تھے جن کی خصوصیات یہ

ایک وہ تھے

بتائی گئی تھیں کہ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹) وہ مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت تھے لیکن باہمدگر ابریشم کی طرح نرم۔ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ (۵/۵۴) آپس میں ایک دوسرے کے سامنے جھک جانے والے لیکن دشمن کے سامنے اکڑ کر کھڑے ہونے والے۔ یہ وہ تھے جن کے متعلق خدائے کائنات نے یہ کہا تھا کہ فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا (۳/۱۰۲) خدا نے ان کے دل ایک دوسرے سے جوڑ دیئے تھے اور وہ نوازشِ ایزدی سے ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے تھے۔ ان کی باہمی دردمندیوں اور غمگساریوں کا عالم یہ تھا کہ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹) وہ خود تنگی ترشی میں گزارہ کر لیتے تھے لیکن دوسرے بھائی کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے تھے۔ اسلامی نظام کے قیام و استحکام کے ایک دعوے دار وہ تھے اور ایک دعویدار یہ ہیں کہ ایک

ایک ہم ہیں

دوسرے کے سامنے کھڑے ہیں بایں نمط کہ — آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں خنجر کھلا — یہ سب اس لئے کہ وہ حضرات (رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ) جانتے تھے کہ اسلامی نظام کا مفہوم کیا ہے اور مومن کا نظریۂ زندگی کیا۔ ان سب کے نزدیک ان الفاظ کا مفہوم

ایک تھا، مطلوب ایک تھا۔ اور اسی لئے ان میں نہ باہمی اختلاف تھا نہ افتراق، نہ تشتّت تھا نہ انتشار۔ وہ توحید کا حقیقی مقصود جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ توحید، توحید نہیں جس کے ماننے کے بعد آپس میں اختلاف و افتراق رہے۔ توحید کا عملی نتیجہ وحدتِ ملّت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے تفرقہ کو شرک قرار دیا ہے جب کہا ہے کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰ / ۳۱-۳۲) مسلمانو! دیکھنا، تم کہیں مومن ہونے کے بعد پھر سے مشرک نہ ہو جانا، یعنی ان میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈال دیا اور

تفرقہ شرک ہے

(امّتِ واحدہ رہنے کے بجائے) اپنی ایک الگ پارٹی بنا لی۔ پارٹی بازی میں ہوتا یہ ہے کہ ہر پارٹی مگن ہوتی ہے کہ میں حق پر ہوں اور باقی سب باطل پر ہیں۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم نے، قوم میں تفرقہ کو شرک قرار دیا ہے اور نبی اکرمؐ سے واضح الفاظ میں فرما دیا کہ إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ (۶ / ۱۶۰) جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیں اور فرقے اور پارٹیاں بنا کر بیٹھ جائیں، اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں! دین میں تفرقہ پیدا اُس وقت ہوتا ہے جب اُس کے اساسات کا مفہوم متعیّن نہ رہے اور مفہوم کے غیر متعیّن ہونے کا فطری نتیجہ باہمی اختلاف و افتراق ہے۔ نصب العین کی وحدت بھی اُسی وقت تک رہتی ہے جب تک اس کا مفہوم متعیّن اور متفق علیہ ہو۔ یا یوں کہئے کہ جن کے سامنے اپنی جدّ و جہد کا مفہوم متعیّن ہو، ان کا نصب العین بھی ایک ہوتا ہے۔ اسی (وحدتِ نصب العین) سے ملّت کی تشکیل ہوتی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

چیست ملّت؟ ایکہ گوئی لا الٰہ

باہزاراں چشم بودن یک نگاہ

صدرِ اوّل کے مسلمانوں کی یک نگہی اور ہم آہنگی کا تو پوچھنا ہی کیا، تعیینِ مقصد و مفہوم سے کس قسم کی وحدتِ فکر و عمل پیدا ہوتی ہے، اس کا نظارہ ہم تحریکِ پاکستان کے زمانے میں کر چکے ہیں جب

تحریکِ پاکستان کے دوران

قوم نے اپنا نصب العین متعیّن کر لیا اور اس کے مفہوم میں کسی قسم کا ابہام نہ رہا، تو پھر ان لوگوں میں جنہوں نے حصولِ پاکستان کو اپنا نصب العین قرار دے لیا تھا، کسی قسم کا باہمی اختلاف نہ تھا، افتراق نہ تھا۔ اس وقت، اختلاف

تھا تو اُن لوگوں سے جنہوں نے اس منتہیٰ کو اپنا مقصود قرار نہیں دیا تھا اور وہ اعلانیہ اس کا اعتراف کرتے تھے، اقرار کرتے تھے۔ لیکن آج ہماری حالت یہ ہے کہ ہر ایک کا دعویٰ ایک ہی ہے۔ یعنی اسلامی نظام کا قیام اور نظریۂ پاکستان کا استحکام ــــ اور اس دعویٰ کے مدعی، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں! یا للعجب۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان الفاظ کا متفق علیہ مفہوم متعیّن نہیں کیا گیا۔

معاشی نظام

اسلامی نظام اور نظریۂ پاکستان کی اصطلاحات ہی کچھ کم وجۂ افتراق و باعثِ نزاع نہ تھیں کہ ان میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا اور یوں سمندِ ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا، یعنی اسلام کا معاشی نظام ــــ ایک طرف سے آواز آتی ہے کہ اسلام کا اپنا مخصوص معاشی نظام ہے جو ہماری تمام مشکلات کے حل کا ضامن ہے لیکن ایسا دعویٰ کرنے والوں نے آج تک یہ نہیں بتایا کہ متعیّن طور پر وہ نظام کیا ہے اور قائم کس طرح سے ہوگا۔ دوسری طرف سے کہا جاتا ہے کہ ہمارا صحیح معاشی نظام اسلامک سوشلزم ہے۔ یہ اصطلاح دو الفاظ سے مرکّب ہے: اسلام اور سوشلزم۔ اسلام کے متعلق ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ اس کا کوئی متعیّن مفہوم ہمارے سامنے نہیں۔ باقی رہی سوشلزم، سو اس کا مفہوم ہر ملک میں الگ ہے، ہر مملکت میں جداگانہ ہے۔ اور جب ان (ہر دو) اجزا کی کیفیت یہ ہے کہ ان کا مفہوم متعیّن نہیں تو ظاہر ہے کہ ایسے اجزاء سے جو مرکّب وجود میں آئے گا، اس کا مفہوم کیا ہوگا۔ ان حضرات میں سے بھی کسی نے آج تک یہ نہیں بتایا کہ سوشلزم سے کیا مراد ہے، اسلامک سوشلزم کیا ہے اور وہ (UN-ISLAMIC SOCIALISM) سے کس طرح مختلف اور متبائن ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس کے مدعی اسے عین مطابقِ اسلام قرار دیتے ہیں اور مخالفین ایسا کہنے والوں پر کفر کا فتویٰ لگا رہے ہیں اور دلچسپی یہ کہ ان کفر کا فتویٰ لگانے والوں میں سے ہر ایک پر خود کفر کا فتویٰ لگ چکا ہوا ہے۔ یاد رکھیئے! مسلمانوں میں کوئی بھی فرقہ ایسا نہیں جس پر دوسرے فرقہ والوں نے کفر کا فتویٰ نہ لگایا ہو۔ اور جو حضرات کفر کا فتوے صادر کرتے ہیں وہ بہرحال کسی نہ کسی فرقہ سے متعلّق ہوتے ہیں۔

یہ ہے، عزیزانِ من! وہ دیوارِ بابل جس کے سایہ میں بیٹھی قوم، اس زبان میں گفتگو کر رہی ہے جس کا ایک لفظ کسی دوسرے کی سمجھ میں نہیں آتا اور جس کی وجہ سے سب ایک دوسرے سے لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ افرادِ قوم کی یہ حالت ہے اور راہ نمایانِ قوم کے سامنے ایک ہی مقصد ہے اور وہ یہ کہ قوم

کے جذبات کو اس طرح پیہم اور مسلسل مشتعل کئے چلے جائیں کہ اس میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہ رہے۔ اور اقبالؒ کے یہ الفاظ تو آپ سُن ہی چکے ہیں کہ قومیں اس وقت تباہ ہوتی ہیں جب ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت نہ رہے۔

مجھے اس کا احساس ہے کہ آپ کے دل میں یہ خیال ابھرے گا کہ

کچھ ہوش میں آنے کی میرے شکل بھی ناصح
یہ میں بھی سمجھتا ہوں مجھے ہوش نہیں ہے

اس کے جواب میں، میں یہ کہوں گا کہ اگر آپ نے واقعی سمجھ لیا ہے کہ ہم ہوش میں نہیں ہیں تو پھر ہوش میں آنا چنداں دشوار نہیں رہیگا۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، ہماری بیہوشی یا مدہوشی کی یہ بیماری کوئی نئی نہیں، بہت پرانی بیماری ہے اور اس کا علاج بھی کوئی نیا نہیں۔ وہی پرانا آزمایا ہوا علاج ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

وہی دیرینہ بیماری! وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

اس میں شک نہیں کہ حالات بظاہر بڑے مایوس کن ہیں جن کے سدھرنے کی کوئی صورت بادی النظر میں دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن یاس و ناامیدی کی یہ کیفیت صرف اس وقت تک ہے جب تک ہم سوچنا نہیں شروع کرتے۔ جونہی ہم نے سوچنا شروع کر دیا، یاس و ناامیدی کے بادل خود بخود چھٹتے چلے جائیں گے اور امیدوں کی تابندہ شعاعیں ہمارے سینوں کو منور کرنے لگ جائیں گی۔ ہم میں اس وقت اس قدر باہمی

قرآن بطورِ قدرِ مشترک

اختلافات ہیں کہ ان کے پیشِ نظر ہم میں کوئی قدرِ مشترک دکھائی نہیں دیتی لیکن اس قدر اختلاف و افتراق کے باوجود ہم میں ایک قدرِ مشترک موجود ہے۔ اگر ہم اس کی طرف آجائیں تو وہ ہماری اصطلاحات کے معانی و مفہوم بھی متعین کر دے گی اور غلط اور صحیح کے پیمانے کی کسوٹی بھی بن جائے گی۔ وہ قدرِ مشترک ہے خدائے قدیر و جلیل کی کتابِ عظیم، قرآن مجید۔ مسلمان آپس میں ہزار ہا اختلافات رکھیں لیکن ان کے مسلمان ہونے اور رہنے کی شرط یہ ہے کہ وہ خدا کی اس کتاب کو اپنا ضابطۂ حیات تسلیم کر لیں اور اس کے سند و حجت ہونے پر ایمان رکھیں۔ اس وقت بھی

ہر مسلمان ایسا تسلیم کرتا ہے لیکن وہ صرف زبان سے ایسا کہتا ہے، اپنی عملی زندگی میں اُسے ایسا تسلیم نہیں کرتا۔ اگر ہم ہر پارٹی سے اس کا مطالبہ کریں کہ اسے اپنے ہر فیصلہ اور ہر اقدام کے لئے قرآن کریم کی سند پیش کرنی ہوگی اور اسی کا ساتھ دیں جو اس مطالبہ کو منظور کرے تو آپ دیکھیں گے کہ ان کے ہر دعویٰ کا مفہوم کس طرح متعین ہو جاتا ہے اور باہمی اختلافات کس طرح مٹ جاتے ہیں اس لئے کہ قرآن کریم نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اس کا ارشاد ہے اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا (۴/۸۲) کیا لوگ قرآن پر غور و تدبر نہیں کرتے۔ اگر یہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلافات پائے جاتے۔ اس کے جواب میں جھٹ سے کہہ دیا جاتا ہے کہ صاحب سیاسی لیڈروں کو چھوڑیئے، مذہبی راہ نما تو قرآن ہی کو دلیل مانتے ہیں پھر ان میں اختلافات کیوں ہیں؟ اس سوال کا تفصیلی جواب تو طویل ہے اور کافی وقت کا متقاضی لیکن میں مختصراً یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن کو سند و حجت تسلیم کر لینے کے بعد بھی، باہمی اختلافات نہیں مٹ سکتے، تو آپ سوچیئے کہ پھر قرآن کے اس دعویٰ کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اس سے تو معاذاللہ آپ اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ قرآن منجانب اللہ نہیں ہے! کیا ایسا تسلیم کرنے کے بعد کوئی شخص مسلمان کہلا سکتا ہے۔ اگر قرآن کا یہ دعویٰ سچا ہے (اور اس کے سچا ہونے میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے) کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں، تو اس کا عملی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ جب ہم اپنے اختلافی امور میں اسے سند و حجت بنالیں اور غلط اور صحیح کا معیار اسے قرار دے لیں تو پھر ہم میں کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔ اور اگر اس کے باوجود آپ یہ کہنے پر مصر ہیں کہ یہ اختلافات کسی صورت میں مٹ نہیں سکتے تو پھر، معاف بفرمائیے، آپ اسلامی نظام اور اسلامی قوانین کا ورد ختم کریں۔ یہ ظاہر ہے کہ مملکت کا نظام اور ضابطۂ قوانین، بہرحال ایک ہو گا لیکن اگر صورت یہ ہے کہ اس قسم کا نظام اور ضابطۂ قوانین مرتب ہی نہیں ہو سکتا جس پر سب کا اتفاق ہو تو اس تمام چیخ و پکار سے حاصل کیا ہے اس وقت آپ کو شکایت ہے کہ ملک میں علیحدگی پسندی کے رُجحانات پیدا ہو رہے ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر علیحدگی پسندی کے یہ رجحانات ختم ہو جائیں اور مملکت کی سالمیت برقرار رہے، لیکن آپ نہ کوئی ایسا آئین مرتب کر سکیں جو سب کے نزدیک اسلامی کہلا سکے اور نہ ہی ایسا ضابطۂ قوانین مدون کر سکیں، تو اس

وقت ملک کا جو نقشہ ہوگا، اسے تصور میں لایا جاسکتا ہے!

تعبیرات میں اختلاف

اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ قرآن میں کوئی اختلاف نہیں، لیکن اس کی تعبیرات (INTERPRETATIONS) میں اختلافات ہیں۔ یہ نہیں مٹ سکتے۔ اس غلط اندیشی کے ازالہ کے لئے بھی تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے جس کے لئے قلتِ وقت مانع ہے۔ اس وقت میں صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ اسلامی نظام کی بنیادی شرط یہ ہوتی ہے کہ ایک ایسی اتھارٹی مقرر کر لی جائے جس کی قرآنی تعبیر ہر ایک کے لئے واجب التسلیم ہو۔ جب آپ اپنے آئین میں اس قسم کی شق رکھتے ہیں کہ آئین اور قانون کے معاملہ میں فلاں اتھارٹی کی تعبیر حرفِ آخر سمجھی جائے گی تو اس قسم کی شق قرآنی تعبیرات کو بھی محیط ہوگی، بالخصوص جب اسلامی نظام میں قانون کی بنیاد ہی قرآن کریم ہوگا۔ اسلامی نظام میں اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) حاصل ہی کتاب اللہ کو ہے کہ یہی کافر و مومن میں حدِ فاصل ہے۔ خدا کا واضح ارشاد ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی تو کافر ہیں۔

قرآن کا مقام

خدا کی حاکمیت یا اقتدارِ اعلیٰ کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کی کتاب کو زندگی کے ہر معاملہ میں حکم تسلیم کیا جائے۔ رسول اللہؐ کی زبانِ مبارک سے کہلوایا گیا کہ

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ط (۶/۱۱۵)

کیا میں خدا کے علاوہ کسی اور کو اپنا حاکم بنا لوں، حالانکہ اس نے تمہاری طرف مفصّل کتاب نازل کی ہے۔

اور اسی کے مطابق رسول اللہؐ سے ارشاد ہوا کہ

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ط (۵/۴۸ نیز ۴/۱۰۵)

تو ان میں کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کر۔ اور اب جبکہ تمہارے پاس حق آگیا ہے، لوگوں کے خیالات کا اتباع مت کر۔

یہی وہ حقیقتِ کبریٰ تھی جس کے اظہار کے لئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ،

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

حتّیٰ کہ

دیں ازو، حکمت ازو، آئیں ازو
زور ازو، قوت ازو، تمکیں ازو

اور اسلامی نظام کی یہی وہ اساس وبنیاد ہے جس کے متعلق قائدِاعظمؒ نے ۱۹۴۲ء میں فرمایا تھا اور غور کیجئے کہ کیسے واشگاف الفاظ میں فرمایا تھا کہ

> اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن کے احکام واصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست ومعاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول واحکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے لامحالہ آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

برادرانِ عزیز! میرے نزدیک، یہی اسلامی نظام کی اساس وبنیاد ہے۔ اسی کا نام نظریۂ پاکستان ہے۔ یہی اس اجمال کی تفصیل ہے کہ

پاکستان کا مطلب کیا ـــ لا الٰہ الّا اللہ

اگر پاکستان کے اربابِ مذہب وسیاست، قائدِاعظمؒ کے پیش کردہ، اسلامی نظام کے تصور کو اپنا نصب العین قرار دے لیں تو نہ صرف یہ کہ ان کے باہمی اختلافات ختم ہو جائیں بلکہ جس مقصد کے لئے پاکستان کا خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا وہ شادابیوں اور سرفرازیوں کی ہزار جنتیں اپنے جلو میں لئے جلوہ بار ہو جائے اور یوں زمین اپنے نشو ونما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے" اور اگر اسی حقیقت کو آپ دوسرے الفاظ میں سمجھنا چاہیں تو یوں سمجھ لیجئے کہ

> اسلام نام ہے امّتِ واحدہ کے اس نظامِ اجتماعیہ کا جس میں قرآنی احکام وقوانین کی اطاعت، اپنی منتخب کردہ اتھارٹی کی وساطت سے کی جائے۔

اسلامی نظام کی اس اصلِ عظیم کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر معاشی مسئلہ کے حل میں بھی کوئی دشواری پیش

معاشی مسئلہ

نہیں آسکتی۔ اس کے لئے نہ کسی کو کفر کے فتوے صادر کرنے پڑتے ہیں اور نہ ہی ڈنڈے دکھانے۔ قرآن کی رُو سے، اسلامی نظامِ مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے حدود میں بسنے والے تمام ذی حیات کو سامانِ زندگی بہم پہنچائے۔ وہ نظام جو خدا کے نام پر قائم ہوتا ہے، خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا ذریعہ بنتا ہے کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶) زمین میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے وہ مملکت تمام باشندوں کو اس کی ضمانت دیتی ہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲) ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں، اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔ اب ظاہر ہے کہ کوئی مملکت ایسی عظیم ذمہ داری کو پورا نہیں کر سکتی جب تک وسائلِ رزق اس کی تحویل میں نہ ہوں۔ وسائلِ رزق میں بنیادی حیثیت زمین کو حاصل ہے۔ جب زمین کو خدا ارض اللہ کہتا ہے (۷/۷۳) تو اس سے مراد یہی ہے کہ یہ کسی کی انفرادی ملکیت میں نہیں رہ سکتی۔ یہ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ رہے گی (۴۱/۱۰) یعنی تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلی کیونکہ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ (۷/۱۰) اس میں تم سب کے لئے سامانِ معیشت ہے۔

لیکن معاشی مسئلہ میں سوال اتنا ہی نہیں کہ وسائلِ پیداوار کو انفرادی ملکیت میں رکھنے کے بجائے اجتماعی تحویل

اصل سوال

میں دے دیا جائے۔ اصل سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کی تحویل میں انہیں دیا جائے، یا جو لوگ ان کا بندوبست کریں، وہ کس قسم کے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں قرآن کے معاشی نظام اور دیگر نظام ہائے معیشت میں فرق سامنے آتا ہے۔

آج جس غیر مسلم کو مسلمان کیا جاتا ہے اس سے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا رسمی سا اقرار لیا جاتا ہے (اور مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے والوں کے لئے اس رسمی اقرار کی بھی ضرورت نہیں پڑتی) لیکن قرآن کی رُو سے جو شخص امتِ مسلمہ کا رکن بننا چاہیے، اُسے ایک معاہدہ پر دستخط کرنے پڑتے ہیں اور وہ معاہدہ یہ ہے کہ:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۹/۱۱۱)

یعنی معاہدہ کرنے والا اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے اور خدا اُسے اس کے عوض جنّت عطا کر دیتا ہے۔ یہ معاہدہ محض اعتقادی اور نظری نہیں کہ زبان سے اس کا اقرار کر لیا اور بس۔ اس معاہدہ کے بعد، یہ شخص عملاً اپنی جان اور مال کا مالک نہیں رہتا۔ (جان کا سوال اس وقت زیرِ بحث نہیں)، جہاں تک مال کا تعلّق ہے، وہ جان مار کر محنت کرتا ہے اور اس محنت کے ماحصل کو اپنی ملکیّت نہیں سمجھتا۔ وہ اس میں سے کس قدر اپنے لئے لے سکتا ہے؟ اس سلسلہ میں فرمایا کہ یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ط قُلِ الْعَفْوَ ط (۲/۲۱۹) اے رسولؐ! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اس میں سے کس قدر اپنے لئے رکھ لیں اور کتنا دوسروں کی ضروریات کے لئے دے دیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہے، سب کا سب۔ "ضروریات" سے مراد ہے وہ کچھ جس سے انسان ان فرائض کو سرانجام دینے کے قابل ہو سکے جو اس کے سپرد کئے گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایک شخص کے لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ جان مار کر محنت کرے اور اس میں سے صرف بقدر اپنی ضرورت کے رکھ کر باقی سب بطیبِ خاطر دوسروں کے لئے دیدے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز نہ تو کسی قسم کے میکانکی نظامِ معیشت سے کرائی جا سکتی ہے نہ محض قانون کی رُو سے یا ڈنڈے کے زور سے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان کے اندر ایک ایسی

داخلی تبدیلی

تبدیلی پیدا ہو جائے جس سے یہ جذبہ اس کا داخلی تقاضا بن جائے۔ اُسی قسم کا داخلی تقاضا جس قسم کا تقاضا (مثلاً) پیاس کے وقت پانی پینے کا ہوتا ہے اور اس قسم کی تبدیلی ایمان کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ ایمان کس بات پر؟ قرآن کے عطا کردہ فلسفۂ حیات پر۔ اس فلسفۂ حیات کا ملخّص یہ ہے کہ:

(۱) انسانی زندگی اس کے جسم کی طبیعی مشینری کا نام نہیں۔ جسم کے علاوہ اس میں ایک اور شے بھی ہے جسے اس کی ذات یا نفس (HUMAN PERSONALITY) کہتے ہیں۔

(۲) انسان کو اس کی ذات، غیر نشوونمایافتہ شکل میں ملتی ہے اور زندگی کی موجودہ سطح پر اس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کی نشوونما کرے۔

(۳) جس شخص کی ذات کی مناسب نشوونما ہو جائے وہ مرنے کے بعد، زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

(۴) انسانی ذات کی نشوونما ان مستقل اقدار کی پابندی سے ہوتی ہے جو وحی کے ذریعے ملتی ہیں اور

جواب اپنی مکمل شکل میں قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔

(۵) ان میں سے ایک مستقل قدر یہ ہے کہ جس قدر کوئی شخص دوسروں کی پرورش کے لئے دے گا، اُسی قدر اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی جائے گی۔

یہ ہے وہ ایمان جو انسان کے اندر اس کی تڑپ پیدا کر دیتا ہے کہ جان مار کر محنت کرے اور اپنی محنت کے ماحصل میں سے، اپنی ضروریات کے بقدر رکھ کر باقی سب دوسروں کی پرورش کے لئے دیدے تاکہ اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے۔ یہ ہیں وہ افراد جن کے ہاتھوں قرآن کا معاشی نظام قیام پذیر ہوتا ہے۔ اس نظام کی کامیابی کا راز ان افرادِ امت کی اس داخلی تبدیلی میں مضمر ہوتا ہے جو ان کے ایمان کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ اور جب انسان کے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے تو خارجی کائنات میں اس قسم کا انقلاب رونما ہو جاتا ہے جو نوعِ انسان کے لئے اس دنیا میں جنتی معاشرہ کا ضامن بنتا ہے۔ قرآن اسی قسم کی داخلی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

اس میں شبہ نہیں کہ مارکس اور لینن نے جس اشتراکی نظام کا تصور پیش کیا تھا، اس کے اکثر و بیشتر اجزاء قرآنی نظامِ معیشت کے مماثل ہیں۔ لیکن ان مماثلت کے معنی یہ نہیں کہ اشتراکی نظام، قرآن کے مطابق ہے۔ قرآن کے معاشی نظام کی عمارت اس کے اپنے فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر استوار ہو سکتی ہے۔ جو فلسفۂ حیات مارکسؔ اور لیننؔ نے پیش کیا تھا اور جس کے حامل آج روس یا چین ہیں، وہ فلسفۂ حیات، قرآن کے نظریۂ زندگی کی یکسر ضد ہے۔ اس لئے نہ صرف یہ کہ اُن کے فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر استوار معاشی نظام، کبھی اسلامی نظام نہیں کہلا سکتا بلکہ ان کی کمزور بنیاد اس نظام کی عظیم عمارت کا بوجھ اٹھا ہی نہیں سکتی۔ جو فلسفۂ حیات نہ خدا کا قائل ہو نہ وحی کی رُو سے عطا شدہ مستقل اقدار کا، نہ انسانی ذات کو تسلیم کرتا ہو نہ حیاتِ آخرت کو، وہ فلسفۂ حیات اس قسم کا جذبۂ محرکہ پیدا ہی نہیں کر سکتا کہ انسان جان مار کر محنت کرے اور پھر اپنے دل کی رضامندی سے،

اشتراکیت اور قرآن

زاید از ضرورت سب کچھ دوسروں کے لئے کھلا چھوڑ دے۔ مارکسی نظام کی یہی وہ داخلی کمزوری تھی جس سے اقبالؒ نے آج سے بہت عرصہ پہلے، روس کو یہ کہہ کر متنبّہ کیا تھا کہ

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی دل ز دستورِ کہن پرداختی

کردہ کارِ خداونداں تمام بگذر از لاجانبِ اِلّا خرام

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے

جُستۂ اُورا اساسِ محکمے ؟

یہ اساسِ محکم اُسے کہاں سے ملے گی؟ اس کے متعلق کہا کہ

داستانِ کہنہ شستی باب باب

فکر را روشن کُن از اُمّ الکتاب

اور یہی تھی وہ "داخلی تبدیلی" جس کی اہمیت اور ضرورت کی طرف علّامہ اقبالؒ ساری عمر قوم اور بالخصوص نوجوانانِ ملّت، کی توجہ مبذول کراتے رہے۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقدہ مارچ ۱۹۳۲ء کے خطبۂ صدارت میں (جس کا ذکر میں نے شروع میں کیا ہے)، کھلے الفاظ میں کہا تھا کہ

> ہماری قوم کیلئے ضروری ہے کہ یہ اپنی موجودہ ذہنیت کو یکسر بدل ڈالے ...... یاد رکھو! جو شخص چاہتا ہے کہ ناساز گار ماحول کو بدلے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی داخلی دُنیا میں تبدیلی پیدا کرے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (۱۳/۱۱)۔ ارشادِ ایزدی ہے یعنی خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ قوم اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کرے ...... مسولینی کا نظریہ یہ تھا کہ جس کے پاس فولاد ہے اس کے پاس روٹی ہے۔ میں نے اس نظریہ میں یہ ترمیم کی ہے کہ جو شخص خود فولاد ہے اس کے پاس سب کچھ ہے۔ ...... یاد رکھو! زندگی کا شعلہ کسی سے مستعار نہیں لیا جا سکتا۔ اسے انسان کو اپنے من مندر میں خود روشن کرنا ہوگا۔

یہ ہے قرآن کا پیغام جس کی وضاحت اقبالؒ نے کی ہے۔ اس داخلی تبدیلی کے بغیر نہ اسلام کا سیاسی نظام قائم ہو سکتا ہے نہ معاشی نظام۔ لیکن اس داخلی تبدیلی کی ضرورت نہ ہمارے ہاں کے اربابِ سیاست محسوس کرتے ہیں نہ مذہبی پیشوا۔ کوئی اس نظام کو خون کی ندیاں بہا کر لانا چاہتا ہے، کوئی مغربی اندازِ جمہوریت

کی قانونی اور آئینی مشینری کی رُو سے۔ قلب و نگاہ کی تبدیلی نہ اِن کے پیشِ نظر ہے، نہ اُن کے۔ اور ستم ظریفی کہ دونوں مدّعی اسلامی نظام کے ہیں۔

ہمارے ہاں کے اشتراکی نظام کے مدّعیوں کے پیشِ نظر، انقلاب کا منتہیٰ یہ ہے کہ وسائلِ

اندرونی تبدیلی کے بغیر قومیانا

پیداوار، اور کلیدی صنعتیں، افراد کی ملکیت میں رہنے کے بجائے، قوم کی ملکیت میں آجائیں یعنی یہ چیزیں مملکت کی ملکیت میں دے دی جائیں۔ افراد کے قلب و نگاہ میں ایمانی تبدیلی کے بغیر، وسائلِ پیداوار وغیرہ کو حکومت کی ملکیت میں دینے کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ آج ریلوے، پوسٹ آفس، روڈ ٹرانسپورٹ کا ایک حصہ، بجلی، پانی، وغیرہ حکومت کی ملکیت میں ہیں۔ ان شعبوں میں جو کچھ ہو رہا ہے کیا ہم اس کا رونا بھی آئے دن نہیں روتے رہتے؟ اگر ہم نے باقی ماندہ شعبے اور وسائلِ پیداوار بھی اس قوم کے حوالے کر دیئے تو کیا ہمارا یہ رونا اس سے بھی صد گنا زیادہ نہیں ہو جائے گا؟ دوسری طرف اربابِ مذہب کو دیکھئے۔ اس وقت ریلوے، ٹرانسپورٹ، دیگر مواصلات، بجلی، دریاؤں کا پانی، جنگلات، زمین کے اندرونی خزانے معدنیات وغیرہ (NATIONALIZED) ہیں۔ ان کے متعلق انہوں نے کبھی نہیں کہا کہ یہ حرام ہے۔ لیکن جونہی کسی نے اس فہرست میں کسی اضافہ کی تجویز پیش کی، شور مچا دیا جاتا ہے کہ اسلام خطرے میں ہے۔ غرضیکہ حالت اس وقت یہ ہے کہ

نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری

اور خودی کی بیداری سے مقصود ہے وہ نفسیاتی تبدیلی جو قرآن کی رُو سے افراد کی داخلی دُنیا میں پیدا ہوتی ہے۔ یاد رکھیئے اُس تبدیلی کے بغیر آپ فساد تو پیدا کر سکتے ہیں، انقلاب نہیں لا سکتے کہ انقلاب کا تو مادہ ہی قلب ہے۔ قلب و نگاہ کی تبدیلی کے بغیر، اسلامی انقلاب کیسے برپا ہو سکتا ہے۔

اس مقام پر ہمارا نوجوان طبقہ (جس کے جذبات کو مسلسل مشتعل کیا جا رہا ہے) تلملا اٹھتا ہے

نوجوانوں کا اضطراب

اور کہتا ہے کہ ملک میں غریبوں پر گوشۂ عافیت تنگ ہو رہا ہے۔ انہیں زندگی کے دن گزارنے مشکل ہو رہے ہیں۔ نہ ان کے پاس کھانے کو روٹی ہے، نہ پہننے کو کپڑا، نہ رہنے کو مکان ہے نہ علاج کے لئے چار پیسے۔ غریبوں اور ناداروں کو

روٹی کپڑے کی آج ضرورت ہے اور آپ اُن سے کہہ رہے ہیں کہ اُس وقت تک انتظار کرو جب تک قوم میں نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا ہو جائے اور نہیں سمجھتے کہ تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود۔

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سَر ہونے تک

مجھے اپنے ان عزیز بھائیوں کی بیتابیٔ تمنا کا پورا پورا احساس ہے اور جہاں تک غریبوں کی مشکلات کا تعلق ہے، انہیں شاید معلوم نہ ہو کہ معاشی مسئلہ کو ملک میں آج ابھارا گیا ہے اور میں گزشتہ بیس سال سے مسلسل اس کے لئے پکار رہا ہوں لیکن اس کے باوجود، میں ان نوجوانوں سے کہوں گا کہ تپ دق کا علاج راتوں رات نہیں ہو سکتا اس کے لئے وقت درکار ہوتا ہے اور مریض اور تیمار داروں کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس مدّت کو صبر و تحمّل سے گزاریں۔ اسی قسم کی ایک اور مثال لیجئے۔ ایک کسان کے ہاں من بھر گندم بیج کے لئے رکھا ہے اور اس کے بچے بھوک سے بلک رہے ہیں۔ بچّوں کی بھوک کا تقاضا ہے کہ وہ اس گندم کو پسوا لائے اور بچّوں کو روٹی کھلا دے۔ اس سے بچّوں کی دو چار دن کی بھوک کا علاج تو ہو جائے گا لیکن اس کے بعد کیا ہو گا، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ان کی بھوک کا مستقل علاج یہی ہے کہ بیج کو کھیت میں بویا جائے اور فصل پکنے تک کا انتظار کیا جائے اور اس دوران میں بچّوں کی روٹی کا کوئی اور انتظام سوچا جائے۔

انقلابِ نبویؐ

آپ دنیا میں سب سے عظیم آسمانی انقلاب لانے والے — حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم — کی انقلابی جدوجہد پر غور کیجئے۔ آپؐ کی نبوّت کی عمر تیئس سال کی تھی اور چونکہ یہ دنیا میں آخری نبوتؐ تھی اس لئے اس تیئس سالہ مدّتِ نبوتؐ کا ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری تھا لیکن اس مدتِ نبوّت کا آدھے سے زیادہ حصہ مکہ میں، اپنے رفقائے کار کے قلب و نگاہ میں نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنے کی نذر ہو گیا۔ یہ عرصہ بڑا لمبا اور یہ مرحلہ بڑا صبر طلب اور ہمت آزما تھا کبھی کبھی خود حضورؐ کے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ جس مقصد کے لئے میں مسلسل مصروفِ جدّوجہد ہوں کیا وہ میری زندگی میں حاصل ہو جائے گا یا میری تمام عمر انہی جانکاہ مشقتوں اور جگر گداز صعوبتوں میں گزر جائے گی آپ سوچئے کہ کس قدر معصوم تھی یہ آرزو اور کس طرح فطری تھا یہ جذبہ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ بارگاہِ خداوندی سے اس کا جواب کیا ملا! یہ جواب ملا کہ وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ

نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳/۴۰) جس انقلاب کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کا کچھ حصّہ آپ کی زندگی میں آپ کے سامنے آجائے، یا اس کا ظہور آپ کے بعد ہو۔ اس سے آپ کو غرض نہیں ہونی چاہیئے۔ آپ اپنی جدوجہد میں مصروف رہیئے اور اس کا خیال مت کیجئے کہ اس کے نتائج کب برآمد ہوں گے۔ آپ کے ذمے یہی فریضہ ہے کہ آپ اس پیغام کو عام کرتے جایئے، یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ اس کے نتائج کب برآمد ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے قانونِ مکافات کے حساب کی رُو سے ہوگا۔ کسان کا کام یہ ہے کہ وہ وقت پر کاشت کرے۔ پھر اپنی کھیتی کی مناسب دیکھ بھال کرتا جائے، فصل اپنے وقت پر پکے گی۔ اس کی بیتابیٔ تمنّا اس وقفہ میں ذرا سی بھی تخفیف نہیں کر سکتی جو کسان مضطرب و بے قرار ہو کر وقت سے پہلے فصل کاٹ لیتا ہے، اس کے بیلوں کو چارہ تو مل سکتا ہے، بچّوں کو روٹی نہیں مل سکتی۔ صحیح انقلاب کے لئے عزیزانِ من! وقت درکار ہوتا ہے اور ہماری ہزار آرزوؤں اور تمنّاؤں، بیتابیوں اور اضطرابیوں کے باوجود، فطرت اپنے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں کرتی۔ جس غالبؔ نے یہ کہا تھا کہ — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک — اسے اس کا بھی احساس تھا کہ — عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب — ہماری بیتابیٔ تمنّا عشق کی صبر طلبی کے تقاضوں کا بدل نہیں بن سکتی۔

روس اور چین کی مثال ہمارے یہ نوجوان، روس اور چین کی مثال پیش کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھئے! انہوں نے چند دنوں میں کتنا بڑا انقلاب برپا کر دیا۔ ان کی بھول یہ ہے کہ وہ اس انقلابی جدوجہد کی مدّت کو اس دن سے شمار کرتے ہیں جب وہ محسوس طور پر دنیا کے سامنے آیا، جس زمانے میں وہ لوگ نہایت خاموشی سے اس کی تیاریوں میں مصروف تھے، وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے۔

ایک جلنے کے سوا اور کوئی کیا جانے
حالتیں کتنی گذر جاتی ہیں پروانے پر

اس وقت میرے سامنے پیکنگ ریویو کا ۲۰ مارچ ۱۹۷۰ء کا شمارہ ہے۔ دیکھئے اس باب میں انقلابِ چین کا قائد، ماؤزے تنگ کیا کہتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ :-

دانشوروں کا مسئلہ آئیڈیالوجی کا مسئلہ ہے اور آئیڈیالوجی سے متعلق مسائل کو حل کرنے کے لئے، جبر و استبداد کے بھونڈے طریقے، نہ صرف یہ کہ مفید نہیں ہوتے، بلکہ تحریک کے لئے نقصان

رساں ہوتے ہیں۔ ہمارے رفقاء کو معلوم ہونا چاہیئے کہ نظریاتی تبدیلی کے لئے بڑے طویل المیعاد، صبر آزما اور استقامت طلب پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے انہیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے داور نہ ہی ایسی کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ محض چند لیکچروں اور جلوسوں سے لوگوں کے ان نظریات میں تبدیلی پیدا کردیں گے۔ قوموں کے نظریات صدیوں میں جا کر مرتب ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں راتوں رات بدلا نہیں جاسکتا۔ یہ کام جبر و استبداد سے نہیں ہوگا۔ لوگوں کے قلب و دماغ کو رفتہ رفتہ اس تبدیلی کے لئے آمادہ کرنا ہوگا۔

آپ سوچئے کہ جب اس انقلاب کے لئے جسے محض خارجی معاشرہ میں برپا کرنا مقصود ہو، اس قسم کے طویل المیعاد، صبر آزما پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے، تو اس انقلاب کے لئے جس میں انسان کے غلط معتقدات، نظریات، تصوّرات، اعمال و افکار کو صحیح نظریات سے بدلنا اور انسانی سیرت و کردار کے ہر گوشے کو ایک جدید پیکر میں تبدیل کرنا مطلوب ہو، کس قدر سکون و ثبات کے ساتھ صبر آزما مراحل میں سے گزرنا ہوگا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ غریبوں اور محتاجوں کی مصیبتوں کو علیٰ حالہٖ رہنے دیں اور ان کی کوئی مدد نہ کریں۔ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ اپنا نصب العین قرآن کا معاشی نظام رکھیں جس میں ہر نوع کی سرمایہ داری کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور قوم کی دولت ابنائے قوم کی ضروریات پوری کرنے کے لئے وقف ہو جاتی ہے اس نصب العین تک بتدریج پہنچا دیا جائے گا۔ اس لئے اس کی طرف اس طرح قدم بڑھایئے کہ ملک میں فساد نہ برپا ہونے پائے اور ضرورت مندوں کی مرفہ الحالی کی شکلیں نکلتی چلی جائیں۔ اس کے ساتھ اس نفسیاتی تبدیلی کے لئے بھی عملی اقدامات کیجئے جس کے بغیر یہ نظام کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ تبدیلی کیسے پیدا ہو سکے گی، اس کے لئے میں ذرا آگے چل کر ذکر کروں گا۔

چوروں اور ڈاکوؤں کو مارنا

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسلام کی رُو سے چوروں اور ڈاکوؤں کا مارنا جائز ہے۔ ظالموں کو سزا دینا ضروری ہے۔ رسولِ خدا نے قریش کی چیرہ دستیوں، ملوکیت پسندوں اور استحصالی قوتوں کے خلاف جنگ کی تو ہم بھی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو کیوں نہ تہِ تیغ کردیں۔

ان حضرات کی خدمت میں گزارش ہے کہ اسلام بے شک ظالموں اور استحصالی قوتوں کے خلاف

جنگ کرنے کی اجازت دیتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ اس قسم کی اجازت دیتا کسے ہے۔ وہ اس کی اجازت حکومت کو دیتا ہے۔ افراد کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ جسے ظالم اور غاصب سمجھیں۔ اس کا گھر جلادیں۔ اس کا سر اڑا دیں۔ اگر ہر شخص کو اس کا لائسنس دے دیا جائے۔ کہ وہ جسے ظالم اور غاصب سمجھتا ہے اُسے تباہ اور ہلاک کر دے تو ملک میں ایسی انارکی پھیل جائے جس میں کسی کا کچھ بھی محفوظ نہ رہے۔ انفرادی طور پر ایک مسلمان کے ہاتھوں، دوسرے مسلمان کا قتل کتنا بڑا سنگین جرم ہے اس کا اندازہ قرآن مجید کی اس آیت سے لگائیے جس میں کہا گیا ہے کہ

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا۔ (۴/۹۳)

جس شخص نے کسی ایک مومن کو بھی بالارادہ قتل کر دیا تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ (ہمیشہ) رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب اور لعنت ہو گی اور خدا نے اس کے لئے بہت بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

لہٰذا، یہ اسلام کی تعلیم نہیں کہ کچھ لوگ اٹھ کر انہیں ختم کرنا شروع کریں جنہیں وہ ظالم اور غاصب سمجھتے ہیں اور دوسرے لوگ ان کے خلاف تلواریں سونت کر میدان میں آجائیں۔ اسلام اسے حکومت کا فریضہ قرار دیتا ہے نہ کہ افراد کی اپنے طور پر ذمہ داری۔

آج کل ایک اور نعرہ بھی سننے میں آرہا ہے کہ "پہلے روٹی بعد میں آئین" ایسا کہنے والوں کو کون سمجھائے کہ جس مملکت میں آئین نہ ہو وہاں (جنگل کا قانون، کارفرما ہوتا ہے اور جنگل کا قانون یہ ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ یہ صحیح (اسلامی) آئین کی قوت ہے جس سے لاٹھی والے سے کہا جاتا ہے کہ وہ بھینس کے سینگ تھامے رکھے تاکہ اس کا دودھ وہ شخص اطمینان سے دوہ سکے جس کے بچوں کو اس دودھ کی ضرورت ہے۔ یہ آئین کی حکمرانی ہے جس میں (فاروقِ اعظمؓ کے الفاظ میں) کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

طاقتور کمزور تر ہوتا ہے جب تک اس سے کمزور کا حق نہ دلا دیا جائے اور کمزور طاقتور ہوتا ہے جب تک اسے اس کا حق نہ مل جائے۔

لہٰذا، میں اپنے ان عزیزوں سے کہوں گا کہ وہ آئین سے پہلے روٹی کا مسئلہ حل کرنے کے بجائے،

اپنی کوششیں ایسا آئین مرتّب کرنے میں صرف کریں جس کی رُو سے روٹی کا مسئلہ اس طرح حل ہو جائے کہ (قرآن کریم کی پیش کردہ مثال میں) درختوں کے پھل خود جھک کر ضرورت مندوں کی جھولی میں آگریں۔

آئین کا سوال سامنے آگیا تو توجہ کا رُخ اس چیخ و پکار کی طرف مڑ گیا جس میں دہائی دی جارہی ہے کہ آئین مرتّب کرنے کے لئے ایک سو بیس دن کی مدّت ناکافی ہے[1]۔ ان حضرات کی کیفیت ایسی ہی ہے جیسے ایک شخص نے اپنے کمرہ کا دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا اور رو رہا تھا کہ میں باہر کیسے نکلوں! ابھی الیکشن میں چھ ماہ کا عرصہ باقی ہے۔ آئین سازی کے لئے چار ماہ اس کے بعد بھی ملے گے۔ آپ حضرات بجائے اس کے کہ اپنا وقت ایک دوسرے کو گالیاں دینے میں ضائع کریں، ابھی سے مل بیٹھ کر آئین کا مُسَوَّدَہ مرتّب کرنے کی تیاریاں کیوں نہیں شروع کر دیتے۔ آئین ساز اسمبلی میں بالآخر، آپ کی پارٹیوں کے نمائندے ہی جائیں گے۔ جس آئین کا مُسَوَّدَہ آپ مرتّب کریں گے ان کی تصویب سے وہی آئین بن جائے گا ـــ لیکن اگر صورت یہی ہے کہ آپ مل کر ایک جگہ بیٹھ ہی نہیں سکتے تو پھر ایک سو بیس دن تو ایک طرف، آپ ایک سو بیس سال میں بھی آئین مرتّب نہیں کر سکتے۔ آپ دوسروں کے سر الزام دھرنے کے بجائے خود اپنا احتساب کر لیں تو ساری مشکلات حل ہو جائیں۔

میں نے عزیزانِ من! جو کچھ اس وقت تک کہا ہے، اس کا ملخّص یہ ہے کہ

(۱) پاکستان کو اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں اسلامی نظام قائم کیا جا سکے۔

(۲) اسلامی نظام سے مقصود ہے، اُمّتِ واحدہ کا وہ اجتماعی نظام جس میں قرآن کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت اپنی منتخب کردہ آئینی اتھارٹی کی وساطت سے کی جائے۔

(۳) جہاں تک معاشیات کا تعلّق ہے، اس نظام میں، نہ وسائلِ پیداوار کسی کی ذاتی ملکیّت میں رہتے ہیں اور نہ ہی فاضلہ دولت (جو نظامِ سرمایہ داری کی اصل و بنیاد ہے) کسی کے پاس

---

[1] اس وقت صدرِ مملکت، آغا محمد یحییٰ خان نے فیصلہ کیا تھا کہ منتخب اسمبلی کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ چار ماہ کے اندر آئین مرتّب کرے ورنہ اسے کالعدم قرار دے دیا جائے گا۔ بعد میں، مشرقی پاکستان کے فسادات کی وجہ سے وہ ساری اسکیم ہی غت ربود ہو گئی۔

رہتی ہے۔ یہ سب ملت کے اجتماعی نظام کی تحویل میں آجاتے ہیں تاکہ ان سے تمام افرادِ مملکت کی جسمانی اور انسانی نشو و نما کا انتظام کیا جا سکے۔

(۴) یہ نظام اس امت کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے جس کے افراد کے قلب و دماغ میں صحیح قرآنی تبدیلی واقع ہو چکی ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ ان افراد کے اندر اس قسم کی تبدیلی کس طرح پیدا ہو گی۔ اس کا طریق وہی ہے جو

یہ تبدیلی کیسے ہو؟

(قرآن کریم کی راہ نمائی میں) خود حضورؐ نبیٔ اکرم نے اختیار فرمایا تھا۔ یعنی یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ یعنی کتاب اللہ کے احکام و قوانین اور حکمت و بصیرت کی تعلیم۔ یعنی تعلیم وہ ذریعہ ہے جس سے افراد کے قلب و دماغ میں صحیح تبدیلی ہو سکتی ہے۔

میں نے عزیزانِ من! تحریکِ پاکستان میں اپنی استطاعت کے مطابق، امکان بھر حصّہ لیا تو اس لئے کہ میں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا کہ اسلام ایک زندہ نظامِ حیات اسی صورت میں بن سکتا ہے جب اس کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ اور حصولِ پاکستان کے بعد، قرآن کریم پر غور و فکر سے یہ بات بھی میری سمجھ میں آگئی تھی کہ اس خطۂ زمین میں، اسلامی نظام اسی صورت میں متشکّل ہو سکتا ہے جب نونہالانِ ملّت کی تعلیم قرآنی خطوط کے مطابق ہو۔ اس تعلیم سے قوم اس قابل بن جاتی ہے کہ وہ فطرت کی قوتوں کو مسخّر کر کے، ان کے ماحصل کو وحی کی رُو سے عطا کردہ مستقل اقدار کے مطابق، نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے صرف کرے۔ میں نے، برادرانِ عزیز! پاکستان میں مروجہ طریق و نصابِ تعلیم میں تبدیلی کی طرف قوم کی توجہ بالعموم، اور اربابِ حل و عقد کی بالخصوص، مبذول کرائی ——— اور اپنی اس کوشش کو مسلسل جاری رکھا لیکن مجھے انتہائی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ حضرات اپنے اپنے مقاصد میں جذب رہے اور جس مسئلہ پر قوم اور پاکستان کے مستقبل کا انحصار تھا، اس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی ہم، عزیزانِ من! آج جس قوم کے ہاتھوں اس قدر نالاں ہیں، یہ قوم مریخ سے نہیں ٹپک پڑی۔ یہ

تعلیمی نظام

وہی قوم ہے جسے ہم بیس بائیس سال سے اپنی درسگاہوں ——— اسکولوں، کالجوں مکتبوں، دارالعلوموں ——— میں تیار کرتے رہے ہیں۔ اس قوم کو بنایا ہم نے خود ہی ایسا ہے۔ اور جب یہ ایسی بن چکی ہے تو ہم اسے موردِ الزام ٹھہراتے ہیں کہ تم ایسی کیوں ہو۔ اور طرفہ

تماشا یہ کہ ہم موجودہ قوم کے ہاتھوں نالاں بھی ہیں اور اسی قسم کی قوم تیار کرنے میں مصروف بھی! یعنی ہم اپنی مروجہ تعلیم کے برگ و بار سے اس قدر طولِ خاطر بھی ہیں اور اس کے ساتھ ہی اسے علیٰ حالہٖ جاری بھی رکھے ہوئے ہیں۔ اس میں کسی تبدیلی کے لئے تیار نہیں۔

میں نے، عزیزانِ من! چاروں طرف سے ہار تھک کر، بالآخر یہی سوچا کہ اگر اس کے لئے قوم اجتماعی طور پر تیار نہیں ہوتی، تو ہم انفرادی طور پر ایک ایسی درس گاہ قائم کر دیں جو اس باب میں ماڈل کا کام دے سکے۔ اس درس گاہ میں تعلیم کا انداز کیا ہوگا، اس کا تصور، علامہ اقبالؒ نے نہایت جاذب اور حسین پیرایہ میں اس طرح پیش کیا ہے کہ

کُھلے ہیں سب کیلئے غربیوں کے میخانے
علومِ تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں!

لیکن

اسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تری
ترے بدن میں اگر سوزِ لَا اِلٰہ نہیں

اس درس گاہ میں نصابِ تعلیم تو وہی ہوگا جو یونیورسٹی تجویز کرتی ہے تاکہ یہاں کے فارغ التحصیل طلباء تعلیم کے عام میدان میں کسی سے پیچھے نہ ہوں، لیکن اس نصاب کو پڑھایا اس طرح جائے گا کہ طلباء میں اس بات کے پرکھنے کی تمیز پیدا ہو جائے کہ اس میں حق کیا ہے اور باطل کیا۔ کون سی چیز قرآنی نظریۂ زندگی اور مستقل اقدار کے مطابق ہے اور کون سی ان کے خلاف۔ اور اس کے بعد، ان میں ایسی استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ قرآنی نظامِ حیات کو، دنیا کے سامنے علومِ حاضرہ کی روشنی میں اس طرح پیش کر سکیں کہ سننے اور سمجھنے والے علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھیں کہ انسانیت کی مشکلات کا حل اس نظام کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔

میں عزیزانِ من! آجکل اسی درس گاہ کے قیام کی کوششوں میں مصروف ہوں — کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ — آخر میں، میں اس کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ مجوزہ درس گاہوں میں قرآنی تعلیم اسی نہج سے دی جائے گی لیکن اس کے نظم و نسق سے ادارۂ طلوعِ اسلام کا کوئی تعلق

نہیں۔ یہ کالج، قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کے زیرِ اہتمام قائم ہوگا جو ایک آزاد، رجسٹرڈ سوسائٹی ہے۔
دعا کیجئے اللہ تعالیٰ اس اسکیم کو کامیابی سے ہمکنار کرے اور اس درس گاہ سے اس قسم کے نوجوان تعلیم و تربیت پاکر نکلیں جو قوم اور ملک کے لئے سرفرازی کا موجب، اسلام کے لئے تقویت کا باعث اور نوعِ انسانی کے لئے رحمت ثابت ہوں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۲/۱۲۷

والسلام

طلوعِ اسلام ٹرسٹ کی مطبوعات سے حاصل شدہ جُملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔